TIGHT BINDING BOOK

کتب خانہ

کلیہ انجنیری جامعہ عثمانیہ

۱. اساتذہ کلیہ انجنیری جامعہ عثمانیہ
وقت واحد میں کتابیں اپنے پاس رکھ
سکینگے ۔) اور [illegible] دو کتب [illegible] ہفتہ تک

۲. طلبہ جماعتہائے بی۔ای [illegible] کتب [illegible]
وجماعتہائے [illegible] رکھ سکینگے ۔ [illegible] طرف [illegible] کتب
اپنے پاس رکھ [illegible]

۳. طلبہ کو دوسروں کی کتب حاصل کرنے [illegible]
کی اجازت نہ ہوگی [illegible] ان کے ذاتی طور پر
حاصل کرنے کے لئے [illegible] کرنے کے بعد اجرا
اور واپس کرنا ضروری ہے [illegible] پیش [illegible] نہ ہوں تو

۴. [illegible] کتب [illegible] ۔ کتابیں واپس نہ ہوں تو
موجود رہنا ضروری [illegible] فی کتاب دینا ہوگا

۵. مدت مقررہ [illegible] کتابیں [illegible] یومیہ فی کتاب [illegible]
طلبہ کو بحساب [illegible] آنہ [illegible] جاری کی جاسکینگی مگر اس
کا جانا [illegible] کتابیں مکرر جاری کی جاسکینگی [illegible] کتاب کا لانا

۶. [illegible] کتب خانہ میں کتاب مکرر جاری
لازمی [illegible] وقت مکرر [illegible] ہو ۔
[illegible] کا مطالعہ [illegible] ہو جائیں تو مستعیر [illegible]

۷. [illegible] کتابیں [illegible] ۔ [illegible] کا نشان [illegible]
و [illegible] کتابیں [illegible] قسم [illegible] اور حوالہ

۸. کتابوں [illegible] سے [illegible] جاری [illegible]
ذمہ داری [illegible] کتابیں جاری [illegible]

۹. [illegible]

۱۰. [illegible] کی [illegible] جا سکیگی ۔ فقط

مجلۂ عثمانیہ

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

سید اشفاق حسین   محمد شہاب الدین

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

جلد (۱۰) | سال تعلیمی ۱۳۴۶ف | شمارہ ۳- اور ۴

(صدر)

قاضی محمد حسین صاحب

ام ۔ اے ۔ ال ال ۔ بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ اردو)

مولوی عبدالحق صاحب بی ۔ اے
پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام ۔ اے پی ۔ ایچ ۔ ڈی (لندن)
مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ انگریزی)

مسٹر ایف ۔ جے ۔ اے ۔ بارڈنگ ام ۔ اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمن صاحب بی ۔ ایس ۔ سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

سید اشفاق حسین متعلم ام ۔ اے (عثمانیہ) مہتمم و مدیر حصۂ اردو مجلہ عثمانیہ

(اراکین)

محمد عبدالمقیم صاحب معتمد انجمن اتحاد

محمد شہاب الدین صاحب مدیر حصۂ اردو

خواجہ نصر اللہ صاحب مدیر حصۂ انگریزی

مجلّۂ عثمانیہ

جلد (۱۰)، شمارہ (۳) اور (۴)

مجلس مشاورت

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	۵ ۱۲ روپیے
(۲) ارباب جامعہ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ 〃
(۳) عام خریداروں سے	۶ 〃
(۴) طلبائے قدیم رفاہیہ انجمنوں اور دارالمطالعوں سے	۵ 〃
(۵) طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۴ 〃
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ شلنگ
(۸) فی رسالہ	۲ روپیے

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ "عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین "مجلہ عثمانیہ"

جلد (۱۰) شمارہ (۳) اور (۴)

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	اداریہ	اشفاق حسین	الف
۲	تاریخ ادب اردو کے چند قدیم ماخذ	عمر مہاجر متعلم بی۔اے	۱
۳	"عذرائے دکن" حیدرآباد سے رخصت ہوتے ہوئے	جناب روش صدیقی	۱۵
۴	قومیت کا تخیل اور بین الاقوامی صورت حال	محمد شمس الدین فاروقی متعلم سال چہارم	۱۷
۵	مہارانی	مرزا سرفراز علی بی۔اے (عثمانیہ)	۲۹
۶	یاد نشاط	پروفیسر غلام طیب بی اے (عثمانیہ) ایل۔ٹی	۳۳
۷	جنگ اور زہریلی گیس	محمد خادم حسین قریشی بی۔یس سی (عثمانیہ)	۳۶
۸	مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن ام۔اے (عثمانیہ)	۴۳
۹	کلام اکبر کا اخلاقی عنصر	شاہ ابرار احمد ام۔اے (عثمانیہ)	۵۲
۱۰	حسن مفلس	رشید احمد (سال چہارم)	۵۹
۱۱	غلط فہمی	عبدالرشید متعلم سال دوم	۶۱
۱۲	غزل	مصطفےٰ علی اکبر گرامی متعلم بی۔اے	۶۴
۱۳	ہندوستان کے صد سالہ عمرانی قوانین	محمد احمد سبزواری متعلم ام۔اے (ابتدائی)	۶۵
۱۴	بچے اور بوڑھے	محشر عابدی، بی۔اے۔ام۔یس۔سی (عثمانیہ)	۷۴
۱۵	نامہ حبیب۔	مخدوم محی الدین ام۔اے (عثمانیہ)	۷۷
۱۶	جھولا	مولوی وہاج الدین بی۔اے۔بی۔ٹی	۷۹
۱۷	دور بنی امیہ کی شاعری	ابوالفضل ام۔اے (عثمانیہ)	۸۵
۱۸	حیدرآباد کی جدید مطبوعات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ام۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی	۱۰۹
۱۹	قیدی	پروفیسر عبدالقادر سروری ام۔اے۔ایل ایل۔بی (عثمانیہ)	۱۱۶
۲۰	شباب	مولوی وہاج الدین سیم	۱۲۴
۲۱	ابوالحسن تاناشاہ روایات کی روشنی میں	شیخ محمد خلیل اللہ متعلم سال چہارم	۱۲۶
۲۲	محفل سخن کی چند شمعیں	صاحبزادہ میر محمد علیخاں میکش (عثمانیہ)	۱۳۱
۲۳	برسات کی ایک سہانی شام	حامد علی عباسی متعلم ام۔یس سی	۱۳۷
۲۴	سرسید کی ظرافت	اسحاق محمد خاں متعلم سال چہارم	۱۳۹
۲۵	قانون بین الاقوام کے چند نکات	پروفیسر ہارون خاں شیروانی ام۔اے (آکسن)	۱۴۵
۲۶	اعتراف	محمد یحییٰ صدیقی ام۔اے (عثمانیہ)	۱۵۰

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۲۷	ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات دیسی ریاستوں سے	محمد شہاب الدین ام۔اے (عثمانیہ)	۱۶۳
۲۸	حیدرآبادی نوجوان سے !	سکندر علی وجد بی۔اے (عثمانیہ)	۱۷۵
۲۹	سیر صحرا	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔اے پی ایچ۔ڈی	۱۷۷
۳۰	نعرۂ شباب	میکش	۱۸۷
۳۱	ہنسی	محمد عبدالحمید عثمانی متعلم بی۔اے	۱۸۸
۳۲	غزل	محمد عبدالسلام اختر متعلم بی۔اے	۱۹۲
۳۳	ایک دوست	سید اشفاق حسین	۱۹۳
۳۴	محبت کی کرشمہ سازیاں	عبدالصمد ساز بی۔اے ال ال۔بی (عثمانیہ)	۱۹۷
۳۵	نقد و تبصرہ	مدیرین	۱۹۹

طالبات جامعہ

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۳۶	موسم کی نیرنگیاں	جناب جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ)	۲۱۱
۳۷	وجہی	جناب سعدیہ بیگم صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ)	۲۱۵
۳۸	تشنگان دیدار	جناب شہر بانو صاحبہ نقوی متعلمہ ایف۔اے (زنانہ کالج)	۲۱۸
۳۹	پھول بیچنے والی لڑکی	جناب رضیہ بیگم صاحبہ	۲۲۲
۴۰	محبت یا مجبوری ؟	جناب رابعہ بیگم صاحبہ	۲۲۶
۴۱	اردو ادب کے مرکز	جناب لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ)	۲۳۲
۴۲	صاحب	جناب خورشید سلطانہ صاحبہ	۲۳۹

شیخ چاند مرحوم

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۴۳	شیخ چاند مرحوم	سکندر علی وجد (عثمانیہ)	۲۴۳
۴۴	شیخ چاند کی وفات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲۴۶
۴۵	شیخ چاند مرحوم کی تصنیفات	پروفیسر عبدالقادر سروری	۲۴۸
۴۶	آہ شیخ چاند	بدر شکیب بی۔اے۔ال ال۔بی (عثمانیہ)	۲۵۲
۴۷	شیخ چاند مرحوم سے !	میکش	۲۵۴
۴۸	شیخ چاند مرحوم	اشفاق حسین	۲۵۵
۴۹	شیخ چاند مرحوم	سید محمد ام۔اے (عثمانیہ)	۲۶۱
۵۰	شیخ چاند مرحوم	صدیق احمد خاں متعلم سال چہارم	۲۶۴
۵۱	مقدمہ	مولوی عبدالحق صاحب	۲۶۷
۵۲	راس مسعود	مولوی عبدالحق صاحب	۲۷۱

اداریہ

مجلہ کی یہ اشاعت غیر معمولی تعویق سے پیش کی جارہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو برادران جامعہ کی روایتی بے نیازی ہے جو وہ مجلہ کو مضامین دینے میں برتتے رہتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جشن سیمین نمبر کی اشاعت کے بعد ہی حصہ انگریزی کے مدیروں نے مادر جامعہ کو چھوڑ کر عملی زندگی میں قدم رکھا تو مجلہ کا ساتھ بھی ان سے چھوٹ گیا اور حصہ انگریزی کے لئے ایک نئے مدیر کا انتخاب کرنا پڑا۔ جشن سیمین نمبر کی اشاعت پر ملک کے جرائد، ارباب متقدر اور اہل ذوق حضرات نے جن الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے وہ ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ مجلہ کی اس اشاعت کو بارگاہ خسروی میں بھی پیش ہونے کا شرف حاصل ہوا، جس کو ملاحظہ فرما کر اعلیٰ حضرت ظل سبحانی نے اظہار خوشنودی فرمایا۔

اس اشاعت پر مجلہ کی زندگی کا دسواں سال ختم ہوتا ہے۔ ابتدائی سالوں میں مجلہ میں ٹھوس علمی اور ادبی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اب اس میں کچھ تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ تخلیقی اور آجی مضامین بھی شائع کئے جارہے ہیں اور اس اشاعت سے تو مجلہ کو ایک اور خوشگوار ماحول نصیب ہوا ہے۔ مجلہ کے صفحات پر طالبات جامعہ کی ادبی کوششیں، امید ہے کہ جامعہ کی ادبی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہونگی۔

ہم نے اس اشاعت میں شیخ چاند مرحوم کی یاد تازہ کی ہے۔ مرحوم نے مجلہ کی بڑی خدمت کی تھی۔ ان کی

جواں مرگی کا داغ، مجلہ کے دل سے مٹائے نہ مٹے گا۔

اس سال ڈاکٹر راس مسعود کی موت سے قوم و ملک کا ایک ہونہار فرد کم ہو گیا ہے۔ مرحوم کو جامعہ عثمانیہ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس کی بنیادوں میں مرحوم کی محنت و جانکاہی کا بھی حصہ ہے۔ ہماری درخواست پر مولوی عبدالحق صاحب نے مرحوم کی شخصیت پر ایک مختصر مضمون مجلہ کے لئے عنایت فرمایا ہے۔

اس سال مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ کی جگہ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر امیر جامعہ ہونا جامعہ کی خوش بختی پر دال ہے۔ نواب صاحب کی جامعہ نوازی ضرب المثل ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی تعمیر میں سب سے زیادہ حصہ نواب صاحب ہی کا ہے۔

پروفیسر ای۔ ای۔ اسپیٹ وظیفہ حسن خدمت لے کر جامعہ سے چلے گئے۔ وہ مجلہ کے حصۂ انگریزی کے نگران تھے۔ مجلہ سے انھیں بڑی دلچسپی تھی اور بڑے خلوص اور محنت سے وہ مجلہ کا کام کرتے تھے۔ ان کی بے لوث خدمات کی یاد مجلہ کے دل میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ ان کی جگہ پروفیسر ہارڈنگ نگران مقرر ہوئے ہیں، ہمیں اُمید ہے کہ پروفیسر ہارڈنگ ان کے اچھے جانشین ثابت ہوں گے۔

اشفاق حسین

"تاریخ ادب اُردو کے چند قدیم ماخذ"

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں تاریخ ادب کے موضوع سے متعلق بکثرت کتابیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ اُردو زبان کی بدنصیبی ہے کہ اب تک اس میں کوئی مستند مکمل اور جامع تاریخ ادب مرتب نہ ہوسکی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر زمانے کا ادب اس دور کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور ہر تصنیف بجائے خود اپنے دور کے ادبی رجحانات پر روشنی ڈالتی ہے، لیکن وہ کتابیں جن کا موضوع خاص تاریخ ادب ہوتا ہے اور جو ایک معاصرانہ تنقید کی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ ادب کا سب سے اہم ماخذ ہوا کرتی ہیں۔ اس قسم کی قدیم ترین کتابوں میں شعرائے اُردو کے وہ تذکرے قابل ذکر ہیں جو فارسی زبان میں لکھے گئے تھے۔

اس سلسلے میں اُردو زبان کے مشہور شاعر میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا سب سے مقدم اور سب سے اہم ہے اگرچہ تذکرہ نکات الشعرا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن میر جیسے صاحب کمال کی ادبی تنقید اور ان کے لکھے ہوئے معاشرتی اور تاریخی حالات کے اعتبار سے اس کو تاریخ اُردو میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تذکرہ پہلے بہت کمیاب تھا لیکن اب انجمن ترقی اُردو نے حبیب الرحمن خاں شروانی سے ایک مقدمہ لکھا کر یہ کتاب شائع کردی ہے۔

میر اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے تھے لیکن زمانے کی گردش اور شاعروں کی روایتی تیرہ بختی کی بنا پر انھوں نے

کمسنی ہی میں اپنے وطن کو خیرباد کہا اور دلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا، اور ہر طرف طوائف الملوکی اور ابتری کا دور دورہ تھا۔ میر نے اپنی پریشان طبیعت کو تسلی دینے اور اپنے تصنیف و تالیف کی تشنگیٔ ذوق کو سیراب کرنے کے لئے اسی زمانے میں دو کتابیں تصنیف کیں جن میں ایک ان کی خود نوشتہ سوانح عمری ذکر میر اور دوسری تذکرہ نکات الشعرا ہے۔

نکات الشعرا کے دیباچہ میں میر صاحب نے لکھا ہے کہ "اب تک شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا"، اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکات الشعرا اگر اردو زبان کے شاعروں کا سب سے قدیم تذکرہ نہیں ہے تو بھی اولین تذکروں میں ضرور شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کا عہد تصنیف احمد شاہ بادشاہ دہلی کا زمانہ ہے۔ گویا یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا تھا جب کہ میر صاحب کا عنفوان شباب تھا اور وہ دلی میں ابھی نو وارد تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

مولف ایں نسخہ متوطن اکبرآباد است و بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہ جہان آباد است

میر صاحب کے اس انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں دلی آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور وطن کی یاد ابھی دل سے محو نہیں ہوئی تھی۔

تذکرہ نکات الشعرا کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعروں کے کلام ان کے کردار اور زندگی کے حالات کے متعلق نہایت بے لاگ تنقید کی گئی ہے لیکن تنقید میں تعصب، تنگ بینی اور تنگ نظری سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے۔ شاعروں کے کلام میں جا بجا مناسب اصلاحیں بھی دی گئی ہیں جن سے دنوں میں میر صاحب کے وجدان صحیح کی عظمت پیدا ہوتی ہے۔

شاہ مبارک آبرو کا ایک مشہور شعر ہے ؎

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقطے   اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر صاحب فرماتے ہیں اگر بجائے "اس قدر" "کس قدر" می گفت شعر بہ آسمان می رسید"

لالہ ٹیک چند بہار کا ایک شعر ہے ؎

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس   یہ عجب منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

اس پر میر صاحب نے کس قدر لطیف اصلاح دی ہے۔

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلے کا قیس حسن کیا مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

تذکرہ نکات الشعرا کے شائع ہونے سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد نے آبحیات میں اس کی ایک ایسی شکل پیش کی تھی جو اس کے اصلی خط و خال سے بالکل مختلف ہے۔ آزاد مرحوم نے لکھا ہے کہ :۔ میر صاحب نکات الشعرا کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ "یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو"۔ ان ہزار میں ایک بیچارا بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں کہ :۔ "وے شاعریست از شیطان مشہور تر"۔ آزاد کی نقل کی ہوئی عبارت دیباچہ تو کیا ساری کتاب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ ولی کے متعلق میر صاحب نے صرف یہ لکھا ہے کہ "از کمال شہرت احتیاج تعریف نہ دارد و احوالش کما ینبغی معلوم من نیست"

آزاد نے "از شیطان مشہور تر"، والا فقرہ مجموعہ نغز مولفہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے نقل کیا ہے جو آبحیات کا سب سے بڑا ماخذ ہے میر کے حالات میں ایک اور جگہ آزاد لکھتے ہیں " افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ بہت سے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے

لیکن میر صاحب کے اسلوب اور انداز بیان میں شروع سے آخر تک ایک ایسی سنجیدہ منکسر المزاجی ہے جس سے خود بخود آزاد کے بیان کی تردید ہوتی جاتی ہے۔ میر صاحب نے ہر جگہ اپنے معاصرین کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اور ان کے کمال فن کی نہایت فراخدلی سے تعریف کی ہے۔

غرض یہ کہ نکات الشعرا اس زمانے کے شاعروں کے کلام کی بلند پایہ معاصرانہ تنقید اور ان کے اخلاقی اور معاشرتی حالات کا آئینہ دار ہونے کے اعتبار سے ایک ایسا اہم اور قابل قدر تذکرہ ہے جس سے تاریخ ادب سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ہمیشہ بیش بہا مدد ملتی رہے گی۔

مخزن نکات تذکرہ نکات الشعرا کے بعد تاریخی اعتبار سے مخزن نکات مصنفہ قیام الدین قائم قابل ذکر ہے۔ یہ تذکرہ بھی پہلے کمیاب تھا لیکن مولوی عبدالحق صاحب نے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ لکھ کر انجمن ترقی اردو سے شائع کیا ہے۔

شیخ محمد قیام الدین قائم، چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے دلی کا رُخ کیا اور شاہ عالم بادشاہ دہلی کے عہد میں شاہی توپ خانہ کے داروغہ ہو گئے جب قائم دلی پہنچے تو یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ میر، سودا، اور درد نے ابھی دلی ہی میں اپنی بساط سخن جما رکھی تھی۔ قائم نے اوّل شاہ ہدایت اللہ ہدایت اور پھر خواجہ میر درد، بعد مرزا رفیع سودا سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے فن شاعری کے اعتبار سے قائم کو میر و مرزا کا ہمسر قرار دیا ہے۔ بقول آزاد...... قبول عام کچھ اور شے ہے اس لئے شہرت نہ پائی۔

جب دلی کے امور سلطنت میں خلل آگیا تو قائم نے بھی تلاش روزگار کے سلسلے میں لکھنؤ اور رامپور کا سفر کیا اور اسی زمانے میں ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی۔ تذکرہ مخزن نکات دلی ہی میں لکھا گیا تھا اس کی تصنیف کا مادہ تاریخ خود کتاب کے نام "مخزن نکات" ہی سے نکلتا ہے اس طرح گویا یہ کتاب ۱۱۶۸ھ میں تالیف ہوئی ہے۔

اس کتاب میں قائم کے علاوہ ۱۱۳ شاعروں کا تذکرہ ہے ان کی تین حصوں میں تقسیم ہوئی ہے طبقہ اوّل میں متقدمین، طبقہ دوم متوسطین اور طبقہ سوم میں متاخرین شعرا کا ذکر ہے۔ قائم نے ہر دور کے شروع میں اس طبقے کے شعرا کی خصوصیات بھی بیان کر دی ہیں جن سے ان کی سلامتی ذوق اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔

قائم نے دکنی شاعروں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

چوں فن ریختہ دراں وقت از محل اعتبار ساقط بود بنا بر علیہ ہیچ کس براں اقدام نمی نمود ایں دو چار سہ بیت لذائی کہ بنام اساتذہ معتبر مرقوم است، اغلب کہ نشائے نظمش ہزلے بیش بنا شد اما، بعد ازیں بسمت بلاد دکن در عہد عبداللہ قطب شاہ کہ باسخنوران بہ محبت و موانست پیش می آمد۔ ریختہ گفتن بہ زبان دکھنی بسیار رواج گرفت ——"

مندرجہ بالا عبارت کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائم کے نزدیک دکھنی ریختے کی بہت اہمیت تھی اور وہ دکھنی شاعری کو موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد سمجھتے تھے۔

طبقہ اوّل کے شاعروں کی ابتدا قائم نے شیخ سعدی شیرازی سے کی ہے۔ یہ عام طور پر مشہور تھا کہ سعدی جب ہندوستان تشریف لائے تھے تو انھوں نے کچھ دن سومنات کی مجاوری کی اور اسی زمانہ میں یہاں کی زبان سیکھ کر ایک دو غزلیں بھی لکھیں۔ چنانچہ سعدی دکھنی کی جو مشہور غزل فارسی اور اُردو کی ملی جلی چلی آ رہی ہے اس کے

متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ یہ سعدی شیرازی کی ہے۔ قایم بھی اسی غلطی کا شکار ہوئے اور اس غزل کو سعدی شیرازی کی تصنیف قرار دی۔ سعدی کے بعد امیر خسرو کا ذکر کیا ہے ان کے وہی چند مشہور دوہے نقل کیے ہیں جو زبان زد عام ہیں

عام تذکرہ نویسوں کی روش کے خلاف قایم نے خود اپنے حالات بہت کم لکھے ہیں اور اپنے کلام کا بہت کم انتخاب پیش کیا ہے جس سے ان کی متانت اور سنجیدہ مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔

چمنستان شعرا

مخزن نکات کی تالیف کے چند ہی سال بعد کا ایک اور تذکرہ چمنستان شعرا مصنفہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی دستیاب ہوا ہے جس کا سن تالیف ۱۱۷۵ھ ہے۔

اس تذکرے کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بہت بوسیدہ حالت میں تھا، لیکن اب انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کر دیا ہے۔

لچھمی نارائن کے والد کا نام لالہ منسا رام تھا اور وہ پیشکار صدارت کی خدمت پر مامور تھے، لچھمی نارائن کا تخلص فارسی میں صاحب اور اردو میں شفیق تھا۔ شفیق نے کتب متعارفہ شیخ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں اور شاعری میں ہندوستان کے مشہور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے تلمذ حاصل کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"در عمر یازدہ سالگی بخدمت قبلہ مرحوم حضرت شیخ عبدالقادر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کتب متعارفہ را سند کردہ ازسواد و بیاض واقف گردید۔ و پس ازاں بسلک تلامذہ قبلہ دین و دنیا حضرت میر غلام علی آزاد مدظلہ العالی درآمد"

یہ وہ زمانہ تھا کہ میر تقی میر اور فتح علی خاں گردیزی کے تذکروں کی شہرت دکن تک پہنچ چکی تھی اور اہل دکن ان کے بہت مشتاق تھے۔ شفیق نے اس عام اشتیاق کے مدنظر اور خود اپنے شعر و سخن کے ذوق کی تکمیل کے لئے یہ تذکرہ تالیف کیا۔ لکھتے ہیں:-

دریں اثنا تذکرہ نکات الشعرا تصنیف میر تقی میر۔ تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان نزول نمودہ شورے در عالم انداخت و جہانے را در اشتیاق اشعار ہند کہ بہم رسیدن آں اہل دکن را خیلے دشوار است، تہ و بالا ساخت۔ لہٰذا بخاطر فاتر و فکر ناقص گذشت کہ خود ہم ایں ہمہ اشعار ہر دو تذکرہ گرفتہ و دیگر لآلی را یکجا جمع ساختہ

بطور سفینہ کہ انیس یکتائی و ہمدم تنہائی شود نقش باد بست "

اس تذکرے میں ٢٢٢ شعرا کا حال ہے جن کے ناموں کی ترتیب بحسب حساب ابجد رکھی گئی ہے شفیق کی فراخدلی اور مذہبی رواداری لائق تحسین ہے کہ انھوں نے دستور کے مطابق تذکرے کی ابتدا حمد باری تعالیٰ اور نعت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔ اپنے کلام کا جو نمونہ تذکرے میں پیش کیا ہے، اس میں اکثر اشعار مدحت اور منقبت میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر مشہور ہے ؎

تب سے میرا نام صاحب کر ہوا مشہور یہاں جب سے اے دل میں غلام شاہ مرداں ہو گیا

آج ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں متحدہ قومیت کا خواب کبھی منت کش تعبیر نہیں ہو سکتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اتفاق واتحاد ومفاہمت، رواداری کی ایسی نظیریں پیش کی تھیں کہ جن سے ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کی تعمیر ممکن نظر آنے لگی تھی۔

شفیق نے اس تذکرے میں بیجا طرفداری اور تعصب سے ضرور کام لیا ہے، شاعروں میں ان کے نزدیک انعام اللہ خان یقین سے بڑھ کر کوئی اور نہ تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

اگرچہ یقین است کہ میرزا سودا در غزل، رباعی مخمس ومثنوی وقصیدہ وقطعہ بند وغیرہ اشعار ریختہ رتبہ رفیع می دارد۔ ولیکن در ریختہ یقین فصاحت وملاحت دیگر است

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا کرے جو فکر تتبع یقیں کا از دل وجاں

کہے گا معنی باریک وخوب وشیریں تر ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں یقین کے متعلق لکھا تھا کہ " ذائقہ شعر فہمی مطلق نہ دارد "، شفیق اس سے اس قدر برہم ہوئے کہ اپنے تذکرے میں انھوں نے میر تقی میر کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے اور جلے پھپھولے پھوڑے ہیں۔

تذکرہ شعرائے اردو تذکرہ شعرائے اردو میر حسن دہلوی کی تصنیف ہے جن کی مثنوی سحر البیان مقبول خاص وعام ہے۔ میر حسن کے اجداد ہرات (خراسان) کے تھے۔ ان کے پردادا میر امامی سب سے پہلے ہندوستان تشریف لائے اور دلی میں رہنے لگے۔ میر امامی علم وفضل اور شاعری کے اعتبار سے دلی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ اسی بنا پر میر حسن نے تفاخراً کہا تھا، میری شاعری آبائی ہے، آج کی نہیں۔

میر حسن دہلی میں پیدا ہوئے یہیں فارسی علوم کی تعلیم حاصل کی، شعر و سخن کا ذوق ابتدا سے تھا۔ خواجہ میر درد کی خدمت میں رہ کر پختگی حاصل کی تھی۔ میر ضیا کے شاگرد تھے مگر لکھتے ہیں کہ مجھ سے ان کے طرز کا نباہ نہ ہوسکا اس لئے میر درد کے طرز کی پیروی کی۔

میر حسن نے یہ تذکرہ اس زمانے میں تصنیف کیا ہے جب کہ وہ دلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے۔ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا تھا۔ اس کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے زمانے میں تصنیف ہوا جب ایک دور ختم اور دوسرا دور شروع ہو رہا تھا۔ اس طرح مولف نے دو دروں کے چشم دید حالات قلم بند کئے ہیں میر حسن نے ایک طرف تو میر، سودا، درد اور مرزا مظہر کو دیکھا تھا اور دوسری طرف مصحفی، جرات، انشا وغیرہ کی ہم جلیسی کی تھی۔

تذکرے میں سب سے اوّل شاہ عالم بادشاہ دہلی کا ذکر لکھا ہے اور یہ اس انداز کے ساتھ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک بھی اہل ملک کے دلوں میں بادشاہ کے ساتھ عقیدت مندی اور وفاداری کے جذبات تھے۔

میر حسن نے اپنے تذکرے میں میر تقی میر کی طرح جا بجا ادبی نکات بیان کئے ہیں۔ بندرابن راقم کا ایک شعر ہے ؎

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں   کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں

اس کے متعلق میر حسن لکھتے ہیں اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد، چراکہ از افتادن عین ناموزوں می شود، و در ایں ح کہ عین می افتد عین خطاست در دانست فقیر چنیں بہتر می شود ع

میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں

بندرابن مرزا رفیع سودا کے شاگرد تھے، ان پر اعتراض کرنا گویا مرزا پر اعتراض کرنا تھا۔ لیکن میر حسن کی راست گوئی قابل تحسین ہے کہ انھوں نے سودا اور میر کے خلاف اس قدر وثوق کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔

اسی طرح خاکسار کا ایک شعر ہے ؎

خاکسار اس کی تو آنکھوں سے گِنے مت لگیو   مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں اس شعر کے متعلق لکھا تھا، بر ممتع ایں فن پوشیدہ نیست کہ بجائے "بیمار کیا"، "گرفتار کیا" می بایست۔ لیکن میر حسن اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔ "درعقل فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود، گرفتا مناسب بود دے چوں ایں جا چشم معشوق است بیماری صحت دارد"

میر حسن اساتذہ اُردو کا جابجا اساتذہ فارسی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مثلاً میر ضیا کے متعلق لکھتے ہیں۔ "طرزش مانا بطرز مولانا نسبتی میر کے متعلق فرماتے ہیں:- "طرزش مانا بطرز شفائی" اور درد کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:- "کہ دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب" اس سے ان کی قوت تنقید اور قوت موازنہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر حسن نے تذکرہ لکھنے میں نہایت عالی حوصلگی اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ شیخ معین الدین معین کی جن سے میر حسن کو سخت اختلاف تھا۔ نہایت اچھے الفاظ میں تعریف و توصیف کی ہے لکھتے ہیں:-

"شہرستان معانی و باغستان سخندانی طبعش بغایت متین و نظمش نہایت مبین، شیخ محمد معین الدین المتخلص بہ معین از شہر بدایوں است۔ طرز کلامش شاعرانہ و طبع وقت پسندش بر نکتہ چینی دیوانہ۔ اکثر با شعرائے معاصرین پیچش دارد، چنانچہ یکبار بر شعر فقیر اعتراض بے جامی نمود ہر چند فہمانیدم نفہمید۔ سند مرزا رفیع دادم قبول نہ کرد۔ لیکن باوجود ایں ہمہ خود رای و خود پسندی مثل او ہم صاحب طبع پیدا نیست۔ مثنوی و قصیدہ و ہجو ہمہ خوب می گوید۔"

بعض کم سواد اور بے علم شاعروں کے متعلق نہایت کھلے اور سخت الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً شاہ محبوب مجنوں کے متعلق لکھتے ہیں:-

خود را از شاگردان میر تقی می شمارد لیکن ہماں مثل است خر عیسیٰ اگر بمکہ رود۔ چوں بیاید ہنوز خر باشد۔

غرض یہ کہ میر حسن کا تذکرہ شعرائے اُردو تاریخی اعتبار سے اور اس عہد کے شاعروں کے کلام اور ان کے حالات کی ایک سچی اور بے لاگ تنقید ہونے کی وجہ سے تاریخ ادبیات میں بہت اہم ہے اور تاریخ ادب اُردو کا مطالعہ کرنے والا اس سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکے گا۔

مجموعۂ نغز | یہ تذکرہ میر قدرت اللہ خاں قاسم کی تالیف ہے، اس میں ۶۹۳ شاعروں کے حالات اور ان کا نمونہ کلام درج ہے اس تذکرے کو پروفیسر محمود شیرانی نے بہت احتیاط، اہتمام، محنت اور صحت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس کے شائع ہو جانے سے اُردو زبان کی تاریخ کے متعلق معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے اور انڈیا آفس لائبریری کے نسخوں پر مبنی ہے۔ یہ دونوں نسخے

بہت زدہ اور کرم خوردہ تھے، پروفیسر شیرانی کو ان کے پڑھنے اور صحت کے ساتھ شائع کرنے میں بہت چھان بین کرنی پڑی
اس تذکرے کا سنہ تالیف ۱۲۲۱ھ ہے مولف نے ۱۲۲۱ھ سے پہلے جو تذکرے تھے ان میں سے اکثر تذکروں سے استفادہ کیا ہے اور ان کے حوالے بھی دیدیئے ہیں لیکن میر تقی میر کے حالات لکھنے میں قاسم نے سارا مواد صرف اپنی ہی دماغ سے فراہم کیا ہے اور ان حالات کی بنیاد کسی تذکرے پر نہیں رکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاسم نے اپنے پیرو مرشد فتح علی گردیزی کے دل میں میر صاحب کے خلاف جو مخالفانہ جذبات تھے ان کی ترجمانی کی ہے۔ اور چونکہ یہ تذکرہ، آبحیات کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس لئے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم پر بھی جو غلط بیانی کے الزام لگائے گئے ہیں ان کے اصل مرتکب قدرت خاں قاسم ٹھہرتے ہیں۔
دلی کے متعلق "از شیطان مشہور تر دالا فقرہ" آزاد مرحوم نے اسی تذکرے سے نقل کیا ہے۔
دوسرا بہتان قاسم نے میر صاحب پر یہ باندھا ہے کہ باوجودیکہ خان آرزو سے میر صاحب کو تلمذ حاصل رہا ہے اپنی طبعی نخوت اور خود پسندی کی وجہ سے اپنی شاگردی کو تسلیم نہیں کرتے حقیقت میں میر نے نکات الشعرا میں خان آرزو کی تعریف اس قدر اخلاق اور انکسار سے کی ہے کہ اس میں غرور و نخوت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"حاصل کمالات اوشان از احاطۂ بیان بیرونست۔ ہمہ استادان فن ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوار اند"

اس تذکرے میں اکثر ایسے شاعروں کا ذکر ہے جن سے قاسم ذاتی طور پر واقف تھے، ان کے جس قدر حالات دستیاب ہوئے سب بے کم و کاست لکھ دیئے ہیں، بعض لطیفے اور پر لطف حکایتیں بھی لکھ دی ہیں جن سے اس زمانے کی معاشرت اور شاعروں کی جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ سوائے دو چار شاعروں کے ہر ایک کے حالات نہایت انصاف اور راست بازی سے قلمبند کئے ہیں۔ ہر ایک کے کلام کی تعریف میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں اگرچہ اس عام تعریف سے ان کے ذوق سخن کے متعلق کسی قدر بدگمانی سی پیدا ہوتی ہے لیکن بعض مقامات پر پتے کی بھی باتیں بیان کر دی ہیں اور معقولیت کے ساتھ حق تنقید پورا کر دیا ہے۔
بعض خاص خامیوں کے قطع نظر بحیثیت مجموعی قاسم کا یہ تذکرہ اردو داں طبقہ کے لئے کافی دلچسپ ثابت ہوگا

اور قدیم ادب سے متعلق تاریخی اور معاشرتی معلومات حاصل کرنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی

تذکرہ گلزار ابراہیم و گلشن ہند

تذکرہ گلزار ابراہیم، علی ابراہیم خاں علی کی تالیف ہے جو ایک مشہور مورخ اور ادیب گزرے ہیں۔ ابراہیم پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہند کے عہد میں علی ابراہیم خاں کو شہر بنارس میں چیف مجسٹریٹی پر مامور کیا گیا اس کے بعد چند دنوں تک انھوں نے گورنری بھی کی اور سنہ ۱۲۰۱ھ میں وہیں انتقال کیا۔

تذکرہ گلزار ابراہیم، کی اہمیت اس لئے زیادہ ہو جاتی ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو ایک مستند مورخ اور مشہور ادیب تھا۔ اس تذکرے کے علاوہ علی ابراہیم خاں نے فارسی شعرا کے دو تذکرے خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم تصنیف کئے ہیں۔ ایک کتاب، وقائع جنگ مرہٹہ بھی لکھی ہے جس کا میجر فلر نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ایک کتاب میں والئی بنارس کی اس بغاوت کے حالات لکھے ہیں جو خود ان کی زندگی کے زمانے میں ہوئی تھی علی ابراہیم خاں کے بعض خطوط بھی برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہیں۔ جس سے اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور ادبی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ میں کوئی بارہ برس کی محنت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی بادشاہت آصف الدولہ کی وزارت اور وارن ہسٹنگز کی گورنر جنرلی کا تھا۔

اس کے بعد جب یہ کتاب اردو زبان کے مشہور محسن اور قدردان انگریز مسٹر جان گلکرائسٹ کی نظر سے گزری تو انھوں نے میرزا علی لطف سے فرمائش کی کہ اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کریں۔

مسٹر گلکرائسٹ کا اصل منشا یہ تھا کہ اس کتاب کو انگریز پڑھیں اور ان میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ مرزا علی لطف نے ترجمے کے دوران میں اس کتاب میں اپنی طرف سے بہت سے اضافے کئے جس کی وجہ سے گلشن ہند بجائے خود ایک علیحدہ تصنیف بن گئی۔

مرزا علی لطف کے والد کا نام مرزا کاظم بیگ خاں تھا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے، لطف نے ان ہی سے فن شعر میں مشورہ کیا تھا۔ لیکن کلام میں لطف اور چاشنی پیدا کرنے سے محروم رہے۔

تذکرہ گلشن ہند ۱۲۱۵ھ میں ترتیب دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک انگریز کی فرمائش سے لکھا گیا زبان صاف اور سادہ ہے

لیکن مقفیٰ عبارت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اس تذکرے کی بعض قابل ذکر خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اسے تاریخ ادبیات اُردو میں اہمیت حاصل ہے۔

زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس تذکرے کی مدد سے آج سے سو برس پہلے کی زبان کا اندازہ ہو سکتا ہے اور بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن میں ایک بات یہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ دکن کی آج کل کی بول چال کے بعض الفاظ جو شمال والوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت اسی قدیم زمانے کی زبان کی یادگار ہیں جو لطف کے زمانے میں رائج تھی۔

اس تذکرے کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ جن لوگوں کو سلطنت سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔ ان کے تذکرے میں تاریخی حالات خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم بادشاہ دہلی المتخلص بہ آفتاب کے متعلق ان کے زمانۂ ولیعہدی سے لے کر تخت نشینی اور موت تک کے تاریخی اور سیاسی حالات بہت خوبی کے ساتھ بہ تفصیل لکھے ہیں۔

غرض یہ کہ تذکرہ گلزار ابراہیم اور گلشن ہند کے طبع ہونے سے اُردو ادب میں نہایت قابل قدر اضافہ ہوا اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اسکے مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کا ممنون ہونا چاہیے۔

طبقات شعرائے ہند۔ طبقات شعرائے ہند کے مصنف منشی کریم الدین ہیں انھوں نے ڈاسی کی تاریخ ادب سے اکثر مواد اخذ کرکے ۱۸۴۷ء میں یہ کتاب اردو زبان میں شائع کی ہے۔ دیباچے میں حمد وغیرہ کے بعد لکھتے ہیں: "یہ شوق تذکرہ نویسی کا ان ایام میں پیرامون خاطر لوگوں کے ہوا جب بنیاد اُردو کی کامل ہوئی شروع ہوئی۔ چنانچہ نکات الشعرا تصنیف میر تقی کی جس میں بیان فارسی اور اشعار اُردو اور تذکرہ علی ابراہیم جو سب تذکروں سے بڑا ہے اس میں ۳۶۰ شاعروں کا بیان ہے۔ یہ تذکرہ مصنف بارہ برس کی محنت میں تیار کیا تھا۔ یعنی ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۴ء تک اس نے اس کتاب کی تیاری پر محنت کی۔ بعد ازاں اسی طرح پر اس فن میں کتابیں اُردو شعرائے لکھیں۔ مگر افسوس کہ کسی نے اسے شاخ تاریخ نہ رکھا۔ چنانچہ یہ ارادہ علیٰ جزا کا ہوا کہ ایک تذکرہ شعرائے ہند کا تاریخ وار جس سے ہر ایک شاعر کا سن زندگانی کا حال معلوم ہو جاوے اور یہ معلوم ہو کہ وہ شاعر کس زمانے میں موجود تھا، مع اور حالات صادقہ کے جہاں سے پاؤں جمع کرکے چھپواؤں"۔

منشی کریم الدین نے اپنے مقدور بھر صحیح حالات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس میں ان سے اکثر

فروگذاشتیں ہوگئی ہیں۔ ان فروگذاشتوں کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ اُن کے ذاتی معلومات نہایت ادھورے اور ناقص تھے اور دوسری یہ کہ اُنھوں نے دتاسی کو بلا سمجھے بوجھے نقل کر دیا ہے۔ بعض جگہ ایسی اہم فروگذاشتیں ہوگئی ہیں جن سے کتاب کی وقعت بہت گھٹ جاتی ہے۔ مثلاً میر حسن کا تذکرہ بالا تذکرے کے متعلق فرماتے ہیں "میر حسن مذکور نے تذکرہ ہندی مصنفوں کا ریختہ میں لکھا ہے" اسی طرح میر حسن کی تصنیفات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

تیسری مثنوی بدر منیر۔ اس مثنوی کے برابر آج تک کسی سے اچھی مثنوی نہیں ہوئی۔

چوتھی مثنوی سحرالبیان۔ یہ سب سے بڑی کتاب میر حسن کی ہے۔ اس میں عورتوں کی پوشاک عجیبہ کا حال بیان کیا گیا ہے اور طوائف کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں کی رسمات شادی کا بھی حال اس میں مندرج ہے۔

اُردو کا ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ سحرالبیان اور بدر منیر دو علیحدہ مثنویاں نہیں ہیں کریم الدین کے اس خلط مبحث سے ایک گونہ تعجب ہوتا ہے۔

بہر حال بہ حیثیت مجموعی طبقات شعرائے ہند میں شاعروں کے حالات سے متعلق کافی مواد مل جاتا ہے۔

آب حیات آخر میں اردو زبان کی مشہور تصنیف آب حیات کا ذکر لازمی ہے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ خوبیوں اور خامیوں دونوں کے اعتبار سے اُردو زبان میں اپنی نوع کی واحد تصنیف ہے۔

اس کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد نے پہلے اُردو زبان کی تاریخ لکھی ہے اور اس میں وہی قدیم یعنی اُردو برج بھاشا کی شاخ ہے والا نظریہ پیش کیا ہے۔ پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستانی اور ایرانی زبانیں حقیقی بہنیں ہیں۔ اس کے بعد برج بھاشا پر عربی فارسی کے سنسکرت پر بھاشا کے اور ان سب پر اُردو کے اثرات کا مختصر ذکر کیا ہے اور فارسی اور ہندی انشاپردازی پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

نظم اُردو کو آزاد نے پانچ دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ولی، آبرو، یکرنگ اور ناجی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ دوسرا دور، حاتم، تسلیم، نثار، ہدایت، خان آرزو اور فغاں پر منقسم ہے۔ تیسرے دور میں میر، درد، سودا، تاباں، یقین، اور سوز وغیرہ ہیں۔ چوتھا دور، آتش، ناسخ، جرأت، مصحفی، انشا وغیرہ پر ہے۔

اور پانچویں دور میں غالب، ذوق، مومن اور انیس و دبیر شامل ہیں۔

نظم اردو کی تاریخ کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔ یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ آزاد نے اپنی کتاب میں محض قیاسی اور روایتی مواد پیش کیا ہے جو کسی صورت میں صحت پر مبنی نہیں ہو سکتا لیکن ان کے سحر نگار قلم نے ان حالات کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ جی خواہ مخواہ قبول کر لینے کو چاہتا ہے۔ تذکرہ آب حیات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس زمانے کی مکمل اور جیتی جاگتی تصویریں سامنے آجاتی ہیں کتاب پڑھنے والا دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو کر کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو بھی آزاد کے پیدا کردہ ماحول کا ایک جزو سمجھنے لگتا ہے۔

آزاد کے قلم کا ایک خاص معجزہ یہ ہے کہ ان کی سخت سے سخت تنقید و تعریض بھی پڑھنے والے پر گراں اور ناگوار نہیں گزرتی، ان کے الفاظ شہد کے میٹھے میٹھے گھونٹ ہوتے ہیں جو بے تکلف حلق سے اترتے جاتے ہیں اور قلب کو متاثر کر دیتے ہیں۔

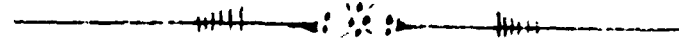
افسوس ہے کہ حسن انشا اور قدرت بیان کے اس اعلیٰ نمونے میں بھی بعض ایسی افسوس ناک فروگذاشتیں اور غلط بیانیاں ہیں جن سے اس کتاب کی علمی وقعت بہت گھٹ جاتی ہے، بایں ہمہ بحیثیت مجموعی ہماری زبان کی تاریخ میں اس کتاب کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے اور اس کی قدر و منزلت دنیائے ادب میں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی

میں نے آپ کے سامنے تاریخ ادب اردو کے چند قدیم ماخذوں پر ایک تبصرہ پیش کیا ہے ان کتابوں کی ترتیب علمی اور جدید حکمیاتی اصولوں کے مطابق تو نہیں ہے لیکن ادب اردو کا متعلم ان کی رہنمائی میں اپنے لئے بہت سی کام کی باتیں فراہم کر سکتا ہے۔

اس مضمون کی دوسری قسط میں، تاریخ ادب اردو کے جدید ماخذوں پر بھی ایک نظر ڈالی جائے گی۔ ان میں وہ کتابیں شامل ہوں گی جو لسانی تحقیق و تنقید کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں لکھی گئی ہیں اور جن سے ہم کو معیاری اور عصری معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں گارساں دتاسی، ڈاکٹر گریہم بیلی، سر جارج گریرسن، پروفیسر سوٹی کمار چیٹرجی، پروفیسر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر سید عبداللطیف وغیرہ کی انگریزی تصانیف شامل ہیں اور اردو تصانیف میں عبدالسلام ندوی، پروفیسر محمود خاں شیرانی، محمد عبدالحی، محمد یحییٰ تنہا، نواب نصیر حسین خاں خیال، حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، سردار علی تجلی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور قادری

پروفیسر عبدالقادر سروری اور مولوی سید محمد کی تصانیف بہت اہم اور اردو زبان کے لئے مایۂ نازش سمجھی جاتی ہیں اگر مجھے موقع ملا تو میں ان تمام کتابوں سے متعلق ایک مضمون کسی دوسری فرصت میں پیش کرسکوں گا۔

عمر مہاجر
متعلم بی۔اے



"عذرائے دکن" حیدرآباد سے رخصت ہوتے ہوئے

یوم جامعہ کے کل ہند، مشاعرہ میں جامعہ کی دعوت پر جناب روش بھی حیدرآباد تشریف لائے تھے، یہ نظم جامعہ سے رخصت ہوتے وقت کہی گئی ہے، اور اسے جناب روش نے خاص طور پر مجلّہ کے لئے عنایت فرمایا ہے، جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں۔ ادارہ

سر میں اک سجدۂ بیتاب لئے جاتا ہوں — حاصل منبر و محراب لئے جاتا ہوں
نگہہ ناز نے جس کو مرا آنسو سمجھا — وہ ترا گوہر خوش تاب لئے جاتا ہوں
میری آنکھوں کو سزاوار غرور و تمکیں — کہ ان آنکھوں میں ترے خواب لئے جاتا ہوں

کوئی خورشید جسے صبح نہیں کر سکتا
میں وہ تیری شب مہتاب لئے جاتا ہوں

کبھی ہو گا مرے سینے میں دل پژمردہ
اب تو اک لالۂ شاداب لئے جاتا ہوں

بے تصور ترا، پیمانہ، تری یاد، شراب
جام نایاب و مئے ناب لئے جاتا ہوں

جس کے آغوش میں سوتا ہی سکون ابدی
میں وہ اک لمحۂ بیخواب لئے جاتا ہوں

شوخیٔ نازِ تبسّم ہے ہم آغوشِ خیال
سازِ دل کے لئے مضراب لئے جاتا ہوں

روح آفاق تعاقب میں رہے سرگرداں
جانِ انجم، دل مہتاب لئے جاتا ہوں

چشمِ فردوس سے روپوش رہا جس کا جمال
میں وہی عشرت نایاب لئے جاتا ہوں

دست محبوب جو رحمت کشِ گلباری ہی
آج ہر خواب مرا مائلِ بیداری ہی

روشن صدیقی

جامعہ عثمانیہ یکم رمضان المبارک

قومیت کا تخیّل اور بین الاقوامی صورتِ حال

زمانہ کی سرعت رفتار اور حیرت انگیز ترقیات کے ساتھ انسان کی قوتِ فکر اور قوت عمل میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آج سے کچھ زمانہ پہلے کی دنیا اور موجودہ دنیا میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مادی ترقی معراج کمال کو پہونچ گئی ہے اور کوئی ایسا زینہ باقی نہیں رہا جو انسان نے طے نہ کیا ہو۔ مختلف علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی قوت متخیّلہ اور فکر یہ میں غیر معمولی تغیر رونما ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ کی تحریکات اور سیاسی فضا کے زیر اثر مختلف ممالک عالم جو اپنی قومیت کی بقا کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس سے ایک عالمگیر جنگ کے وقوع پذیر ہونے کے امکانات پیدا ہوتے جارہے ہیں اور تمام بنی نوع انسان آنے والی جنگ کے وحشت ناک اور ہمہ گیر اثرات سے متاثر ہے۔ مدبرین معاشرت اور سیاست ان سیاسی گتھیوں اور قومی اختلافات کو مٹانے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن قومیت کے مفاد کے مدنظر ہر یورپی حکومت کسی ایک بین الاقوامی سمجھوتہ پر رضامندی ظاہر کرتی نظر نہیں آتی اور حالات میں جو نزاکت اور الجھن پیدا ہوگئی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نمودار ہونا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے سیاسی مسائل آج جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں قومیت اور ملکی مفاد کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور ہر متمدن حکومت اپنی

بقا اور وسعت سلطنت کے لئے ہر قسم کا جانی و مالی نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

دنیا کی معاشرتی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی ترقیات کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے تخیلات اور جذبات قوموں کے دلوں میں نہ صرف پرورش پا رہے ہیں بلکہ روز بروز تقویت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ زمانہ کے تاریخی واقعات اور حالات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پندرھویں صدی کے اوائل میں جنگ صد سالہ اور سی سالہ میں جو قتل و خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں اس سے کچھ زیادہ سیاسی اور مادی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ بلکہ مختلف خاندان تباہ و برباد ہو گئے اور ملک کی تمدنی اور معاشرتی حالت کو زبردست دھکا پہونچا۔ البتہ ان جنگوں کے اثرات قومیت کے تخیل میں آگے چل کر نمودار ہوئے اور انگریز قوم میں قومیت کے جذبات اور حب الوطنی کا مادہ شدت کے ساتھ سیرایت کرنے لگا۔ اس قسم کے جذبات اور احساسات عوام کے دلوں میں پرورش پانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومیت کے تخیل کو زیادہ تقویت پہونچی گئی اور اس کے اثرات ملک کے سیاسی حالات اور عوام کی معاشی زندگی پر پڑنے لگے۔

قرون وسطیٰ کے آخری دور میں جو قوت غیر معمولی طریقہ سے بڑھ رہی تھی اور اپنا اثر دکھلا رہی تھی وہ قومیت ہے۔ اگر زمانہ وسطیٰ اپنے تمدنی ارتقاء اور حکومتی نظام کی مستقل بنیادوں کی وجہ سے مشہور ہے تو موجودہ دور بھی سائنس کی انتہائی ترقی اور قومیت کے فروغ کے باعث بہت اہمیت رکھتا ہے اس دور کے اوائل ہی سے بادشاہوں کی خود مختاری اور مطلق العنانی میں خاصی کمی ہو رہی تھی اور اس کی جگہ مختلف مجلسیں قایم ہو رہی تھیں جن کو عوام کی حمایت اور مقبولیت حاصل تھی۔ اس قسم کے تغیرات نہ صرف انگلستان اور فرانس میں نمودار ہوئے بلکہ اسپین میں بھی اس کے اثرات پہونچے۔ ایک طرف تو فرانس اور انگلستان کی مختلف لڑائیوں کے باعث دونوں قوموں میں قومی جذبات پرورش پا رہے تھے اور دوسری طرف اسپین میں مسلمان حکمران اور وہاں کے باشندوں کی سیاسی کشمکش اور تنازعات کی بنا پر قومیت کا تخیل ملک کے باشندوں میں جاگزیں ہو رہا تھا۔

ان لڑائیوں اور قومی جد و جہد میں عوام نے بھی کافی سے زیادہ دلچسپی لی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مفاد عامہ کا مبارک اور طاقتور احساس اور قوم پرستی کی احسن خواہش عوام کے دلوں میں جڑ پکڑتی رہی۔ اس عہد کے سلاطین

نے اس وجہ سے بھی کافی سے زیادہ اقتدار اور مقبولیت حاصل کی کہ وہ پوری قوم کے مفاد کی خاطر قومی دشمنوں کی سرکوبی کے لئے نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اپنے ملک کی رہنمائی کر رہے تھے۔

فرانس ہی پہلا ملک ہے جہاں قومیت کے جذبہ کو سب سے پہلے تقویت پہونچی۔ جنگ صدسالہ اور رابرٹ بروس کی مختلف جنگیں جو اس نے اسکاچستان کی آزادی کے لئے ایڈورڈ سلاطین سے لڑیں قومیت کے ارتقار کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ گلابوں والی جنگوں کو بھی قومیت کی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے جو انگلستان کی آپس کی خانہ جنگی اور خاندانی اختلافات کے باعث لڑی جارہی تھیں۔ ان جنگی اور قدرتی ذرائع کی وجہ سے یوروپی ممالک میں قومی جذبات کو فروغ حاصل ہوتا گیا اور زمانہ کی ترقی اور تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم اور تخیل کو بھی ہمہ گیری حاصل ہوتی گئی اور آج ہم قومیت کے جذبہ کو عالمگیر دیکھ رہے ہیں اور اسی کے اثرات سے ہر چھوٹا بڑا ملک متاثر نظر آرہا ہے۔

قومیت کی ایک اہم شرط وہ نفسی کیفیت ہے جو مشترکہ وجدانات اور احساسات کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی قوم ایک وسیع خطہ پر آباد ہو تو مقامی خصوصیات سے متاثر ہو کر اس میں مخصوص تغیرات نمودار ہوتے ہیں کسی ایک وسیع سرزمین کا ایک مملکت کے تحت ہونا تنظیمی دشواریوں کا باعث ہوتا ہے لہذا تنظیمی ضرورتوں اور معاشی خصوصیتوں کے مدنظر ایک ملک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فلاح انسانی کے لئے یہ لازمی ہے کہ اگر بین الاقوامیت پر عمل نہ ہو سکے تو کم از کم قومیت کے لئے صوبہ واریت کے مطابق عمل کیا جائے فرقہ داریت اور طبقہ واریت ترقی کے سراسر خلاف ہے طبقہ داریت کی طرح ذات ونسل کے امتیازات افراد ملک کو قومیت میں ڈھلنے سے روکتے ہیں اور ان کی وجہ سے مفاد عامہ کا نصب العین حاصل نہیں ہوسکتا

علم سیاست کی اصطلاح میں قوم سے ان تمام علاقوں کی آبادی مراد ہے جو ایک مملکت کے زیر اثر ہو چاہے اس میں کتنی ہی قومیں مختلف رنگ ونسل، تہذیب وتمدن اور زبان کی آباد ہوں لیکن قومیت کا مفہوم اس سے ذرا مختلف ہے۔ قومیت کے لئے مشترکہ وجدانات، جذبات اور احساسات کی ضرورت ہے جب تک کہ پوری آبادی کے جذبات اور وجدانات میں ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا نہ ہو قومیت کو تقویت حاصل نہیں ہوسکتی لہذا قومیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک مملکت کے زیر اثر جتنی بھی آبادی ہو اس کے اگر جذبات، وجدانات

اور کوشش نہ صرف مشترک بلکہ متحد ہو تو اس کو قومیت کہا جائے گا۔ بعض ممالک میں گو مختلف نسلیں آباد ہیں ان میں کوئی قومی تعلق نہیں رنگ و نسل کے اعتبار سے بھی مختلف ہے زبان بھی جدا بولتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ملک کے مفاد کی خاطر باہم متحد و متفق ہو کر اس کو ترقی کے زینہ تک پہونچانے کی مشترکہ کوشش کرتے ہیں تو اس قسم کی کوشش قومیت کی تعریف میں آجاتی ہیں مثلاً سوئیزرلینڈ کی تمام آبادی بیک وقت آباد نہیں ہوئی بلکہ مختلف زبانوں میں یکے بعد دیگرے مختلف قومیں آباد ہوتی گئیں جس کی وجہ سے ان کے رنگ و نسل تہذیب و تمدن اور زبان میں بھی اچھا خاصا فرق ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی کمزوری کا احساس کر کے باہم متحد ہو گئے ہیں اور ملک کے مفاد کی خاطر متحدہ طور پر قربانیاں کرنے کو تیار رہتے ہیں اس قسم کے احساسات، اور جذبات کو قومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے سوئیزرلینڈ سیاسی خوشگوار فضا دوسرے ممالک کے لئے قابل تقلید اور لایق رشک ہے۔ وہاں کے بعض اضلاع میں تو مجلس مقننہ ہی کا وجود نہیں اور قانون سازی براہ راست ہوتی ہے ظاہر ہے اس قسم کا قانون قومی خصوصیات اور جغرافی حالات کے مدنظر ملک کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔ سوئیزرلینڈ ہی میں روسیو کے نظریوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے۔

خوشگوار حکومت کے لئے قومیت کی سخت ضرورت ہے ایسے ممالک جہاں قومی حکومت قایم نہیں وہاں کے حالات اور واقعات کچھ ٹھیک نہیں ہوتے بلکہ وہاں کی آبادی ایک قسم کی بے چینی محسوس کرتی ہے۔ فلسطین میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں یہودیوں اور مسلمانوں میں نہ ختم ہونے والے اختلافات موجود ہیں یہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہاں قومی حکومت قایم نہ کی جائے۔ فی الحال وہاں انگریزوں کی سیادت قائم ہے لیکن اہل فلسطین کامل آزادی کے لئے شدت کے ساتھ اپنے مطالبات میں راسخ ہوتے جارہے ہیں قومی حکومت کے فوائد کو تمام ممالک نہایت سرعت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں جنگ عظیم کے وحشت ناک اور ہمہ گیر اثرات کے بعد یورپ میں تقریباً ہر جگہ جمہوری اور قومی حکومت قائم ہو گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کے تخیل کو ضرورت سے زیادہ تقویت حاصل ہو رہی ہے اور تمام دنیا میں ایک تلاطم برپا ہے۔ قومی حکومت کے فوائد تو سب پر روشن ہیں۔ قوم کے مفاد اور رجحانات کے مطابق قوانین نافذ کئے جاتے ہیں اور ہر قسم کی ترقی کے لئے بلا روک ٹوک ذرائع بہم پہونچائے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

جہاں قومی حکومت قایم نہیں وہاں قومیت کے تخیل کی وجہ سے وہ لوگ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ غیر قومی حکومت کو کسی طرح سے نکال باہر کریں چنانچہ بعض ایشیائی ممالک میں جہاں کہ قومی حکومت قایم نہیں ہے برابر اس قسم کی بے چینی محسوس کی جارہی ہے اور وہ لوگ اس بات کے آرزومند ہیں کہ اپنے ملک میں بھی قومی حکومت قائم کریں۔ اس مقصد کے حصول میں آئے دن جنگی تیاریاں ہوتی رہتی ہیں اور قتل و غارت کے بازار گرم کئے جاتے ہیں تمام دنیا کے ممالک پر نظر ڈالی جائے تو یہی معلوم ہوگا کہ ہر جگہ قومیت کا زور ہے اور جہاں قومیت کے جذبات پائے نہیں جاتے وہاں قومیت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے

قومیت کے تخیل کا فروغ نتیجہ ہے موجودہ زمانہ کی علمی۔ فنی اور تعلیمی ترقی کا مختلف ادارے اور مدارس قائم ہیں تقریبًا تمام یونیورسٹیوں کا کورس ایک ہی قسم کا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے خیالات، واقعات اور رجحانات تقریبًا ہر طالب علم میں پیدا ہو جاتے ہیں ان خیالات کی یکسانی اور یکرنگی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ مختلف قسم کی تحریکات جو عالمگیر مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جس کی وجہ سے قومیت کے تخیل کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ قومیت سے بڑھ کر ایک اور درجہ بین الاقوامیت کا ہے جب عوام کے معلومات، رجحانات اور خیالات اور ذہنیتوں میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے تو بین الاقوامیت کے خیالات دماغوں میں اجاگر ہوجاتے ہیں جنگ عظیم کے وحشت ناک اور تباہ کن اثرات سے خائف ہوکر آیندہ کی ہنگامہ خیز اور خونریز لڑائیوں کے سدباب اور عالمگیر امن دنیا میں قائم کرنے کے لئے ولسن کی کوششوں کی وجہ سے مجلس اقوام کا وجود عمل میں آیا اور جو اپنے مقاصد میں بڑی حد تک ناکام رہی۔ حبشہ کے مسئلہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی، جاپان نے اس کے قوانین کی خلاف ورزی کی اور جرمنی آئے دن ان معاہدات اور قوانین کو توڑتا جا رہا ہے لیکن مجلس اقوام ان کے خلاف قدم اٹھا نہیں سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ مجلس اقوام میں بھی مختلف سلطنتوں کے نمایندے شرکت کرتے ہیں اور وہ ہر حالت میں اپنی قوم و ملک قوم کے نہ صرف بہی خواہ رہتے ہیں بلکہ ہر ممکن کوشش سے ملک کو فائدہ پہونچانے کے درپے رہتے ہیں۔ مجلس اقوام کے اراکین بھی اپنے ملک کی مفاد کی خاطر بین الاقوامی مفاد کو ٹھکرا دیتے ہیں جس کا نتیجہ مجلس اقوام کی ناکامی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس

ناکامی کے اسباب کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامیت کے تخیل کے مقابلہ میں قومیت کے تخیل کو ہر قوم کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے امن عامہ یا عالمگیر جنگ کے اثرات روکنے کے لیے جو قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اس پر کوئی قوم تیار نہیں ہے۔ اس خود غرضی اور قومیت کے فروغ کی وجہ سے دنیا کے حالات دگرگوں ہوگئے ہیں اور روز بروز جنگ کے امکانات اور خطرات نمایاں ہوتے جارہے ہیں اور مدبرین سیاست اس قومیت کے سیلاب کو روکنے سے قاصر ہے سیاسی کشمکشوں اور بین الاقوامی اختلافات کو سلجھانے کے لئے دنیا کو ابھی ایک قدم اور آگے اٹھانا چاہیے ورنہ موجودہ تنگ نظری اور ذاتی مفاد سے جنگ عظیم کا متوقع بے پناہ سیلاب کبھی بھی نہیں رک سکتا۔ اور اس کے قیامت خیز اور دہشت ناک اور تباہ کن عالمگیر اثرات سے دنیا کو آخر کار دوچار ہونا ہی پڑیگا۔ جس کے باعث امن عامہ کو زبردست دھکا پہونچے گا۔ لاکھوں بندگان خدا کا خون بہیگا۔ اس جنگ کے ہیبت ناک شعلے دنیا کی تمام معاشرتی، سماجی، تمدنی اور سیاسی اور حکمی ترقی کو بھی جھلس کر رکھ دیں گے اور خوبصورت اور عالیشان شہروں اور مغرب کے دلفریب مسحور کن دنیادی جنت نظیر خطوں کو خاکستر کرکے رہیں گے۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ قومیت کے حالیہ تلاطم خیز اثرات تمام ممالک پر کیا پڑے اور ان میں اب جو سیاسی کشمکش اور بین الاقوامی اختلافات جاری ہیں اور ایک جنگ عظیم کی جو توقع کی جارہی ہے اس کا قومیت کے تخیل کے ساتھ کس قدر تعلق اور بین الاقوامی سیاسیات میں قومیت کا کتنا حصہ ہے۔

۱۹۳۶ء کے بارے میں نجومیوں نے طرح طرح کی تباہیوں اور ہولناکیوں کی پیش گوئیاں کی تھیں لیکن غنیمت ہے کہ وہ سال ختم ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ۳۷ء میں امن وامان کا دور دورہ ہوگا یا بے چینی اضطراب اور بدامنی پھیلے گی اس میں شک نہیں کہ بین الاقوامی سیاست کی متعدد گتھیاں ابھی ایسی ہیں جن کا سلجھنا باقی ہے مثلاً ہسپانیہ کا مسئلہ، چین و جاپان کی کشمکش، تجارتی توازن کا برقرار رکھنا، عام اقتصادی حالت کی درستگی ایسے مسایل ہیں جو بڑے خطرناک ہیں مختلف حکومتیں اپنے اپنے تناسب کے اعتبار سے رفتہ رفتہ باہم توازن قایم کرنے کی فکر میں ہے اور معاشی اصلاح میں کوشاں ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ سال نو امن کا پیام لایا ہے یہ ممکن تو تھا لیکن جب تک بااثر حکومتیں رعایات

دینے کے لئے تیار نہ ہوں کامل امن وامان کی فضاء پیدا نہیں ہوسکتی اور بڑی سلطنتوں میں امن کا انحصار بالخصوص جرمن پر ہے۔

اگر حق پوچھئے تو بڑی سلطنتوں میں جرمنی ہی ایک ایسی طاقت ہے جہاں سیاسی حالات کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے جرمنی کے بحری بیڑے کو مستثنیٰ کر دیا جائے کیونکہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ معاہدہ کے مطابق معین حد سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ تو اس کی فوجی تیاریاں اس حد تک پہونچ چکی ہیں جو کسی دوسرے ملک کو میسر نہیں اس کی بری فوج فضائی بیڑہ کیمیاوی ساز و سامان آلات جنگ ذرائع حمل و نقل غرض کہ جملہ تیاریاں زمانہ جنگ کی ضروریات کے عین مطابق ہیں، جنگ کی تیاریوں میں جرمن قوم کو بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑے جرمنی کی آئے دن کی مشکلات نے اُسے دوسرے ممالک کی طرف حریصانہ نگاہ ڈالنے پر مجبور کیا۔ ہسپانیہ میں عدم مداخلت کا مسئلہ، چین و جاپان کا تصادم، عالمگیر معاشی استحکام یہ اہم مسائل ایک ہی وقت میں جرمنی کے سامنے آگئے ہیں جس سے وہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے کہ ان کو حل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی اقدام لازمی ہے اس وقت کسی دوسری سلطنت کو ان ضروریات کا سامنا نہیں۔ آیندہ بین الاقوامی جنگ کے آثار ہٹلر کی حکمت عملی اور طرز عمل پر منحصر ہیں اور ترازو جرمنی کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے جھکا سکتا ہے۔

حال میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا اس کی بنا پر دونوں قوموں نے طے کیا کہ بحر روم کے علاقہ میں سیاسی معاملات کو جوں کا توں رکھا جائے اس کا مطلب بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی اسپین کے باغیوں کی امداد بند کر دے گا لیکن اٹلی نے اس سمجھوتہ کی تاویل بالکل مختلف کی۔ اطالیہ کے نزدیک اسی کے یہ معنی ہیں کہ حکومت برطانیہ اسپین میں روسی اثر بڑھنے نہ دیگی قرائن سے اطالیہ کی تاویل صحیح معلوم ہو رہی ہے اس لئے کہ اگر برطانوی تاویل صحیح سمجھ لی جائے تو اطالیہ پر لازم ہے کہ اسپین کے وہ علاقے جو اس وقت اس کی فوج کے قبضے میں ہیں خالی کر دیئے جائیں لیکن اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے غریب ہسپانیہ کو اس سمجھوتہ سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ اگر کچھ حاصل ہوا ہے تو انگریزوں کو جنھیں حبش اور اطالیہ کی جنگ کے زمانہ میں اپنا تمام بحری بیڑہ مجبوراً بحر روم میں اکٹھا کرنا پڑا تھا لیکن اب اس سمجھوتہ کے بعد وہ پھر مسولینی کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے بیڑے کو از سر نو تقسیم کر رہے ہیں۔

موجودہ صورت حال کا دوسرا پہلو بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں باغیوں کی امداد کرنے کے لئے جرمنی سے سامان جنگ اور رضا کاروں کی امداد برابر جاری ہے۔ کیا اس کا یہ تو مطلب نہیں ہے کہ برطانیہ کے ساتھ اٹلی کا یہ معاہدہ جرمنی کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ اٹلی کو حبش کے مفتوحہ علاقے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اسے پوری توجہ اور ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اس لئے خیال ہے کہ اٹلی کوئی عملی امداد باغیوں کو نہ دے گا بلکہ جرمنی کا خواب پورا ہوگا جو فرانس کے لئے خطرناک ہے۔

جرمن اسپین کو فتح کرنا تو نہیں چاہتا البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اسپین مین ایسی حکومت کا قیام رہے جو ضرورت کے وقت جرمنی کے کام آئے۔ جرمنی کی خواہش ہے کہ فرانس سے جنگ کی صورت میں اسپین کی افواج جنوب مغرب سے دھاوا کردیں اور شمال و مشرق میں جرمنی کے خلاف فرانس کی مدافعت کمزور کردیں۔ اس کے علاوہ وہ اسپین کی بندرگاہ اور اسپینی مراکش سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اسپین کی بندرگاہوں پر اس وقت جرمنی کا کافی اثر موجود ہے۔ بغاوت سے پہلے تجارت کا مال اسپین کے جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے مگر اب چونکہ اسپین کے جہازوں کو دشمن کا خطرہ ہے اس لئے یہ کام جرمنی جہازوں کو مل گیا ہے اور نہ صرف رسل و رسائل کا کام جرمن کمپنیوں کو مل رہا ہے بلکہ درآمد و برآمد کا کام بھی وہی انجام دے رہی ہیں۔

جرمنی کا معاشی اثر بھی اسپین میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے گزشتہ ایام میں کوئی سوا لاکھ لوہے کے پیپے زیتون کے تیل کے لئے جرمن کارخانوں کو مہیا کرنے کا آرڈر ملا تھا جس میں نصف کے قریب وہاں پہونچائے جاچکے ہیں پہلے یہ پیپے ہالینڈ یا فرانس سے آتے تھے اور نسبتاً کم قیمت پر مل جاتے تھے۔ اب جرمنی سے لئے گئے اور زیادہ دام دیئے گئے۔

دوسری جانب وہ چیزیں جن کی جرمنی کو ضرورت ہے اور جو اسپین سے مل سکتی ہیں آسانی سے جرمنی کو مہیا ہو رہی ہیں اون اور کارک بہت بڑی مقدار میں جرمن ایجنٹ خرید رہے ہیں اور مراکش میں اسپین کی کانوں سے لوہا بہت زیادہ مقدار میں نکالا جارہا ہے۔ یہ سب کاروبار اسپین کو جرمنی کا پابند کررہا ہے اور ہٹلر بھی مجلس اقوام کو بھول محض سمجھ کر کھلم کھلا باغیوں کی امداد کررہا ہے تاکہ فتح کی صورت میں وہ اپنی اس مدد کی پوری قیمت وصول کرسکے۔

ممالک عالم کی سیاسی کشمکشوں پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر متمدن اور ترقی یافتہ ملک جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ فوجیں تیار کی جارہی ہیں۔ بے شمار سامان اسلحہ فراہم کئے جارہے ہیں۔ مملکت کی بیشتر آمدنی کا حصہ فوجی اخراجات اور خریدی اسلحہ پر صرف کیا جارہا ہے جس کے باعث ایک حد تک تعلیمی اتمدنی ترقی رُکی ہوئی ہے اور زائد ٹکس وصول کرکے عوام کے آمدنیوں پر ایک بڑا بھاری بوجھ ڈال رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر ملک اور وہاں کی آبادی ان مالی قربانیوں اور ذاتی مفاد کو ٹھکرا کر قومیت کے تخیل میں خندہ پیشانی کے ساتھ تمام آلام و مصائب کا سامنا کر رہی ہے۔ جرمنی میں تو عورتیں بھی فوجی خدمات کے لئے تیار کی جارہی ہے اور وہ بھی مردوں سے پیش پیش نہیں تو پیچھے بھی نہیں بلکہ اس کے برابر ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ جرمن میں ہرہٹلر کا دورہ ہے۔ کمیونزم کی مخالفت کا زور ہے۔ ہٹلر کے ہاتھوں میں تمام ملک کی باگ ڈور ہے۔ اس کی ایک نوٹس پر ایک لاکھ مسلح فوج میدان کارزار میں کھڑی کر دی جاسکتی ہے۔ تخفیف اسلحہ کا سوال جب اس کے آگے پیش کیا گیا اور مجلس اقوام کے قوانین یاد دلائے گئے تو ہٹلر نے ان کی ذرا بھی پروا نہ کی اور ایک فاتحانہ انداز میں مجلس اقوام سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اس بات کا اعلان بلاخوف کر دیا کہ جرمنی نوآبادیات جو جنگ عظیم میں جرمنی سے علیحدہ ہوگئے ہیں واپس کر دیئے جائیں ورنہ وہ بزور شمشیر ان علاقوں پر قبضہ کرے گا مجلس اقوام خاموشی کے ساتھ اس کو سنتی رہی لیکن کوئی موثر اقدام جرمنی کے خلاف نہ اٹھا سکی۔ چنانچہ جرمنی نے رائن لینڈ پر زبردستی قبضہ کر لیا اور دوسرے مقبوضات حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ حالیہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی مجلس اقوام کے معاہدوں اور قوانین کی روز بروز خلاف ورزی کرتا جارہا ہے اور اپنے حدود سلطنت وسیع کرنے پر تلا ہوا ہے چنانچہ جب ہٹلر سے تخفیف اسلحہ اور بین الاقوامی سمجھوتہ اور مفاہمت کے لئے کہا گیا تو اس نے اعلان کر دیا کہ جرمن ان سمجھوتوں اور مفاہمتوں کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے قومیت کے تخیل پر حرف آتا ہو اور جرمنی مفاد خطرہ میں ہو۔ جس قسم کی سہولتیں اور تدبیریں جرمنی مفاد کے موافق ہوں گی انھیں کو بروئے کار لایا جائے گا۔ اس شاندار اور پرزور جواب کے بعد اقوام عالم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ حسرت سے حالات اور واقعات کے نتائج پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوئیں۔ جرمنی نے جنگ عظیم میں سب دول سے زیادہ نقصان اٹھایا لیکن اس کے باوجود اس نے نہایت قلیل عرصہ میں اپنی پچھلی گری ہوئی حالت کو سنبھال لیا اور دوسرے ملک

کے دوش بدوش کھڑا ہوگیا بلکہ تمام اقوام عالم کو جنگ کا پیام دینے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ یہ ہے جرمنی کی حالت جو ایک یورپ کی ممتاز اور متمدن حکومت ہے جس کے اٹل ارادوں اور مستقل تدبیروں کے آگے امن عامہ کی جڑیں نہ صرف متزلزل بلکہ کھوکھلی ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ مسٹر ایڈین نے، جو برطانوی حکومت کے وزیر خارجہ ہیں اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ دنیا کے امن و جنگ کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک جرمن کے طرز عمل پر منحصر ہے۔

جرمنی کے ساتھ ساتھ جاپان بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ قائم کرچکا ہے اور باوجود مختصر ہونے کے تمام دنیا کو ہلا کر اور بین الاقوامی مارکٹ کا تنہا مالک ہونا چاہتا ہے۔ اس میں اس کو کس حد تک کامیابی ہوئی اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں صرف دیکھنا ہے کہ مختلف ممالک عالم میں قومیت کے تخیل کی وجہ سے جو تلاطم برپا ہے اس کے اثرات جنگ عظیم کی صورت میں ظہور پذیر ہوں گے اور امن عامہ خطرہ میں پڑ جائے گا۔ جاپان نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کرلیا۔ اگرچہ کہ مختلف دول اس کے مخالف تھے لیکن دو زبردست طاقتوں کو زبردستی روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ دیکھتے دیکھتے اس نے منچوریا پر قبضہ کرلیا اور پورے چین کو ہضم کرجانے کی فکر میں ہے۔ مجلس اقوام سے علیحدگی اختیار کرلی لیکن اس کے باوجود جو مقبوضات جنگ عظیم میں عارضی طور پر اسے ملے تھے وہ واپس نہیں کئے۔ اور واپس طلب کرنے کی کسی کو مجال نہ ہوئی جاپان کی حیرت انگیز اور محیر العقول ترقی تمام ممالک کے لئے قابل رشک ہے۔ پچاس سال کے اندر اس نے وہ ترقی کی جو صدیوں میں بھی ممکن نہ تھی۔ پہلے پہلے اس نے علوم و فنون اور سائنس کو ترقی دی، ممالک غیر کے لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ جاپانی پروفیسر یونیورسٹی میں مقرر کئے۔ جبری تعلیم عام کردی۔ فوجی تعلیم بھی ضروری کردی۔ اس طرح سے دنیا کی ہر ایک ترقی پر نہ صرف قابو پالیا بلکہ دنیا کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا۔ اور آج ہر سلطنت اس سے خائف نظر آتی ہے قومیت کا تخیل زوروں پر ہے اور اس سے تلاطم برپا ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔

اسی طرح اٹلی اور فرانس کی حالت ہے۔ یہاں بھی قومیت کا تخیل زوروں پر ہے۔ جنگ کی تیاریاں خوب ہو رہی ہیں مسولینی تمام سیاہ و سفید کا مالک ہے جس کا ہر اشارہ اٹلی کے باشندے پر خداوندی حکم رکھتا ہے مسولینی پھر سے رومن امپائیر قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اور بیچارے حبش کو ختم کرکے فرعون بنا ہوا ہے۔ فرانس کی

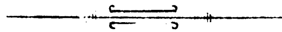
یہ حالت ہے کہ جمہوریت کے رنگ میں نپولین کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہے اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن سب میں زیادہ تعجب خیز اور دلچسپ حالت سلطنت برطانیہ کی ہے اور وہ ابھی فوری جنگ کے لئے تیار نہیں لہذا وہ مجلس اقوام کو کامیاب بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ اور اپنی سیاسی حکمت عملی اور غیر جانبدارانہ پالیسی سے معاملات سلجھانے کی فکر میں ہے برطانیہ کو اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوگی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ غرض معلوم یہ ہوتا ہے کہ دنیا آج جس دور سے گزر رہی ہے وہ ایک قومیت کا دور ہے ہر ملک میں قومی احساس اور جذبہ پیدا ہو رہا ہے لوگ اپنی قوم اور ملک کی حد تک ہی انصاف پسند اور صلح کے جویاں ہیں ملک سے باہر حالات جو کچھ بھی ہو جائیں انھیں اس کی پرواہ نہیں۔ جو کام بھی کیا جائے اس میں ملکی اور قومی پہلو کا عنصر غالب ہو چاہے بین الاقوامیت کو اس سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہونچتا ہو اور امن عامہ کتنا ہی خطرہ میں کیوں ہو اسے کچھ پرواہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومیت کے تخیل میں ہر ملک ڈوبا نظر آرہا ہے اور قومیت کا رنگ اس قدر غالب ہوگیا ہے کہ دنیا کی تمام تمدنی، معاشرتی، سیاسی، تعلیمی اور فنی ترقیات کو بھی ٹھکرا دینے کے لئے تیار ہے جہاں قومیت کا یہ زور ہو اور ہر ملک جنگ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتا ہو اور ہر شخص قومیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو وہاں عالمگیر امن کے خواب دیکھنا اور صلح ومفاہمت کے ذریعہ سے سیاسی گتھیوں کو سلجھانا تقریباً امر محال نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا نامناسب نہیں ہے کہ آجکل قومیت کا حالیہ تخیل دنیا میں تلاطم برپا کر رہا ہے اور ایک عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ہے۔

قومیت کے سلسلہ میں ہم اپنے نادار اور مفلس ملک ہندوستان کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ یہاں بھی قومیت کی جھلک نظر آتی ہے اور مختلف بٹی ہوئی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو رہی ہیں۔ اس خصوص میں مہاتما گاندھی مولانا محمد علی مرحوم اور پنڈت جواہر لال کی بے لوث خدمات، گراں بہا قربانیاں اور انتھک کوششیں ہمیشہ صفحہ تاریخ میں قابل یادگار رہیں گے اور ہندوستان کی قومی تاریخ میں ان مصلحین کی قومی قربانیوں اور وطن پرستانہ جذبات کو امتیازی خصوصیت حاصل رہے گی۔ ہندوستان میں قومی جدوجہد کی جو تحریک فروغ پاتی نظر آرہی ہے وہ ایک طرف تو قومی رہنمایان کی جد و جہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے تو دوسری طرف علم کی اشاعت بھی اس جدوجہد میں کافی حصہ لے رہی ہے حالات اور واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری سماج بھی اب کروٹ لے رہی ہے

اور خواب غفلت سے بیدار ہو رہی ہے ۔ فرقہ دارانہ جذبات اور مذہبی تعصبات کو مٹا کر ایک قوم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ ہندوستان کی خلاصی اور راہ نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنے فرزندوں کے دلوں میں مشترکہ قومی جذبات اور احساسات پیدا کرے ۔

اپریل میں جو قانون نافذ کیا گیا ہے وہ ہندوستانیوں کے مطالبات کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ناکافی ہے اسی باعث یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو سارے ہندوستان میں یوم ہڑتال منایا گیا ۔ کانگریس کی کوششیں قومی جدوجہد میں قابل مبارکباد ہیں ۔ نیا نظم اور تعلیم کی اشاعت قومیت کی تعمیر کے لئے لابدی عناصر ہیں وہ دن کچھ دور نہیں کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی قومیت کے جذبات پرورش پا کر تقویت حاصل کریں گے اور ایک دن ہندوستان کو بھی حقیقی آزادی کے دن دیکھنا پڑے گا ۔ اور ہم بھی اس قابل ہوں گے کہ ہمارا قومیت کا تخیل ساری دنیا میں ایک تلاطم اور ہنگامہ پیدا کردے

محمد شمس الدین فاروقی متعلم شال رم



مہارانی

(۱)

مہاراجہ چندی داس کی، اکٹھی پچاس رانیاں اب تک محل میں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر کو تو نہایت نیچ ذات کا بتلایا جاتا ہے۔ تنبولن، مہترانی، بھٹیارن، جس کسی پر بے اختیار راجہ جی کی رال ٹپک گئی، فوراً شاہی سکھ نورس میں داخل کردی گئی۔ راجہ نے دو ایک سال پہلے، ہندوستان کے مخصوص شہروں کا دورہ کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں الہ آباد بھی ہو آئے۔ ایک دن اپنی موٹر میں "خسرو باغ" کی سڑک سے گزر رہے تھے دفعتہً ایک نوخیز دوشیزہ سے نظریں دوچار ہوگئیں۔ پندرہ سولہ سال کا سن، گوری رنگت، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، زاہد فریب انداز، نک سک سے درست، تناسب اعضا کا یہ عالم کہ اس کی ہر خوبی پر تنہا سمرقند اور بخارا ہی نہیں بلکہ ایران اور ہندوستان جیسی وسیع مملکتیں نثار، کردی جاسکیں۔ راجہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں للتا دیوی کو محبت کا پیام سنایا۔ وہ پہلی ہی نظر میں اس کے غیر معمولی شان وشکوہ اور ظاہری طمطراق سے سہمی جارہی تھی، کسی نامعلوم کسک نے، اس کے دل کو مسوسنا شروع کیا، اور وہ سوجان سے موٹر نشین کنہیا جی پر نثار ہوگئی۔ شکست کے اعتراف میں اس نے اپنی نگاہیں زمین میں گاڑدیں، راجہ فطرت کے،

اس حسین اور شگفتہ پھول کو، سونے اور چاندی کی در انیتوں سے کانٹوں میں گھسیٹتا ہوا، شاہی مہمان خانہ کو روانہ ہوگیا
للتا، جے دیال کی اکلوتی بیٹی تھی، اس کا باپ دودھ، دہی اور کھلی کا بیوپار کرتا تھا، بڑھاپے کی اولاد
ماں باپ کو جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، جے دیال، دو نوجوان، خوب رو اور تنومند بیٹوں کو اپنے بوڑھے
ہاتھوں سے آگ دے چکا تھا۔ للتا دیوی کے بغیر، زندگی کی آخری منزلیں اس کے لئے نہایت کٹھن اور
بے کیف ہو جاتیں اگر وہ اس سنسار کو ترک کرکے دیوانہ وار بنوں کی طرف نکل پڑتا تو کوئی تعجب نہ تھا۔
چندی داس نے محل میں پہنچتے ہی، اُسے اپنی سرکار میں طلب کیا۔ ہرکارے، حکم کی تعمیل میں اس کی
دوکان پر دوڑے ہوئے آئے،

"ہستناپور کے راجہ جی کو بھلا ہم گریب، آدمیوں سے کیا کام!" بوڑھے نے انتہائی خودداری اور حقارت
آمیز تبسم کے ساتھ ہرکاروں سے دریافت کیا۔
"حضور تمھیں بہت سرفراز کریں گے، ٹھاکر جی، ان کی ذراسی عنایت سے تمھارے بھاگ نہ کھل نہ جائیں
تو میرا ذمہ، تم وہیں چل کر دریافت کر لو کہ راجہ جی نے تمھیں کیوں طلب فرمایا ہے"
ان میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے کہا بھلا۔ ایسے موقع روز تھوڑے
نصیب ہوتے ہیں، تم پر بھگوان کی دیا ہوئی ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے: ایشور کی قسم، راجہ
نے تمھیں کسی برے ارادے سے نہیں بلوایا ہے"
جے دیال، دیہاتی لٹھ ہاتھ میں لئے کندھے پر رومال ڈالے، بادل ناخواستہ چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا،
راجہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی، محل کے دروازے تک اس کا استقبال کیا، پھول، پان اور عطر سے
جے دیال کی عمر میں پہلی مرتبہ تواضع کی گئی،
راجہ۔ کیوں دادا جی، تمھارے کتنی اولادیں ہیں؟
ٹھاکر۔ ہجور، بھگت ایک پتری کے سوا، اس سنسار میں میرا کوئی نہیں۔
راجہ۔ یہ وہی لڑکی تو نہیں دادا جی جو تمھارے غیاب میں تمھاری دوکان پر بیٹھا کرتی ہے؟
ٹھاکر۔ ہاں ہجور وہی ہے امیری روپ سنگھار، للتا دیوی، میں اس کی کماترا تنی تپسیا کر رہا ہوں سرکار!

راجہ۔ تو پھر دادا جی تم نے اب تک کہیں اس کی بات نہیں ٹھرائی، وہ عمر بھر اَن بیاہی تو نہ بیٹھی رہے گی ؟

بوڑھے کا چہرہ راجہ کے اس غیر متعلق سوال سے متغیر ہو گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

ٹھاکر۔ ہجور، سرکار لوگوں کو گریبوں کے شادی بیاہ سے کیا مطلب، ایشور کی مرجی، وہ چاہے تو آج ہی اس کا انجام کر دے،۔ نا چاہے تو نا کرے !

راجہ۔ خفا کاہے کو ہوتے ہو دادا، میں نے تو صرف ایک بات کہی تھی۔ نارائن کی دیا سے، تمہاری لڑکی ایسی قبول صورت ہے کہ بڑے بڑے اس کی خواستگاری کر سکتے ہیں، تم للتا، جیسے انمول موتی کے مالک ہو، غریب کاہے کو ہونے چلے !،، بوڑھا ٹھاکر دنیا کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا، محض فراست سے تاڑ گیا کہ راجہ نے کن ارادوں کے تحت اُس پر یہ کرم کئے ہیں۔ فوراً اس کی ابرو پر بل پڑ گئے، زمین پر لاٹھی ٹیکتے ہوئے کہا۔

راجہ جی۔ للتا کوئی پاپن تو ہے نہیں کہ اُس کو کسی رئیس سے بیاہ دیا جائے۔ امیر لوگ، گریبوں کی اِجت بگاڑ دینے کے بعد ان سے بات تک بھی نہیں پوچھتے۔ نا سرکار میں اپنی من موہن للتا کو جانتے بوجھتے آگ میں نہیں جھونکوں گا !،،

بوڑھے کا عزم آہنیں اس کی پیشانی پر رقص کر رہا تھا۔ راجہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی ذلت گوارا کر لی۔ جے دیال بڑبڑاتا ہوا محل سے روانہ ہو گیا۔

(۲)

للتا کا شفیق باپ، اس واقعہ کے دو تین روز بعد، ایک ہفتہ تک گھر سے غائب رہا۔ بیٹی نے اپنے پیارے پتا کی یاد میں الہ آباد کا چپہ چپہ چھان مارا، لیکن وہ نورانی صورت اسے کہیں بھی نظر نہ آسکی۔ قدرت ہمیشہ شرافت اور سچائی کے خلاف بغاوت کیا کرتی ہے۔ آسمانی دیوتاؤں نے للتا کے درد بھرے نالوں کا من مانے مذاق اُڑایا اور باپ کی تلاش میں اس کی ساری کوشش رائیگاں ثابت ہوئی۔

(۳)

پنڈت، اشنان کے بعد، گنگا جل میں پیر لٹکائے، پرماتما کی یاد میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے ایک ہیبت ناک گٹھڑی ان کی طرف بہتی چلی آ رہی تھی۔ صبح کے دھندلکے میں انھوں نے اسے اوّل اوّل تو

کچھ نظر انداز کر دیا لیکن جب وہ ان کے قریب پہنچی تو اللہ کے یہ پاک بندے کسی نامعلوم خوف سے دل ہی دل میں سہمے جا رہے تھے۔ بوڑھے ٹھاکر کی لاش، دریا کے تموج سے ان کے سروں پر پانی، اچھالتی ہوئی، کنارے تک آپہنچی۔ اس کے عریاں جسم پر خنجر اور چھری کے سیکڑوں نشان، کسی خوفناک سازش اور قاتلانہ حملہ کا پتہ دے رہے تھے۔

پولیس نے غریب کی موت کو واردات اتفاقی سے تعبیر کیا۔ لاش لاوارث قرار دی گئی اور سرکاری طور پر بوڑھے جے دیال کا کریا کرم ہو گیا۔

نوجوان، للتا، اب ہستنا پور کی مہارانی ہے، اور باقتضائے سن خوش و خرم ہے۔ مگر کبھی کبھی تنہائی میں اسے اپنے بوڑھے باپ کی موت کا بھی خیال آجاتا ہے۔

مرزا سرفراز علی بی۔ اے (عثمانیہ)



یادِ نشاط

یاد ابھی ہے دل میں تازہ، رونے پر آنکھیں آمادہ
غم کی بدلی خون میں بادہ، ہلکی باتیں دل افتادہ
ہوا چلی اور میں گرمایا

اپنا اُن کا عہد اُلفت، بے سمجھے بوجھے کی چاہت
چہرہ پہ سُرخی دل میں ہمت عیش کی مے اور لطفِ صحبت
کتنی جلدی پلٹی کھایا

ہاتھ میں کنگن زردی مائل، آنکھ میں ڈورے سُرخی مائل
باتیں دل کی گرمی مائل ہنسنے ہنسانے پر جی مائل
کس نے چھینی بیت کی مایا

باغ حسن کی وہ شادابی، گم گشتہ دل کی بیتابی رنگ گلابی ساری آبی، چھوٹ رہی گھر میں ماہتابی
آنکھ لڑی اور من لہرایا

وہ بھیگی برکھا کی راتیں، دبی ہنسی ادھوری باتیں شام سے سونے کی گھاتیں یوں ہی کٹ گئیں دو برساتیں
لیکن دل نے چین نہ پایا

من کی موج ہری ہریالی، سر پہ چھائی بدلی کالی لطف میں جھومے پریم کی ڈالی سامنے صورت بھولی بھالی
جس نے سارے جگ کو بھلایا

آج وہ گھر کا نور کہاں ہے، وہ چشم مخمور کہاں ہے وہ جنت کی حور کہاں ہے، اپنا اوج طور کہاں ہے
وہ جس نے دل کو تڑپایا

بے خود ہے یہ قلب مضطر، کاش نہ ہوتا حسن کا خوگر ٹوٹ گیا الفت کا ساغر خاک ہوئے سب طبع کے جوہر
ثمرہ یہ الفت کا پایا

پھول وہی کھلتے ہیں چمن میں ہوا وہی ٹھنڈی گلشن میں دنیا ساری اسی برن میں لیکن آگ لگی ہے من میں
کس شعلہ نے دل کو جلایا

زخم دل کا پپیہا گھائل، موج سمندر چاند پہ مائل رند اسی مے کا ہے سائل، مجھ میں تجھ میں دنیا حائل
دل پہ اندھیرا سا ہے چھایا

غنچوں میں آواز نہیں وہ، شاما کی آواز نہیں وہ راگ وہی ہے ساز نہیں وہ، ذہن کی اب پرواز نہیں وہ
غم نے تخیل کو جھلسایا

دل کی خوشی اب روح کا غم ہو اس پر جینا اور ستم ہو　　پیار محبت مثل سم ہے دل اپنا صرفِ ماتم ہے

روح کو فرقت نے پگھلایا

چھوٹ گئے تم رنج و تعب سے، اس دنیا کے شور و شغف سے　　خاموشی کی دُھن تھی کب سے، پاس ہو میرے دور ہو سب سے

جان گنوائی تب سکھ پایا

لٹ گئی میرے دل کی کمائی، شاق بہت ہی تیری جدائی　　کس سے سیکھی ایسی رکھائی اکس کی خاطر جان گنوائی

کیوں چُپ ہو کر مجھ کو رُلایا

زور پہ موجیں، بہتا دریا، لہروں میں اک دیا ہے جلتا　　نظر پڑ کرتی ہے کا پیچھا دل ہے اُسی دیئے میں اٹکا

عقل نے جس کا بھید نہ پایا

غم نے آنکھیں کھولیں میری، غم سے پائی من نے دلیری　　غم نے چھانٹی دل کی اندھیری، اور بڑھائی مورت تیری

غم کو میں نے امرت پایا

غم کے نقش نہ ہوں گر دل پر، چمکے کیسے کندن بن کر　　انسان رنج کا ہو کر خوگر، ذرے سے بنتا ہے خاور

غم ہے عظمت کا سرمایا

طیب بس یہ یاد بُری ہے، درد بھری فریاد بُری ہے　　دل پر یہ بیداد بُری ہے، جی کی یہ اُفتاد بُری ہے

کس نے کھویا کس نے پایا

ہیبت کی بجلی دل میں چھپالے، جس کو نہ پایا اب تک پالے　　موت نہ ہرگز پردہ ڈالے، ان کے بیچ جو ہیں دل والے

جس نے ڈھونڈا اُس نے پایا

غلام طیب بی۔ اے (عثمانیہ)

جنگ اور زہریلی گیس

عام طور پر کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے خدا نے اس کو "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَۃً" کا طغرائے امتیاز عطا کیا ہے۔ اس غیر معمولی شان امتیازی کے بموجب اگر اس نے خدا کی دیگر مخلوقات پر حاکمانہ اقتدار حاصل نہ کیا، حیوانوں اور معمولی جانوروں کی طرح صرف کھانے پینے کے اسباب مہیا کرنے پر اکتفا کیا تو اس کے اشرف و اعلیٰ ہونے کا مفہوم بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

انسانی ارتقا کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کا ابتدائی زمانہ غاروں، صحراؤں، اور جنگلوں میں بسر ہوا، عریانی اس کا لباس تھا، چند پرندوں کو اپنے بھدے آلات کے ذریعہ شکار کر لینا اس کی معاشی جد و جہد کا منتہیٰ تھا لیکن اس میں امتداد زمانہ کے ساتھ جب ایک حد تک تہذیب پھیلی تو اس کی زندگی میں تدریجی وسعت پیدا ہوتی گئی حتیٰ کہ آج اس کی زندگی کے کارناموں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا اس نے سمندر پاٹے، پہاڑ کاٹے، ریگستان روندے، برفستان کھوندے، جنگل میں منگل منائے، سمندر سے موتی رولے، زمین کے دفینے کھودے، کرۂ ارض کی طنابیں کھینچیں، آگ و پانی کے عمل سے دنیا کو مسخر کر لیا، چیزیں ایسی بنائیں کہ ان کا حد نہ حساب اور ہر ایک ایسی انوکھی کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور ابھی مجتنت ہو کر بیٹھنے کا نام نہیں لیتا بلکہ جس قدر اس کی استطاعت بڑھتی ہے تحقیق و تجسس کے جذبات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ سائنس کی شعبدہ بازیاں

کارفرما نہ ہوں اس لئے روزمرہ زندگی میں سائنس کی کارگزاریوں کو ایک ایک کرکے گنانا گویا آسمان کے تاروں کو گننا ہے۔

یوں تو انیسویں صدی کے آخر تک سائنس کی ترقی تدریجی رہی اور انسان سال بہ سال نئی نئی چیزوں سے واقف ہوتا گیا مگر بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی اسراعی رہی اور ان ۴۵ سال کی ایجادات واختراعات کو شمار کرنا کوئی آسان امر نہیں۔ بنابریں ہمارا زمانہ "زمانہ سائنس" کہلاتا ہے۔ ان ایجادات میں اکثر ایسی اشیا رہیں جو انسان کی زندگی کو خوش حال بناتی ہیں اور انسان روز بروز ان سے مستفید ہو رہا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ چند ایسی بھی اشیا رہیں جو انسان کی زندگی کے لئے باعث ہلاکت ہیں یعنی جہاں انسان نے سائنس سے مفید نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی اسی طرح اس کو بہتر اور مفید نتائج حاصل ہوئے اور برعکس اس کے سائنس کے غلط اور ناجائز استعمال سے وہ اپنے ہی بھائیوں کی ہلاکت کی اشیا تیار کرنے میں منہمک رہا اور کامیاب بھی ثابت ہوا انسان کی تخلیق کے ساتھ یہ متفقہ طور پر مسلمہ ہے کہ دنیا اور اس کے ان گنت عوالم، نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکے، اجرام فلکی، بساط آسمان پر آفتاب و ماہتاب، فرش زمین پر عالم نباتات کی نیرنگیاں، طبقات ارضی کے اندر قیمتی دھاتوں کے معدنیات، اونچے اونچے درخت بلند بلند پہاڑ، وسیع ترین سمندر، ارض وسما کے مابین یہ معلق فضا اور دوسری محسوس وغیر محسوس مخلوقات خدا نے بے کار پیدا نہیں کیں بلکہ ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ انسان جو ان سب پر اشرف ہے اپنی احتیاجات رفع کرے ان کے فوائد معلوم کرکے ان سے افادہ حاصل کرے نہ کہ نقصان۔ اگر انسان ان سے فائدہ حاصل کرلے تو ظاہر ہے کہ اس نے خدا کا منشا پورا کیا۔ ایک مشہور سائنسدان کا کہنا ہو کہ زندگی کے لئے سائنس ہو، نہ کہ زندگی، سائنس کے لئے۔ Science is for life, and not life for science. اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خوش سے خوش تر، اور اچھی سے بہتر بنانے کے لئے سائنس سے مدد لے نہ کہ ایسی اشیاء تیار کرے جو بعد میں اس ہی کی ہلاکت کا باعث ہوں ان ۴۵ سال میں انسان نے جنگ وجدل کے نئے نئے آلات بنائے اور قدیم زمانہ کی معیار جنگ کو جو جسمانی قوت تھی گیسی قوت میں مبدل کردیا۔ چند سال پیشتر جبکہ جنگ کے موقعوں پر تیر و بھالے استعمال کئے جاتے تھے، بعد میں مختلف بارود اور آتش گیر مادوں کا علم حاصل ہوا اور توپ و بندوق ایجاد ہوئے مگر غیر مطمئن انسان اسی شغل میں مصروف رہا اور آہستہ آہستہ بم اور زہریلی گیسیں ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا۔ چنانچہ ان ہی اشیا کی تیاری کے لئے اکثر ممالک میں بڑے بڑے کارخانے قایم ہیں جن میں سینکڑوں آدمی مصروف رہتے ہیں اب ہم اصل مضمون کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔ چونکہ زہریلی گیسیں زیادہ تر جنگ عظیم میں دریافت ہوئی ہیں اسی لئے اس مضمون کا بیشتر حصہ جنگ عظیم سے متعلق ہوگا۔

کئی گیسیں ایسی ہیں جو انسان کے بقاء زندگی کے لئے ممد و معاون ہیں چنانچہ آکسیجن ایک ایسی گیس ہے جس کا عدم وجود

جاندار شے کو چند منٹ تک زندہ رکھ نہیں سکتا۔ نیز نائٹروجن ایسی ہے کہ اگر یہ گیس اور اس سے تیار شدہ مرکبات پودوں کو نہ دستیاب ہوں تو کل کھیتی برباد ہو جائے اور انسان کو فاقوں مرنے کی نوبت آجائے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ایسی بھی گیسیں ہیں جو جاندار کی زندگی کے لئے زہر کا سا اثر رکھتی ہیں اور چشم زدن میں جاندار شے کو ہلاک کئے دیتی ہیں۔ مثلاً ہنسنگ گیس کے سونگھنے سے چند منٹ تک طبیعت پر فرحت رہتی ہے اور خواہ مخواہ کی ہنسی آنی شروع ہوتی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اور انسان ہنستے ہنستے ہی عالم بقا کو سدھارتا ہے۔ مگر یہ گیس اس قدر زہریلی نہیں ہے جیسی کہ اور بہت سی گیسیں ہیں۔

زہریلی گیسوں کا علم جنگ عظیم سے پہلے کسی کو نہ تھا اور جنگ عظیم سے پہلے کوئی ایسی جنگ ایجاد نہ ہوئی تھی جس میں گیس بطور آلۂ جنگ استعمال کی گئی ہو۔ جرمن قوم نے اپنی جدت طبع سے جنگ عظیم میں ان کے متعلق بہت جلد معلومات حاصل کرلیں۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں زہریلی گیسوں کی تیاری شروع کردی گئی اور اپریل ۱۹۱۵ء میں جرمنوں نے زہریلی گیس کو استعمال کیا سب سے پہلی گیس جو انھوں نے تیار کی اس کا نام کلورین ہے۔ انھوں نے اپریل ۱۹۱۵ء میں گیس مذکور کو اسطوانوں میں بھر کر فرانسیسی پر جوان کے مقابل تھے پھینکا۔ فرانسیسی اس گیس سے بالکل ناواقف تھے اس لئے وہ بہت پریشان ہوئے اور ساری فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اگر جرمن اسی طریقہ کو جاری رکھتے تو بہت جلد ان کو کامیابی حاصل ہو جاتی مگر چونکہ گیس کا استعمال بالکل نیا اور عجیب تھا اس لئے وہ مزید استعمال سے گھبرائے۔ جرمن کے مقابل کی متحدہ فوج یعنی (الائز) نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس وقفہ میں گیس مذکور کے متعلق معلومات فراہم کرلیں اور خود بھی اسی گیس کو استعمال کرنا شروع کردیا اور فوج میں اس سے بچاؤ کا انتظام بھی کردیا گیا جب جرمنوں نے دیکھا کہ ان کی گیس کی پیدائش کا حال ان کے مخالفین کو معلوم ہو گیا ہے تو وہ ایک نئی گیس کی اختراع میں مصروف ہو گئے۔ نیز جرمنوں نے محسوس کیا کہ کلورین گیس کا استعمال زیادہ موزوں ہے کیونکہ ان کو ہوا کے جھونکوں پر بھروسہ کئے رہنا پڑتا تھا چنانچہ ہوا جس سمت کی ہوتی اسی سمت میں وہ گیس پھیل سکتی تھی لہذا اس بات کا بھی امکان تھا کہ الٹے انھیں کے آدمیوں پر گیس حملہ کردے۔ اس لئے جرمنوں نے اپنے ملک سے کیمیا داں فراہم کئے اور ان کو نئی گیس کی ایجاد میں لگا دیا۔ چند ہی دنوں میں ان کیمیا دانوں نے ایک زہریلی گیس کی پیدائش کا حال معلوم کرلیا جس کا نام فاسجین ہے۔

ان کیمیا دانوں نے اپنی فوج کو اس کے معلومات بہم پہونچائے نیز اس گیس سے محفوظ رہنے کے طریقے و تدابیر بھی تبلادیئے مگر اتفاق سے اس کلچر میں مخالفین کے خفیہ لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے اپنی فوج کو اس گیس کا علم کرایا اور کل کلچر اپنی فوج کے سامنے دہرادیا انھوں نے اس قسم کی گیس تیار کرلی اور اس کے لئے گیس روک نقاب بھی فراہم کرلئے گئے۔ جب جرمنوں نے اس گیس کو استعمال کیا تو

دشمنوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ سب سے پہلا گیسی حملہ جو کہ برطانیہ نے جنگ عظیم میں کیا وہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ چونکہ جرمنوں کو اپنی ہی پیدا کردہ گیسوں میں ناکامی ہوئی اس لئے اُنھوں نے دوسری گیس تیار کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ساتھ ہی ساتھ فرانسیسی بھی اسی خیال میں منہمک رہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسے (Shell) شل تیار کئے جس میں فاسجین گیس بھری جاتی تھی اور اس کے ساتھ چند آتشگیر مادے بھی رکھ دیئے جاتے تھے تاکہ دشمن پر ان شلوں کو پھینکنے سے معمولی سے تصادم پر آتشگیر مادوں کی وجہ سے شل پھوٹ پڑے اور فاسجین گیس ان پر نکل پڑے۔ اوّل الذکر گیس یعنی کلورین گیس شکل کی ہے مگر فاسجین مائع ہے۔ اس طریقہ سے فرانسیسیوں کو ۱۹۱۶ء میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی مگر جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ جرمن سائنس سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں اُنھوں نے چند ہی دنوں میں اس سے بہتر ذرائع حاصل کرلئے۔ ۱۹۱۷ء میں ہر قوم نے اپنی اپنی معلومات کی بنا پر شل تیار کئے جرمنو کے تیار کردہ شلوں میں ٹرائی کلورو میتھیل فارمیٹ، کلورو پکرین اور چند آتشگیر مادے ہوتے تھے، فرانسیسیوں نے اپنے شلوں میں فاسجین اور پرشک ترشہ استعمال کیا، اور برطانیہ کے شلوں میں کلورو پکرین اور چند آتشگیر مادے موجود ہوتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں جرمنوں نے دو نئی گیسیں معلوم کیں۔ اُنھوں نے اس گیس کے لئے دو چیزوں کے خواص کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے ایک تو ڈائی کلورو ایتھیل سلفائڈ جو عام طور پر مسٹرڈ گیس (Mustard gas) کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے کا نام ڈائی فینیل کلورو آرسین ہے۔ مسٹرڈ گیس ہی وہ شے ہے جو جنگ عظیم میں کئی ایک اشخاص کی جان لینے کی تنہا ذمہ دار ہے۔

اوّل الذکر گیسوں یعنی کلورین اور فاسجین کو سپاہی ان کی تیز بو کی وجہ سے معلوم کرسکتے تھے اس سے فائدہ یہ تھا کہ سپاہیوں کو ہر وقت نقاب لگائے رکھنا نہ ہوتا تھا بلکہ جب وہ کسی گیس کی بو محسوس کرتے، نقاب لگالیا کرتے تھے ورنہ آزادی سے نقل و حرکت کرتے، کیونکہ نقاب باندھنے سے سپاہی کی نقل و حرکت، گفت و شنید اور کھانے پینے میں کافی دقت ہوتی ہے مگر مسٹرڈ گیس میں یہ خصوصیت تھی کہ اس میں تیز بو مطلق نہ تھی۔ یہ اپنے زہریلے عمل سے انسان کو کام کرنے سے معذور بنا دیتی ہے۔ یہ گیس انسان کی آنکھوں اور پھیپھڑوں پر اپنا عمل کرتی ہے اگر زمین میں نمی ہو تو اس کا اثر کئی دنوں بلکہ ہفتوں تک رہ سکتا ہے اور جب تک اس کا اثر زمین پر رہتا ہے اسی طرح کا زہریلا اثر رکھتی ہے اور اگر اس قطعہ زمین کی آب و ہوا اتفاق سے گرم ہو تو اس کا عمل اور بھی تیز ہو جاتا ہے یہ گیس انسان کے آنکھ اور پھیپھڑوں پر عمل کرنے کے علاوہ جلد پر آبلے لے آتی ہے جو بہت ہی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ڈائی فینیل کلورو آرسین ایک ٹھوس مادہ ہے جو اگر ہوا میں مناسب اجزا میں ملا ہو تو چھینکیں آتی ہیں اور حلق اور ناک میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شلوں میں اس مادہ سے بھری ہوئی شیشیاں رکھ دی جاتی ہیں اور جب شل پھوٹ

پڑتے ہیں تو یہ مادہ باریک سفوف کی شکل میں نکل پڑتا ہے۔ جب تک کہ اس کے بچاؤ کے لئے نقاب نہ استعمال ہوں اس مادہ کا باریک سے باریک ذرہ بھی وہی زہریلا عمل کرتا ہے۔

جب جرمنوں نے دیکھا کہ اپنی مخالف فوج کو فاسجین گیس کا علم ہو گیا ہے اور اس کے بچاؤ کے لئے وہ نقاب استعمال کرنے لگے ہیں تو انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ سپاہیوں کو کسی طرح سے مجبور کر دیا جائے کہ وہ نقاب نکال کر پھینک دیں تاکہ زہریلی گیس کا عمل ہو سکے۔ چنانچہ کئی دن کی کوشش کے بعد ڈائی فینل کلورو آرسین مادہ کے خواص کا مطالعہ کر کے جنگ میں استعمال کیا گیا۔ اس مادہ کے استعمال سے سپاہی اپنے نقاب نکال دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اس سے چھینکیں آتی ہیں اور حلق اور ناک میں جلن محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسٹرڈ گیس یا فاسجین گیس کا عمل کر کے سپاہیوں کو جنگ سے ناکارہ کر دیا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ ہلاک ہو جاتے ہیں کیونکہ فاسجین گیس کو سونگھتے ہی ہلاکت واقع ہوتی ہے اور مسٹرڈ گیس کو سونگھنے سے آبلے وغیرہ آ جاتے ہیں۔

گیس کا استعمال آج کل بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے استعمال سے سپاہیوں کو کافی دقت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس سے بچنے کے لئے گیس روک نقاب استعمال کرنا پڑتا ہے جو اچھے خاصے وزنی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سپاہی کی فوجی استعداد کمتر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے استعمال سے اس کی سماعت و بصارت پر اثر پڑتا ہے اور اس کو بات چیت کرنے میں کافی دشواری ہوتی ہے نیز نقاب لگائے ہوئے کچھ کھا پی نہیں سکتے۔ جنگ عظیم میں برطانیہ کے ۱۶ فی صدی اور امریکہ کے ۳۴ فی صدی وفات صرف اسی گیس کے استعمال سے واقع ہوئے ہیں۔

زہریلی اشیاء کے کئی اقسام ہیں :-

(۱) ایسی گیسیں جو زیادہ عامل ہوتی ہیں جو پھیپھڑوں پر فوراً اثر کرتی ہیں مثلاً کلورین اور فاسجین۔

(۲) ایسی گیسیں جو آنکھ، ناک، اور تنفس کے اندرونی نظام پر عمل کرتی ہیں مثلاً ڈائی فینل کلورو آرسین۔ اس کے عمل سے مسلسل چھینکیں آتی ہیں، آنکھوں میں کافی تکلیف محسوس ہوتی ہے ناک میں جلن اور حلق میں خراش پیدا ہوتی ہے۔

(۳) ایسی شے جو اپنے عمل سے انسان کو اندھا بنا دیتی ہے اور آنکھوں میں ناقابل برداشت تکلیف محسوس ہوتی ہے مثلاً زائلل برومائڈ۔

(۴) ایسی اشیاء جو انسان کو فوراً ہی ہلاک کر دیتی ہیں مثلاً پرشک ترشہ اور ہائڈروسیانک ترشہ۔

(۵) دسی کیٹس مثلاً مسٹرڈ گیس جس کے زہریلے اثر سے جسم پر آبلے آجاتے ہیں اور آنکھیں بے کار ہو جاتی ہیں کیونکہ آنکھوں سے مسلسل اشک باری شروع ہو جاتی ہے اور سپاہی جنگ کے لئے ناکارہ ہو جاتا ہے۔

نیچے دیئے ہوئے خاکہ کے پہلے خانہ میں گیسوں کے نام تبلائے گئے ہیں، دوسرے خانہ میں ہوا میں ان گیسوں کا تناسب اس قدر ہو جائے تو گیس اپنا مہلک (زہریلا اثر) دو منٹ میں پیدا کرتی ہے اور آخری خانہ میں ان قوموں کے نام تبلائے گئے ہیں جنھوں نے جنگ عظیم میں گیس مذکور کو استعمال کیا۔

سلسلہ	نام شے	ہوا میں تناسب	تاریخ انکشاف	نام قوم
۱	کلورین	۱ : ۱۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۵ء	برطانوی ، فرانسیسی ، جرمن
۲	فاسجین	۱ : ۱۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۵ء	″ ″ ″
۳	ٹرائی کلورومیتھل کلوروفارمیٹ	۱ : ۲۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۶ء	فرانسیسی ، جرمن
۴	کلوروپکرین	۱ : ۲۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۵ء	برطانوی ، فرانسیسی ، جرمن
۵	زائکل برومائڈ	۱ : ۲،۰۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۵ء	جرمن
۶	ہائڈروسیانک ترشہ	۱ : ۲۰۰۰	سنہ ۱۹۱۶ء	برطانوی ، فرانسیسی
۷	ڈائی فینل کلوروآرسین	۱ : ۱۰،۰۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۷ء	جرمن
۸	ڈائی فینل سائن آرسین	۱ : ۱۰،۰۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۸ء	جرمن
۹	مسٹرڈ گیس	۱ : ۱،۰۰۰،۰۰۰	سنہ ۱۹۱۷ء	برطانوی ، فرانسیسی ، جرمن

کلورین کی مثال پر غور کیجئے۔ خاکہ سے معلوم ہوگا کہ اگر ہوا کے دس ہزار حصوں میں اس گیس کا ایک حصہ ہو تو زہریلا اثر ہوتا ہے اس سے بچنے کے لئے ہر قوم اپنی اپنی سہولت کے مدنظر کئی قسم کے نقاب استعمال کرتی ہے مگر سب کا عمل ایک ہی ہے کہ انسان زہریلی ہوا کے بجائے اچھی اور پاک و صاف ہوا کی سانس لے سکے۔ اس کے لئے ہوتا یہ ہے کہ زہریلی گیس نقاب سے ہوتی ہوئی صاف ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے ایک چھوٹے سے ڈبہ میں سوڈیم تھیوسلفیٹ اور سوڈیم کاربونیٹ کے محلول

میں ڈوبی ہوئی روئی رکھی ہوتی ہے جو منہ پر بندھا ہوتا ہے اس قسم کا نقاب سب سے پہلے بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایسے نقاب بنائے گئے جو سر پر چڑھا دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے آنکھوں اور پھیپڑوں کی بخوبی حفاظت ہوتی ہے۔ آجکل ڈبہ میں چار کول استعمال ہوتا ہے اور ناک کو کلپ (clip) کر دیا جاتا ہے جس سے انسان ناک سے سانس نہیں لے سکتا بلکہ منہ سے ہی سانس لینے اور چھوڑنے کا کام لیتا ہے اور منہ کا تعلق نقاب کی ایک نلی کے ذریعہ ہوتا ہے اور نقاب سر پر بندھا ہوتا ہے جس سے آنکھ کی بھی حفاظت ہو سکتی ہے۔ نیز ایسی گیس روک نقاب میں کمال یہ ہے کہ اس میں آئینوں کا بھی استعمال کیا گیا ہے جس سے سپاہی اچھی طرح دیکھ بھی سکتا ہے۔

آج کل گیس کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ معمولی سے معمولی فساد میں گیس استعمال کی جاتی ہے اگر فساد برپا ہو جائے اور مجمع منتشر نہ ہو سکے تو لاٹھی چارج وغیرہ کا عمل نہیں ہوتا بلکہ ایسی گیس استعمال کی جاتی ہے جس سے انسان کو مسلسل چھینکیں آتی ہیں اور آنکھوں میں تکلیف ہوتی ہے۔ آنسو بہنے لگتے ہیں جس سے لوگ پریشان ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں ان گیسوں میں سے بعض گیسوں کا یہی عمل ہوتا ہے کہ انسان کو ہلاک کرنے کے بجائے اس کو جنگ سے ناکارہ کر دیا جائے نیز بعض ایسی بھی گیسیں ہیں جو انسان کی ہلاکت کا فوراً باعث ہوتی ہیں دوسری گیسیں ایسی ہیں جو انسان کو فوراً ہلاک نہیں کرتیں بلکہ اس سے ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے اور انسان تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے یہ عمل اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ بہادر سے بہادر سپاہی بھی اس کی تاب نہیں لا سکتا اور فوراً ہی دوسرے سپاہیوں کو اس تکلیف میں مبتلا دیکھ کر میدان چھوڑ دیتا ہے بعض سپاہیوں نے یہ بھی کیا ہے کہ اس تکلیف اور مسلسل اشک باری و چھینکوں سے تنگ آکر اور تکلیف کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ گذشتہ جنگ حبش و اطالیہ میں مسٹرڈ گیس کا استعمال کیا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اطالیہ کو بہت جلد فتح نصیب ہوئی اور حبشی جیسے بہادر وجانثار و دلیر سپاہیوں نے بہت جلد میدان چھوڑ دیا۔ کیونکہ حبشیوں کے ہاں گیس روک نقاب مطلق نہ تھے۔

کسی جنگ میں گیس کے استعمال کے بعد اس ملک میں خصوصاً اور اطراف و اکناف کے ممالک میں عموماً طرح طرح کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں تک اس کے مضر اثرات پیدا ہو گئے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ گذشتہ جنگ حبشہ میں گیس کے استعمال سے حجاز وغیرہ میں ایک نئے قسم کا مرض نمودار ہوا تھا۔ مرض کے حملہ کا اولین اثر دماغ پر ہوتا تھا۔ مریض کے ہوش و حواس فوراً غائب ہو جاتے تھے اس کے بعد وہ دیوانہ بن جاتا اور کچھ دیر بعد زندگی کی آخری سانس لیتا۔

یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہوگا کہ آئندہ جنگوں میں بجائے تلواروں، بندوقوں اور توپوں کے گیس استعمال کی جائے گی

محمد خادم حسین قریشی بی۔ایس سی (عثمانیہ)

مغربی تصانیف کے اُردو ترجمے

۱۹۱۷ء کے بعد

دارالمصنفین اعظم گڑھ دارالمصنفین کی توجہ زیادہ تر مشرقی علوم وفنون اور مذہبی مسائل کی طرف رہی لیکن اس نے مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات مثلاً برکلے اور موسیو لیبان کی بعض اعلیٰ قسم کی تصانیف کے ترجمے بھی شائع کئے ہیں مغربی تصانیف کی ترجمانی بڑی حد تک جدید تعلیم یافتہ افراد کے لئے مخصوص ہوگئی ہے لیکن چونکہ مصر میں اس قسم کی بعض کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے ہیں اس لئے انگریزی سے ناواقف عربی داں اصحاب نے عربی کے توسط سے بعض عمدہ اور مفید کتابیں اُردو میں منتقل کی ہیں اس مرکز کے ترجموں کی زبان بڑی حد تک عربی آمیز ہے۔ جو ترجمے اس وقت تک شائع ہوئے ہیں ان میں روح الاجتماع انقلاب الامم مبادی علم انسانی مکالمات برکلے پیام امن فطرت نسوانی اور افکار عصریہ قابل ذکر ہیں۔

روح الاجتماع:۔ مشہور فرانسیسی عالم موسیو لیبان کی تصنیف۔ مترجمہ محمد یونس فرنگی محلی۔

انقلاب الامم:۔ موسیو لیبان کی کتاب "سائیکالوجی آف دی ایولیوشن آف پیوپلز" کے عربی ترجمہ "سر تطور الامم" کا اُردو ترجمہ از مولوی عبدالسلام ندوی۔

مبادی علم انسانی:۔ برکلے کی معرکۃ الآرا کتاب "پرنسپلز آف ہیومن نالج"۔ مترجمہ مولوی عبدالباری ندوی۔

مکالمات برکلے :- برکلے کی ڈائلاگز، مترجمہ مولوی عبدالماجد دریابادی بی-اے
پیام امن :- موسیو رچرڈ پالال فرانسیسی تصنیف کا ترجمہ۔
فطرت نسوانی :- مشہور فرانسیسی مصنف پروفیسر مارٹن کی کتاب کے عربی ترجمے سے مولوی عبدالسلام ندوی نے تلخیص کی ہے
افکار عصریہ :- چارلس آر گبس کی کتاب مترجمہ محمد نصیر احمد عثمانی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

ہندوستانی اکیڈمی اور اُردو اکیڈمی

ہندوستانی اکیڈمی اُردو اور ہندی ادب کو ترقی دینے کی غرض سے صوبجات متحدہ کی حکومت نے ۱۹۲۷ء میں "ہندستانی اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ الہ آباد میں قایم کیا۔ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ اُردو اور ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندستانی جاموں اور ادبی انجمنوں یا دوسرے مستحق اور قابل اشخاص و ادارات کو مالی امداد دی جائے۔

اس ادارہ کے انتظامات ایک کونسل اور ایک مجلس عاملہ (اگزیکیوٹیو کمیٹی) کے سپرد ہیں۔ اصل اختیارات رفقار کے ہاتھ میں ہیں جن کا انتخاب کونسل کے اراکین کرتے ہیں۔ سرتیج بہادر سپرو اکیڈمی کے صدر اور ڈاکٹر تاراچند پی۔ایچ۔ڈی معتمد ہیں۔ اس کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ اکیڈمی کے تماہی رسالہ "ہندستانی" میں اعلیٰ پایہ کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کی ادارت بعض فاضل اصحاب کے سپرد کی گئی ہے جن میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ) صدر شعبہ مشرقی جامعہ الہ آباد قابل ذکر ہیں۔

اکیڈمی کے اراکین کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ اس نے اس وقت تک حسب ذیل دو ڈراموں کے اُردو ترجمے شائع کرائے ہیں۔

ناتن :- مشہور جرمن ڈرامہ نویس لیسنگ کی تصنیف "ناتن دروازے"، کا ترجمہ اصل جرمن سے منشی فاضل محمد نعیم الرحمٰن نے کیا۔ اصل ڈرامہ کی لطافت اور جاذبیت کو اُردو میں منتقل کرنے میں مترجم کو جیسی چاہئے کامیابی نہیں ہوئی۔

فریب عمل :- انگلستان کے مشہور ڈرامہ نگار جان گالزوردی کی تصنیف۔ مترجمہ منشی جگ موہن لال رواں ایم۔اے ایل۔ایل بی۔

اُردو اکیڈمی اُردو اکیڈمی کا مقصد جامعہ ملیہ کے سپوتوں کے علمی کارناموں کی اشاعت ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے بعض اچھے ترجمے شائع ہوئے ہیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

تاریخ فلسفہ اسلام۔ آزادی۔ تاریخ مغربی یورپ۔ عربوں کا تمدن۔ سیرۃ نبوی اور مستشرقین۔ مبادی معاشیات۔ نفسیات شباب

تاریخ فلسفہ اسلام ۔ جرمن مستشرق ٹی جی بوئر کی مشہور تصنیف۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

آزادی ۔ جان اسٹوارٹ مل کی کتاب "لبرٹی" کا ترجمہ از سعید انصاری بی۔ اے۔

تاریخ مغربی یورپ ۔ ڈاکٹر رابین کی کتاب "ہسٹری آف ویسٹرن یورپ" کا اُردو ترجمہ از نذیر نیازی بی۔ اے۔

عربوں کا تمدن ۔ مشہور مستشرق جوزف ہیل کی کتاب مترجمہ نذیر نیازی بی۔ اے۔

سیرۃ نبوی اور مستشرقین ۔ جرمن مستشرق ولہاوزن کے اس مضمون کا ترجمہ ہے جو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے نویں ایڈیشن میں شائع ہوا ہے۔ از عبدالعلیم احراری بی۔ اے (مترجم نے متن میں اپنی طرف سے کچھ اضافے کئے ہیں)

مبادی معاشیات ۔ اسٹدون کتبین کی مشہور تصنیف۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔

نفسیات شباب ۔ جامعہ برلن کے پروفیسر ایڈورڈ اشپرنگر کی ایک تصنیف۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ترجمہ اصل جرمن سے کیا گیا ہے۔

میری داستان حیات ۔ امریکن فاضلہ ہلن کیلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ۔

انفرادی کوششیں

عہد حاضر میں علمی اور حکمی تصانیف اجتماعی کوششوں سے اُردو میں منتقل ہو رہی ہیں۔ انفرادی کوششیں بڑی حد تک ادب کی مختلف اصناف مثلاً افسانوں ناولوں ڈراموں اور نظموں تک محدود رہی ہیں۔ مستند اور ذمہ دار ترجمے بہت کم شائع ہوئے ہیں آزاد اور ناقص قسم کے ترجموں کا رواج کثرت سے ہو گیا ہے۔ ماخذوں کا پتہ عموماً نہیں تبلایا جاتا۔ فی زمانہ اُردو داں حضرات اپنی انشاپردازی عام طور پر انگریزی مضامین اور افسانوں کے ترجموں سے شروع کرتے ہیں۔ رسائل کی مقبولیت کی وجہ سے مغربی افسانوں کے ترجموں کا رواج روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ مترجمین کی اکثریت کو انگریزی اور اُردو زبان پر کافی عبور حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ ترجمے بالعموم ناقص ہوتے ہیں اور ان میں جگہ جگہ زبان طرز بیان اور ترجمہ کی ایسی لغزشیں نظر

آتی ہیں جو بعض اوقات نہایت تمسخر انگیز ہو جاتی ہیں۔ مستند، معیاری اور اعلیٰ پایہ کے تراجم بھی شائع ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد عام ترجموں کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

مغربی افسانہ نویسوں میں موپاساں، چیخوف، ٹرگنیف اور ٹالسٹائے کے کارناموں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے ان کے اور متعدد دوسرے مغربی افسانہ نگاروں کے ترجمے رسائل میں آئے دن بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ دور میں عام اُردو دانوں میں شیکسپیر کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے اس کے علاوہ ایچ جی ویلز، سر آرتھر کانن ڈائل، الکزنڈر ڈیوما، ای فلپس آپنہیم، ایڈگر والس، رابرٹ ہچنز، لارڈ فریڈرک ہیملٹن، فریمن ولز کرافٹس، جارج اے برمنگھم، ویلنٹائن ولیمز، رجرڈ ہنری سیویج، چارلس میک اوائے، ارنسٹ ڈیویز، میری، رابرٹس رینہارٹ، مارس لیلانک سکس رومر اور فیلچر کے اکثر ناول اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں ان مطبوعات کو اُردو ادب میں کوئی نمایاں جگہ نہیں دی جا سکتی یہ زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے بہت ناقص ہیں اور صرف تجارتی اغراض کے تحت ترجمہ کی گئی ہیں۔ مغربی ڈرامہ نگاروں میں مولیر، شریڈن، گولڈسمتھ، آسکر وائلڈ، ابسن، گالزوردی اور برنرڈ شا کو اُردو دنیا میں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے ان کے بعض کارناموں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

۱۹۱۷ء سے اس وقت تک جو ترجمے انفرادی طور پر مختلف افراد نے شائع کئے اس میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

افسانے بے شمار مغربی افسانے مختلف اُردو رسائل میں شائع ہوئے ہیں جو افسانے مجموعے کی شکل میں علیحدہ چھپے ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

ناول:۔

فسانۂ لندن (سلسلہ اوّل)	رینالڈز کا ناول "مسٹریز آف لندن"	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری (۱۷ جلدوں میں)
فسانۂ لندن (سلسلہ ثانی)	مسٹریز آف لندن کا دوسرا حصہ	ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری (۲۵ جلدوں میں)
نظارۂ پرستان	رینالڈز کا ایک مشہور ناول	(مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن ترجمہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری (۲۵ جلدوں میں)
گردش آفاق	رینالڈز کا ناول "جوزف ولمٹ"	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری
باپ کا قاتل	رینالڈز کا ناول "پیری سائڈ"	مترجمہ شمیم الدین بلہوری
خونی تلوار	رینالڈز کا ناول "بیگر آف گلنگو"	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری

شام جوانی	رینالڈز کا ناول "دی ینگ ڈچز"	مترجمہ نوبت رائے نظر لکھنوی
جمیل کی معشوقہ	رینالڈز کا ناول "مشرمن"	مترجمہ لالہ دینا ناتھ
وطن پرست	الکزنڈر ڈیوما کا ناول "رینجلس ڈاکٹر"	مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری
روحوں کا خراج	لارڈ فریڈرک ہملٹن کا ناول "دی ٹربیوٹ آف سولز"	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری
سنہری لاش	فریمن ولز کرافٹس کا ناول "دی کاسک"	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری
آزادی	جارج اے برمنگھم کا ناول "دی لاسٹ لائر"	مترجمہ تیرتھ رام
خنجر بیداد	ویلنٹائن ولیمز کا ایک مشہور ناول	مترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری
چڑیا کی تکی	ویلنٹائن ولیمز کا ناول "دی تھری آف کلبس"	تیرتھ رام
ناوک کٹار	رچرڈ سیوریج کا ناول "مائی آفیشل وائف"	مترجمہ تیرتھ
ہیروں کا بادشاہ	جیکس فیوٹرل کا ناول "دی ڈائمنڈ ماسٹر"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
حور ظلمات	آپنہیم کا ایک ناول	مترجمہ منشی تیرتھ رام
کرنی کا پھل	آپنہیم کا ناول "دی پیرالیسٹڈ دی دومن"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
مطلبی دنیا	چارلس میک اولے کا ناول "براس فلیسنز"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
نولکھا ہار	ارنسٹ ڈیویز کا ناول "دی وڈ وز کلبس"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
خونی چکر	میری رابرٹس رینہارٹ کا ناول "دی سرکولر سٹیرکیس"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
انصاف	ایڈگر والس کا ناول "دی فور جسٹ مین"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
آتشی کتا	کانن ڈوائل کا ناول "دی ہاونڈ آف دی باسکرویلز"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
خونی ہیرا	مارس لیبلانک کا ناول "دی ارسٹ آرسن لوپن"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
شریف بدمعاش	کنفیشنز آف آرسن لوپن"	مترجمہ منشی تیرتھ رام
خونی چراغ	"جیوئش لیمپ" مصنفہ مارس لیبلانک	مترجمہ منشی تیرتھ رام
کارنامہ جات آرسن لوپن	دی اکسپلائٹز آف آرسن لوپن	مترجمہ منشی تیرتھ رام

بحر فنا	دی کاف ان آئیلینڈ، مصنفہ مارس لیبلانک	مترجمہ منشی تیرتھ رام
آرسن لوپن جاسوس	بارنٹ اینڈ ویبز	مترجمہ منشی تیرتھ رام
نقلی نواب	آرسن لوپن	مترجمہ منشی تیرتھ رام
منزل مقصود	ولیم لکیو کا ناول " ہنڈاپ "	مترجمہ تیرتھ رام
سراب زندگی	لکیو کا ناول " وائلز آف دی وکڈ	مترجمہ تیرتھ رام
گمنام مسافر	دی سائن آف دی اسٹرینجر	مترجمہ تیرتھ رام فیروزپوری
تبدیل قسمت	دی مین فرام ڈاوننگ اسٹریٹ	مترجمہ تیرتھ رام فیروزپوری
مہر خموش	دی سائن آف سائلنس "	مترجمہ تیرتھ رام فیروزپوری

منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے مندرجہ بالا ناولوں کے علاوہ " اے بڈ فار چون " کا ترجمہ ڈاکٹر نکولا کے عنوان سے " ڈاکٹر نکولا " کا ترجمہ تلاش اکسیر کے عنوان سے اور " مالی اسٹرینجسٹ کیس " ، " فاروس دی اجپشن " ، " دی گولڈن اسکاربین " ، " دی ملین ڈالرڈائمنڈ " ، " دی ڈائمنڈ مین " ، " دی ریشم فارلنڈن " اور " دی آرنج یلو ڈائمنڈ " کے ترجمے علی الترتیب لعل شب چراغ ۔ مصری جادوگر ۔ سنہری بچھو ۔ انمول ہیرا ۔ قاتل ہار ۔ زہری بان ۔ اور پیلا ہیرا کے نام سے لئے ہیں ۔

سرگزشت اسیر	لاسٹ ڈیز آف اے کنڈمڈ مین مصنفہ وکٹر ہیوگیو	مترجمہ سعادت حسن
تائیس	مشہور فرانسیسی ناول " تائیس " مصنفہ اناطول فرانس	مترجمہ عنایت اللہ صاحب (اچھا ترجمہ ہے)
مصنوعی بیوی	آر ۔ ایچ پول کا ناول " ہز میک بلیو وائف "	مترجمہ عباس حسین لطفی (عثمانیہ)
زلفی	کپلنگ کی " جنگل بک "	مترجمہ عنایت اللہ صاحب
محب وطن	جرمن ناولسٹ الفرڈ نیومن کا ناول	مترجمہ خواجہ عبدالکریم ایم ۔ اے
مجلس ہفت ملوک	ایک انگریزی ناول	مترجمہ غلام مصطفے رضا حیدرآبادی
حکایات شرلک ہومز	شرلک ہومز کا پہلا کارنامہ اور یادگار شرلک ہومز	مترجمہ فیروزالدین مراد
درس عشق	ایک انگریزی ناول	مترجمہ مرزا خان دہلوی
الماس یعنی ہیرے کا بادشاہ	ایک انگریزی ناول	مترجمہ غلام حسین پشاوری

خونابۂ عشق　　کانن ڈائل کا ایک ناول　　مترجمہ فیروزالدین مراد
شہید جفا　　سر والٹر اسکاٹ کے ایک ناول کا ترجمہ
گمنام　　ایک انگریزی ناول　　مترجمہ دوارکا پرشاد افق

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ راجہ کا ہیرا۔ قصر ساحل۔ شاہد طرار۔ ایک فرانسیسی ناول۔ طلسم خیالات۔ فسانہ مفقود الخبر۔ کرشمۂ تقدیر۔ گناہ بے لذت اور لال کپتان۔ جیسے متعدد ناول شائع ہوئے۔

افسانے:۔

منتخب افسانے　　مختلف انگریزی فرانسیسی اور روسی فسانوں کے ترجمے بھی شامل ہیں (۷) جلدوں میں
دنیا کے بہترین افسانے　　بعض مغربی افسانوں کے ترجمے۔
شاہکار افسانے　　دلچسپ اور منتخب افسانے جن میں بعض فرانسیسی روسی اور انگریزی افسانے بھی شامل ہیں۔
قدیم افسانے　　بعض مغربی افسانے بھی شامل ہیں　　مترجمہ پروفیسر عبدالقادر سروری
فرانسیسی افسانے　　ماپسان زولا اور وکٹر ہیوگو　　مترجمہ عزیز احمد بی۔ اے۔
انگریزی افسانے　　بعض منتخب انگریزی افسانوں کے ترجمے　　از غلام عباس
مجسمۂ وفا　　مشہور انگریزی ادیب جان سکن کا ایک قصہ　　مترجمہ سید شوکت حسین
الحمرا کے افسانے　　بعض انگریزی افسانوں کے ترجمے
نگارستان　　واشنگٹن اردن کے بعض افسانوں کے آزاد ترجمے بھی شامل ہیں۔ از نیاز فتحپوری

ڈرامے:۔

ہنری چہارم　　شکسپیر کا ڈرامہ ہنری دی فورتھ،　　مترجمہ سید وقار احمد
غلط در غلط　　گولڈ سمتھ کے ڈرامہ شی اسٹوپس ٹو کنکر کا آزاد ترجمہ از عصمت اللہ بیگ
نکاح بالجبر　　مولیر کا ڈرامہ "فورسڈ میرج"　　مترجمہ وہاج الدین بی اے بی ٹی
ظاہر باطن　　شریڈن کے "اسکول فار اسکانڈل" کا آزاد ترجمہ از فضل الرحمٰن بی۔ اے آنرز
نئی روشنی　　شریڈن کے ڈرامہ رایولز" کا آزاد ترجمہ　　از فضل الرحمٰن بی۔ اے آنرز

حشرات الارض   ابسن کے ڈرامہ "دی ایمی آف دی پیپل" کا آزاد ترجمہ از فضل الرحمٰن بی۔ اے آنرز

زندگی   سامرسٹ موم کے ایک ڈرامہ کا آزاد ترجمہ   محمد اکبر وفا قانی بی۔ اے

ہوش کے ناخن   برنرڈ شا کے ڈرامہ "وڈوورس ہوزس" کا آزاد ترجمہ از میر حسن و مخدوم محی الدین

تین ٹوپیاں   دورِ جدید کے ایک فرانسیسی مزاحیہ ڈرامہ کا عکس

روحِ سیاست   جان ڈرنک واٹر کے مشہور ڈرامہ کی آزاد ترجمانی از نور الٰہی محمد عمر

شبِ تار   ماٹرلنک کا ایک ڈرامہ   مترجمہ منشی پریم چند

تسخیر   شی "اسٹوپس ٹو کانکر" کا ترجمہ

بگڑے دل   مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کا "سانتھروپ"   مترجمہ نور الٰہی

ظفر کی موت   بلجیم کے مشہور ڈرامہ نویس میٹرلنک کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ از نور الٰہی محمد عمر

قزاق   جرمن ڈرامہ نگار شلر کا ڈرامہ ہندوستانی رنگ میں از نور الٰہی محمد عمر

سالومی   اسکار وائلڈ کا ڈرامہ "سالومی"   مترجمہ مجنوں گورکھپوری

(اس ڈرامہ کا ترجمہ ساقی کے مدیر شاہد احمد نے بھی کیا ہے)

ارنسٹ   اسکار وائلڈ کا ڈرامہ "دی امپارٹنس آف بی انگ ارنسٹ" مترجمہ تمکین کاظمی سعیدی

(اس ڈرامہ کا ترجمہ مجنوں گورکھپوری نے بھی کیا ہے)

انصاف   جان گالزوردی کے ڈرامہ "جسٹس" کا ترجمہ

آغازِ ہستی   برنرڈ شا کا ڈرامہ "بیک ٹو میتھوسیلا"   مترجمہ مجنوں گورکھپوری

متفرق ترجمے :-

دخترِ فرعون   جارج مار ایبرس کی ایک تصنیف   مترجمہ لطافت حسین خان

خیالات   ارونگ امریکن ادیب واشنگٹن ارونگ کے بعض مضامین مترجمہ محمد یحییٰ تنہا

مقالہ روسو   ایک فرانسیسی مصنف کا مقالہ   مترجمہ ظفر حسین خاں

خودکشی کی انجمن   رابرٹ لوی اسٹیونسن کی ایک تصنیف کا ترجمہ از عبدالمجید خاں سالک

قدیم تہذیب	ایک انگریزی کتاب	مترجمہ ایم۔ اے ولایت احمد
آئینہ جمہوریت	اطالوی محبِ وطن جوزف میزینی کی ایک تحریر کا ترجمہ	از احمد منصور سلیم
فلاح الطلبا	ایک انگریزی کتاب	مترجمہ سید احمد حسین
مقالات افلاطون	انگریزی سے ترجمہ	از سید احمد حسین
خود اعانتی	ایک انگریزی تصنیف	مترجمہ مرزا ناصر علی بیگ
سید الانبیا	کارلائل کی مشہور تقریر "ہیرو ایز اے پرافٹ"	مترجمہ اعظم خاں ام۔ اے (عثمانیہ)

نظموں کے ترجمے

گزشتہ سترہ سال میں انگریزی نظموں کے ترجمے بہت کم ہوئے کسی شاعر نے اس طرف جیسی چاہئے توجہ نہیں کی تاہم بعض صاحب ذوق اصحاب کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔

ٹامس مور کی "لالہ رُخ" کا ترجمہ ضامن کنتوری نے نظم میں کیا تھا۔ ل۔ احمد نے اس کا ترجمہ نثر میں کرکے شائع کیا۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے ٹینی سن کی مشہور نظم اینک آرڈن کو اُردو نثر میں منتقل کیا۔ قصہ کی دلچسپی تو ایک حد تک باقی رہی ہے لیکن اصل کی شاعرانہ لطافتوں کا بہت بڑی حد تک خون ہوگیا ہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم نے بعض انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے۔ ورڈسورتھ کی نظم "ککو" کا ترجمہ "کوئل" کے عنوان سے کیا گیا ہے ایک حد تک دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ ورڈسورتھ کی نظم "انٹیمیشنز آف امارٹالٹی" کا ترجمہ محمد امیر نے اردو میں کیا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے ہوریس اسمتھ کی ایک نظم کا ترجمہ "ممی سے خطاب" کے عنوان سے کیا جو دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے بعض چھوٹی چھوٹی انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں جن میں "فردوس بر ملا" قابل ذکر ہے۔ وقار احمد بی۔ اے نے رابرٹ براؤننگ کی مشہور نظم "ربی بن عذرا" کا منثور ترجمہ "شیب و شباب" کے عنوان سے کیا۔ اصل کے مطالب کو اُردو میں منتقل کرنے میں یہ ایک حد تک کامیاب رہے ہیں۔

راقم نے ولیم ورڈسورتھ کی تقریباً تمام اعلیٰ قسم کی نظموں کے ترجمے نثر میں کئے جو "ورڈسورتھ اور اس کی شاعری" میں چھپے ہیں۔

میر حسن ام۔ اے (عثمانیہ)

کلام اکبر کا اخلاقی عنصر

انسان فطرتاً حسن اخلاق کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جس شخص کا اخلاقی مذاق گرا ہوتا ہے وہ قبیح سے قبیح فعل کے ارتکاب میں ذرہ برابر نہیں جھجکتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک انسان کی اخلاقی حالت درست نہ ہوگی اس کی معاشرتی اور تمدنی حالت کبھی نہیں سدھر سکتی

اخلاق دراصل ایک ذریعہ ہے جس سے انسانی زندگی کامیاب بنائی جا سکتی ہے۔ چونکہ شاعر حد درجہ حساس ہوتا ہے اس لئے تمدن اور معاشرت کا اثر بھی شاعر پر بہت گہرا پڑتا ہے اور چونکہ شعر کا افسوں انسانی طبائع پر بہت جلد چل جاتا ہے اس لئے شعرانے دوسرے مضامین کے ساتھ اخلاق کو بھی موضوع سخن قرار دیا ہے۔

محمد تصدق حسین صاحب بٹالوی اپنے مضمون "اکبر اور اخلاقیات" میں رقم ہیں: "جملہ شعرائے ایران نے اخلاق کی حقیقت کو قطع نظر کرتے ہوئے پند و نصائح اور مواعظ وغیرہ کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ وہ لوگوں کو نیکی کی راہ پر لانے کے لئے تلقین و ہدایت کرتے رہے اور یہ نہ جانا کہ شاعر ہیں واعظ نہیں۔ ترک دنیا۔ قناعت۔ توکل۔ تواضع۔ خاکساری اور جود و سخا کی تلقین ایک مذہبی واعظ اور مبلغ اخلاقیات کا کام ہے نہ کہ شاعر کا۔" (رسالہ ہمایوں ۱۹۲۲ء ماہ نومبر)

مندرجہ بالا عبارت کا یہ جملہ قابل غور ہے۔ "جملہ شعرائے ایران نے اخلاق کی حقیقت کو قطع نظر کرتے ہوئے پند و نصائح

اور مواعظ و عبر کو اپنے کلام میں جگہ دی۔

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ پند و نصائح اخلاق کا جزو ہی نہیں۔ اگر پند و نصائح کو اخلاق کا جزو نہ سمجھا جائے تو ان کا تعلق کس موضوع سے ہوگا۔ اس کے علاوہ عبارت مندرجہ بالا سے مترشح ہوتا ہے کہ شاعر مبلغ اخلاقیات نہیں ہوسکتا اور اسے تعلیم دینے کا کوئی حق نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر جو اقلیم شاعری کے آفتاب و ماہتاب سمجھے جاتے ہیں دنیائے شاعری سے خارج سمجھے جائیں گے جس کے بعد فارسی شاعری بالکل کھوکھلی ہو جائے گی اور اس کی آب و تاب فنا ہو جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ شاعر بھی ایک طرح کا واعظ ہوتا ہے مگر شاعر اور واعظ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ شاعر بلحاظ صفات انسانی اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور واعظ خصوصیات مذہب کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

شاعر واعظ تر ہوتا ہے اور واعظ، واعظِ خشک ہوتا ہے۔ واعظ سُنی سُنائی باتوں کو اپنے پیشہ کی بجا آوری میں پیش کرتا ہے اور شاعر انہی باتوں کو اپنے دل سے محسوس کرکے ایک پیغمبر کے پیام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس لئے جس قدر جلد شعر کا اثر انسانی طبائع پر ہوتا ہے واعظ کے وعظ سے وہ اثر نہیں ہوتا۔

اکبر نے بھی قناعت، صبر و توکل، ہوا و ہوس، قول و عمل وغیرہ پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے مگر یہ سُنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے قومی درد کا لازمی نتیجہ تھا۔

اکبر صرف واعظ ہی نہیں بلکہ یہ ان کی اخلاقی طاقت ہے جو خود بخود ظاہر ہوتی ہے جو کچھ انھوں نے تلقین کی ہے وہ ان کی پُر از سوز و گداز طبیعت کی آمد ہے اور یہی وہ صفت ہے جو شاعر کو واعظ سے متمیز کرتی ہے۔

اکبر کی تعلیم واعظ خشک کی تعلیم سے بالکل جداگانہ ہے۔ توکل سے یہ مطلب نہیں کہ انسان اپاہج ہو کر بیٹھ رہے۔ ایسی تعلیم بجائے نفع بخش ہونے کے نقصان رساں ہوتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم سے انسان میں کاہلی سرایت کر جاتی ہے جس کی وجہ سے افسردہ دلی اور دون ہمتی جیسے قاطع حیات امراض قوم میں پھیل جاتے ہیں۔

اکبر کا مطلب توکل سے یہ ہے کہ اگر انسان مصائب کا شکار ہو اس وقت تسکین دل کے لئے صبر، تقدیر اور اعتقاد کے دامن کو مضبوط پکڑ لے۔ اس کے نزدیک بھی وہ واحد راستہ ہے جو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے اور یہی راہ اس کے نزدیک خدا تک پہنچنے کی ہے فرماتے ہیں ؎

جھکتا نہیں بندہ کسی بدخواہ کے آگے کیا غم ہے توکلت وعلی اللہ کے آگے

نالہ و فریاد جائز ہے مصیبت میں مگر صبر ہی بہتر ہے انساں کو جہاں تک ہو سکے

بہ ایں ہمہ اکبر کی تعلیمات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حد درجہ قدامت پسند تھے وہ ہر شئے کو قدیم روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے یہ مرحوم کی غلطی تھی۔ انھیں رفتار زمانہ کے ساتھ چلنا چاہئے تھا جیسا کہ ایک عرب حکیم کا قول ہے "در مع الدھر کیف دار" مولانا حالی فرماتے ہیں "جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں مگر یہ ان کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بھاؤ کو نہیں روک سکتیں اور چند جھاڑیاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں" (ماخوذ از مقالات حالی صفحہ ۲۲)

اکبر انگریزی تعلیم کے خلاف ہیں فرماتے ہیں:۔ انگریزی تعلیم سے ہم میں مذہبیت باقی نہیں رہتی ہم اپنی تاریخ اور اپنا لٹریچر چھوڑ کر دوسروں کی تاریخ پڑھتے ہیں اور اس طرح سے اپنے آبا و اجداد کے حالات سے ناواقف رہتے ہیں۔

بھولے جاتے ہیں ہسٹری بھی اپنی مذہب کو خفیف پاتے ہیں ہم

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا شیخ مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

اکبر کا یہ کہنا انگریزی تعلیم سے مذہبیت باقی نہیں رہتی اور ہم اپنے اسلاف کو بھلا بیٹھے ہیں صحت پر مبنی نہیں ہے۔ علم ایسی فضول باتیں کبھی نہیں سکھاتا بلکہ یہ ہماری اپنی غلطی ہے۔ آخر انسان کو عقل کس واسطے عطا ہوئی ہے؟ مذہب یہ کہاں تعلیم دیتا ہے کہ علم نہ سیکھو علم کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے۔

تو جان بیچ کر بھی جو علم و ہنر ملے جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے

اکبر کے نزدیک موجودہ تعلیم مذہب سوز ہے فرماتے ہیں۔

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

علم یہ کبھی نہیں سکھاتا کہ دینی عقاید چھوڑ بیٹھو بلکہ علم سے تو انسان کی نظر اور وسیع ہو جاتی ہے علم اچھے اور برے کا امتیاز بتاتا ہے علم کھوٹے اور کھرے کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ علم سے انسان مہذب بنتا ہے مگر اکبر کا کہنا ہے کہ تہذیب جدید بجائے اس کے کہ زندگی میں سہولتیں پیدا کرتی اور پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے اکبر تہذیب سے تہذیب قدیم مراد لیتے ہیں اور چونکہ قدامت پسند ہیں اس لئے انھیں یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ نئی تہذیب میں لوگ رنگے جائیں۔ یہ بھی مرحوم کی کوتاہ نظری ہے

زمانے کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن بھی بدلتا جاتا ہے آج ہم اپنے کو قدیم لوگوں سے زیادہ مہذب سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ آیندہ

نسل ہمارے تمدن و معاشرت کو اپنے سے کمتر سمجھے۔

موجودہ سائنس پر اکبر یوں خندہ زن ہیں۔

کفر نے سائنس کے پردہ میں پھیلائے ہیں پاؤں　　　بے زباں ہے دل میں شمع ایماں ان دنوں

اکبر سائنس کو کفر سمجھتے ہیں حالانکہ سائنس سے انسان کو خدا کے پہچاننے اور اس کی قوت کا اقرار کرنے میں از حد مدد ملتی ہے سائنس کی بدولت نت نئی نئی چیزیں ظہور میں آ رہی ہیں جن کو دیکھ کر انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور اپنے کارہائے نمایاں پر فخر کرنے لگتا ہے مگر جب موت آ کھڑی ہوتی ہے اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ بیشک ہم سے بھی زیادہ ایک قوت ہے جس کا کرشمہ یہ ساری کائنات ہے۔

اکبر کی مندرجہ ذیل رائے تعلیم کے متعلق بالکل صحیح تھی فرماتے ہیں۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے　　　جو عقل سکھائی جاتی ہے فقط سرکاری ہے

بیشک اکبر کا یہ اشارہ منفعت بخش تھا۔ کیونکہ حکومتِ وقت کا منشا بھی یہی تھا کہ ہندوستانیوں کو محرر بنایا جائے

مندرجہ ذیل قطعہ میں بھی اکبر نے بہترین تعلیم دی ہے۔

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے　　　یا کوئی شے مفید خلایق بنا سکے

ہم تو اُسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا　　　پڑھنے کو ستو ہیں جو کوئی پڑھا سکے

اکبر کو اسی قسم کی تعلیم دینے کی ضرورت تھی نہ کہ یہ اعلان کرنا چاہیے تھا کہ انگریزی تعلیم کوئی حاصل نہ کرے۔

اکبر کی دوسری تعلیم پردہ کے متعلق ہے ہندوستانی مغربی تہذیب و تمدن میں رنگے چلے جاتے تھے جس کا اثر عورتوں پر بھی پڑا اور اُنھوں نے یہ کہہ کر کہ پردہ غلامانہ ذہنیت ہے پردہ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر اکبر کا دل پاش پاش ہو جاتا ہے جس کا اظہار یوں ہوتا ہے۔

آئیں جو بے حجاب نظر چند بیویاں　　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر اپنے زمانہ کے ماحول سے متاثر ہو کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تہذیب مغربی تہذیب مشرقی کو نیست و نابود کر دے گی، چنانچہ خود ہو کر فرماتے ہیں

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بیبیاں کب تک
بنے رہوگے تم اس ملک میں میاں کب تک

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں
یہ غیرتیں یہ ہوائیں یہ گرمیاں کب تک

عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ انٹر میں
سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

جو منہ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

اکبر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ملک کے جوان تو جوان بعض بزرگ حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ پردہ اُٹھ جانے سے قوم کی اخلاقی ترقی ہوسکتی ہے اکبر ایسے لوگوں کا یوں مضحکہ اڑاتے ہیں۔

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی
جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ

سن چکا ہوں میں کہ کچھ بڈھے بھی ہیں اس میں شریک
یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیر نابالغ ہیں وہ

اکبر کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا عورتیں پردہ میں رہ کر ترقی نہیں کرسکتی ہیں؟ اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ عورتیں پردہ میں رہ کر ہر وہ کام جو ملک و قوم کی ترقی کا ممد و معاون ہو کرسکتی ہیں۔ پردہ سے باہر نکل کر سوائے اس کے کہ شرم و حیا جو صنف نازک کا زیور ہے اٹھ جاتی ہے۔ باہر نکل کر ان کی آنکھوں کا پانی مرجاتا ہے۔ پردہ سے باہر نکل کر انہیں یہ گوارا نہیں ہوتا کہ شوہر ذرا بھی اپنی آقائی جتلائے بلکہ وہ خود آقا بن جاتی ہیں۔ پردہ اُٹھ جانے سے جو حالت ہوئی اس کی بابت اکبر صاحب فرماتے ہیں۔

پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
تھینک یو دیر میں سننے کے لئے کان تو ہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

اے اکبر ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا
کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

تمہاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی
مری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشم خوباں سے شرم ٹپکے

عورت لاکھ حسین و جمیل ہو مگر جب تک اس میں حیا نہ ہو گی اُس کا حُسن کوڑی کام کا نہیں۔ حیا حُسن کا زیور ہے۔ بیحیا عورت ہمیشہ ذلیل رہتی ہے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی ہے۔ عورت کا پردہ اس کی حیا کی علامت ہے اور یہی اس کے ایمان کی دلیل ہے الحیاء من الایمان

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نہ رہ سکے گی لطافت جوزن ہی بے پردہ		سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

غرض یہ کہ پردہ کے متعلق طرح طرح سے تلقین کی ہے اور وہ اسے از حد ضروری سمجھتے ہیں۔

اخلاق و معاشرت میں قول و عمل بھی ایک رکن ہے۔ اکبر عمل و زندگی کو لازم و ملزوم خیال کرتے ہیں۔ بغیر عمل کی زندگی بالکل ایسی ہے جیسے ایک جسم تو ہے مگر اس میں روح ندارد۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ جس شخص کا قول و عمل ایک نہیں ہوتا لوگ اُس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ قومی زندگی کا راز محض قول و عمل کے توافق پر ہے ورنہ محض باتوں سے کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ اکبر لوگوں کو اعمال کے حسن سے سنورنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

قرآں ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے		کس حُسن سے یہ بھی تو سنو حُسن عمل سے
یہ دعوئے توحید مبارک تمہیں اکبر		ثابت بھی کرو اس کو مگر حسنِ عمل سے

اکبر تعلیم نسواں کے خلاف نہ تھے بلکہ وہ اس کے حامی تھے۔ تعلیم سے اُن کا مقصد مروجہ تعلیم نہ تھا بلکہ وہ ایسی تعلیم چاہتے تھے جیسی ان کے بزرگ دیتے آئے ہیں۔ اکبر مروجہ انگریزی تعلیم کے بالکل خلاف تھے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس لئے اکبر کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر تعلیم نسواں بھی اسی نہج پر شروع ہو گئی تو پھر قیامت آجائے گی اسی لئے اکبر نے ایسی تعلیم سے باز رکھنے کے لئے ہزار وں طریقوں سے ڈرایا دھمکایا ہے فرماتے ہیں۔

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو		پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تعلیم کے بدل جانے سے مشرق و مغرب کے تخیل عزت نسوانی کے فرق کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے		خدمت میں ہے وہ لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر		شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں زین کی قید
بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے

نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ
شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

مندرجہ ذیل اشعار سے تعلیم نسواں کے متعلق اکبر کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے

تعلیم عورتوں کو بھی دینا ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہے تو وہ بے شعور ہے

حسنِ معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
وہ وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

معصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

اکبر نے مندرجہ بالا تعلیم کے علاوہ ریا کاری۔ مکاری۔ رشوت وغیرہ سے بچنے کی بھی تعلیم دی مگر مرحوم نے اپنی تمام تر کوششیں مغربی تعلیم کے خلاف اور پردہ کو برقرار رکھنے کے متعلق کیں ہیں۔ آج جبکہ اکبر ہمارے سامنے نہیں ہیں ہم آئے دن بے پردگی کے نقصانات آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مروجہ تعلیم کا رونا ہر جگہ رویا جارہا ہے۔ اس میں شک نہیں اکبر بالکل ہی مروجہ تعلیم کے خلاف تھے جو مرحوم کی زیادتی ہے کیونکہ مروجہ تعلیم سے فائدہ ضرور ہے مگر بعض ایسے نقائص بھی ہیں جن کا دور کرنا ازبس ضروری ہے۔

شاہ ابرار احمد ایم۔ اے (عثمانیہ)

حسنِ مفلس

(۱)

ایک لڑکی دُکھ کی ماری غم سے کملائی ہوئی گردشِ ایام کی شورش سے گھبرائی ہوئی
رو رہی ہے ہچکیاں لے لے کے بیٹھی خاک پر اک اُداسی چھائی ہی اُس کے رُخِ غمناک پر
جنبشِ موجِ نفس سے آ رہی ہی بوئے داغ جل رہا ہی اُس کے دل میں یادِ ماضی کا چراغ
کر رہی ہے یاد اپنا اوّلیں دورِ شباب کوندتی ہی جسم کی رگ رگ میں برقِ اضطراب
سینۂ سوزاں میں ہی اک شورشِ غم کا ہجوم دیکھ کر یہ حال کانپ اُٹھتے ہیں گردوں پر نجوم
پردہ ہائے چشم پر لرزاں ہے عکسِ بے کسی غنچۂ دل پر ہے طاری عالمِ افسردگی

بڑھ رہا ہے اور بھی تھم تھم کے یوں سوزِ جگر
اشک پیہم بہہ رہے ہیں عارضِ گلرنگ پر

حُسن کے ماتھے پہ ہیں افلاس کے عریاں نشاں
جسمِ سیمیں اور ملبوسِ کہن کی دھجیاں

اس کی حالت انقلابِ دہر کی تفسیر ہے
سر سے پا تک گردشِ ایام کی تصویر ہے

(۲)

آہ اے بے کس ترا وہ عہدِ زریں کیا ہوا
حُسن کی دنیا کا دورِ عشرت آگیں کیا ہوا

کیا ہوئیں وہ گلستانِ عیش کی شادابیاں
کیا ہوئیں میخانۂ اُلفت کی وہ سرشاریاں

مرمریں ہاتھوں کی وہ ناز و نزاکت کیا ہوئی
خوشنما رخسار کی پھولوں سی رنگت کیا ہوئی

سینۂ محزوں میں وہ جوشِ تکلم کیوں نہیں
چہرۂ دلکش پہ وہ موجِ تبسم کیوں نہیں

نرم اور نازک کلائی اُس پہ بھدی چوڑیاں
کس قدر حسرت سے ہے معمور تیری داستاں

صنفِ نازک اور دامِ رنج و غم میں مبتلا
کس سے دیکھا جائے گا یہ روح فرسا ماجرا

تیری ہستی درسِ عبرت ہے زمانے کے لئے
اک جرس ہے اہلِ غفلت کو جگانے کے لئے

رشید احمد (سال چہارم)

غلط فہمی

شادی نام ہے چند عجیب اور پُر لطف وارداتوں کا۔ میرے دوست جن کی شادی میں میں مدعو تھا۔ ممکن ہے میرے موافق نہ ہوں کیونکہ رخصتی کو بعد ختم تعلیم قرار دیا گیا تھا۔ اور اس وقت صرف نکاح کی مسعود تقریب عمل میں لائی گئی تھی تاکہ وہ شوق سے پڑھیں اور بہت جلد فارغ التحصیل ہو جائیں۔ میں تھکا ماندہ آیا تھا۔۔ ستانے کے خیال سے آرام کرسی پر جو عین دریچہ کے سامنے رکھی ہوئی تھی دراز ہو گیا۔۔۔ خیالات کی رو میں میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دولہا بنا بیٹھا ہوں۔۔۔ ایک حسین اور شرمیلی دلہن کے رو برو ہوں۔۔ باتیں ہو رہی ہیں ادھر سے اصرار اور ادھر سے انکار ہو رہا ہے۔ اپنی محبت کے اظہار کی ناکام کوشش کر رہا ہوں کہ اتنے میں دریچہ کھلنے کی آواز نے سارے طلسم کو توڑ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور چپ سادھے لیٹا رہا۔ ایک نسوانی آواز نے مجھے مخاطب کیا "اجی ادھر دیکھو تو" میں بہت سٹ پٹایا۔ یہ کون تھی۔۔ کیا یہ مجھے پہچانتی ہے۔۔۔ میری پہچانت کی تو یہاں کوئی بھی نہیں۔۔۔ پھر یہ کون ہے جو مجھے اس طرح تخاطب سے سرفراز کر رہی ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پھر دوبارہ اسی سوال کو دھرایا گیا "اب دیکھو گے بھی کہ نہیں"۔۔۔ میں کیا کرتا میں بہت پریشان تھا۔۔۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی اجنبی عورت کے اقدام تخاطب کا نشانہ بنا ہوا تھا۔۔۔ میں نے خاموشی سے جاگی

اور ان سوالات کا کوئی جواب نہ دیا پھر کچھ غصہ کے انداز میں کہا گیا "سن تو لو میں چلی، بھلا بار بار کہلا بھیجکر مجھے بلوانا کس مطلب کے لئے ہے" .. .. اور پھر اب میں جو آگئی ہوں تو کچھ بولتے نہیں" .. .. توبہ ہے باز آئی میں ایسے مردوے سے" خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ ہم کسی کے نادانستہ شوہر بنے ہوئے ہیں اور ہم سے پوچھا جا رہا ہے کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔ فوراً ان شوہر صاحب کی بدنصیبی کا خیال آیا جو بڑی مشکلوں سے اپنی بیوی کو تم کھڑکی تک کھینچ لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیونکہ کسی شادی میں اپنی بیوی سے ملاقات ہونی اتنی ہی دشوار ہے جتنی کہ خود اپنی شادی سے پہلے۔

کھڑکی کے بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ہم اس مغالطہ کو زیادہ بڑھنے نہ دینے کی خاطر اٹھنے ہی کو تھے کہ وہی آواز اپنی پوری ملائمیت اور ترنم لئے ہوئے سنائی دی۔ میرے دل میں اس وقت یہ خواہش کتنے زوروں پر تھی کہ کاش میں ہی اس کا شوہر ہوتا اور اس کے اس محبت بھرے سوال کا جواب دے سکتا۔

کہہ رہی تھیں "آج رات کو یہیں ملوں گی" .. .. میں نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ میں کیا جواب دے سکتا۔ کئی مرتبہ سوچا کہ صاف کہدوں کہ "میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو" مگر ہمت نہ پڑتی تھی .. .. اور وہ نیک بخت بھی معلوم ہوتا تھا بہت دن سے شوہر سے نہیں ملی تھی کیونکہ مری اس بے اعتنائی کے باوجود ٹلنے کا نام نہیں لیتی تھی .. .. بس کہے جاتی تھی .. .. میں نے حتی الامکان اپنے آپ کو ان الفاظ کے سننے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ بھلا میں ان الفاظ کا کیسے حقدار ہو سکتا تھا .. .. جب کہ وہ کسی اور کی شان میں تھے لیکن وہ تو اپنے نزدیک شوہر سے مخاطب تھی .. .. "کتنی دفعہ کہا کہ ایک اچھی ساڑھی کہیں آنے جانے کے لئے لا دو۔ مگر کہاں اپنے ہی بناؤ سنگھار سے فرصت نہیں۔ مگر اس میں میرا کچھ نہیں بگڑتا .. .. مگر لوگ نام رکھیں گے تو تم کو ہی .. .. اگر اندر آ سکتے تو دیکھتے کہ دوسروں کی بیویاں کیسی سج دھج سے آکر آئی ہیں۔ سونے میں پیلی ہوئی جا رہی ہیں .. .. ارے ایک چپراسی کی بیوی کو بھی دیکھو تو آنکھ نہ ٹھیرے۔ یا ایک ہم بھی ہیں کہ نہ زیور ہے اور نہ کپڑے۔ باز آئی میں ایسی دعوتوں سے میں نے کتنا کہا کہ میں نہ جاؤں گی لیکن نہ مانے .. .. اچھی بے عزتی کی اب گھر تو چلو .. .. ناک میں دم نہ کر دوں تو میرا نام (ظاہر کرنا مناسب نہیں) نہیں" اس خطبہ پر بھی ہم نے کوئی اعتراض یا عذر نہیں پیش کیا۔ اور نہ کچھ حرکت کی۔ جس پر وہ اور بھی برانگیختہ ہوئیں "نہ دیکھو .. .. سب سمجھتی ہوں .. .. اب اگر کہتی واہ کتنا آرام سے رکھا ہے .. .. میں تم پر واری .. .. صدقے گئی .. .. میرے پیارے تو فوراً چلتے

اور کچھ بیہودگیاں کرتے۔ میں کہتی ہوں تمہیں اس سنیما نے خراب کیا۔ " تم چاہتے ہو کہ جیسا تم کرتے ہو میں بھی ویسا ہی کروں۔ تم وہی حرکتیں کرتے ہو جو سنیما میں دیکھتے ہو۔ " میں تو ان نخروں اور بازاری عورتوں کی چالوں سے بہت دور بھاگتی ہوں۔ " دیکھو اب گھر چل کر اماں سے تمہاری سب باتیں نہ کہوں تو کہنا۔ آخر کوئی حد ہے۔ " "ہمیں کچھ ہنسی بھی آئی اور کچھ گھبراہٹ بھی ہوئی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا کہ اتنے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی اور دریچہ بند ہوگیا۔ ایک صاحب تشریف لائے اور ہمیں کرسی پر آرام کرتے ہوئے دیکھ کر بھوئیں چڑھائیں اور ذرا رُخ بدلتے ہوئے زیر لب کہنا شروع کیا "عجیب بدانتظامی ہے" ہم نے یہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا اور معافی چاہتے ہوئے اُٹھ گئے۔ ہم وہاں سے ہٹے تو ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے ان کی گفتگو آسانی سے سُن سکتے تھے۔ " ہمیں زیادہ دیر توقف نہ کرنا پڑا وہی آواز جو کچھ دیر پہلے ہماری سامعہ نوازی کر رہی تھی سنائی دی "تو پھر اب میں جاؤں" میں دیکھ رہا تھا کہ اس آواز کو سُنکر وہ صاحب ایک جست کے ساتھ دریچے کے قریب پہونچ گئے اور پُر جوش آواز میں کہا "ابھی تو آئی ہو۔ " اور ابھی ہی چلیں۔ " "جی ہاں ابھی آئی ہوں بس بس میں اس مذاق سے تنگ آگئی۔ " کیا یہ بھی کسی کھیل میں دیکھا ہے کہ بیوی گھنٹہ بھر کھڑے بک بک کرے اور خاموش رہو اور جب جانے لگے تو کہو "ابھی تو آئی ہو"

وہ اتنا کہکر اندر چلی گئیں اور یہ صاحب کسی فکر میں کھو گئے۔ " دوبارہ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو اُن کی آنکھوں میں غصہ صاف طور پر جھلک رہا تھا۔ " اس میں میرا بھی قصور نہیں۔ " میں کیا کرتا۔ " سننے پر مجبور تھا۔ " آپ بھی اسے راز ہی رکھئے اور میں بھی بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں

عبدالرشید متعلم سال دوم

*

غزل

مری بربادیوں سے کیا کسی کو
سمجھنا تو مجھے ہے زندگی کو

نشہ میں چور رہنا چاہتا ہوں
اسی عالم میں دیکھا ہے کسی کو

شکایت پر مری چپ ہو کے تم نے
معمہ کر دیا نا زندگی کو

سنا کرتا ہوں میں دل کا دھڑکنا
محبت کہتے ہیں شاید اسی کو

کبھی ہنس بھی دیا ہوں روتے روتے
ابھی سمجھا نہیں تیری ہنسی کو

بہت دشوار ہوتا ہے گرامی
سنانا حال دل اپنا کسی کو

مصطفےٰ علی اکبر گرامی متعلم بی۔اے

ہندوستان کے صدسالہ عمرانی قوانین

۱۸۳۷ء سے ۱۹۳۷ء تک

سیاسی انقلاب دفعتہً نمودار ہوجاتے ہیں مگر معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کا یہ حال نہیں۔ان کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔اور اس کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے اس لئے یہ مسئلہ خود ہی مختلف فیہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی تغیرات کو انقلاب سے تعبیر کیا جائے یا تبدیلی سے۔مگر یہ تسلیم کیا جاچکا ہے کہ ہر اس معاشی یا معاشرتی تبدیلی کو انقلاب کہا جاسکتا ہے جو اگرچہ دفعتہً نہ ہو مگر آخر میں چل کر اس کے نتائج انقلابی ثابت ہوں۔

اکثر بڑے بڑے کامیاب مطلق العنان فرمانرواؤں نے اپنی تمام جابرانہ قوتیں صرف کیں مگر سماج میں انقلاب نہ کرسکے۔سماج میں تبدیلی کرنے والے کو ہمیشہ بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی محبت اور ہر دلعزیزی نفرت اور حقارت سے بدل جاتی ہے۔امان اللہ خان سابق شاہ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ان کی تخت وتاج سے دست برداری کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ سماج میں نئی نئی تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔جس کی خاطر انھوں نے سرکاری عہدہ داروں اور ملازموں سے زائد ٹیکس وصول کرنا چاہا، معمولی سپاہیوں اور کم حیثیت رسول کی تنخواہوں میں تخفیف کی، اوقات پر سرکاری نگرانی قائم کی۔متعدد ملاؤں اور مذہبی پیشواؤں کی جاگیرات ضبط کرلیں متعدد مفت خوروں کی تنخواہیں بند کردی گئیں۔اس وجہ سے وہ تمام لوگ جن کو بادشاہ کی جانب سے مالی نقصان

پہونچا تھا ان کے خلاف ہو گئے اور بغاوت ہو گئی۔ انسان فطرتاً بڑا قدامت پرست ہے وہ ہر نئی چیز کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور اس کے قبول نہ کرنے کے مختلف بہانے ڈھونڈتا ہے کبھی اُسے مذہبی رنگ میں پیش کرتا ہے اور کبھی سیاسی رنگ دیتا ہے۔ اوّل الذکر طریقے سے وہ بہت جلد عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔ اگر کوئی جابر طاقت اپنی قوت و اقتدار کے ذریعہ سماج سے کسی بات کو منوا بھی لیتی ہے تو اس طاقت کے زوال پذیر ہوتے ہی وہ تحریک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات کسی بڑے آدمی کو خوش کرنے کے لئے اس کی نئی چیز کو قبول کر لیا جاتا ہے جیسے اکبر کے دین الٰہی مذہب کا حال تھا کہ اکثر درباریوں نے محض بادشاہ وقت کی خوشی کی خاطر اس نئے مذہب کو قبول کر لیا مگر اکبر کی وفات کے بعد اس مذہب کا ذکر تک نہ سنا گیا۔

گذشتہ سو سال سے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً ایسی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں جنھوں نے ہماری زندگی، معاشرت، اور تمدن کو بالکل بدل دیا ہے۔ غذا، لباس، طرز رہائش عادات و اطوار، اور رسوم و رواج میں بہت کچھ تغیر و تبدّل ہو گیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۸۳۵ء سے ۱۹۳۵ء کے درمیان ہندوستان میں کوئی فوری معاشرتی انقلاب ہوا مگر یہ بے شک صحیح ہے کہ اس دوران میں ایسی معاشرتی اور عمرانی اصلاحات ہوئیں جنھوں نے انقلاب پیدا کر دیا۔

انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستان پر ایک نئی حکومت کا تسلط ہوا، اس وقت فاتحین کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا کہ کسی طرح ان دیسی رئیسوں کو اپنے قبضے میں لائیں جو ہر وقت ان کو ملک سے نکال دینے کی کوشش میں مصروف ہیں اور اپنے سابقہ زیر اقتدار علاقوں کی واگذاشت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، جنگ و جدال، بدامنی، بے چینی، بے اعتباری، بدانتظامی اس دور کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ یہ بہت ہی نازک وقت تھا اور اس لئے اس نازک دور میں کسی اصلاح کی جانب قدم اُٹھانا ممکن ہی نہ تھا۔ اور اگر اس زمانے میں ہمیں بعض اصلاحات نظر آتی ہیں تو وہ صرف ان علاقوں تک تھیں جہاں نئے راج کو قائم ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا۔ مثلاً اس دور کی اکثر اصلاحات بنگال سے متعلق نظر آتی ہیں۔ کیونکہ یہ نئی حکومت کا ابتدائی مرکز تھا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی چار عشروں کے اختتام کے قریب لوزا رد ول کا ملک کے اکثر حصہ پر

قبضہ ہوگیا تھا یہی دور اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اور اسی وقت پہلی مرتبہ اصلاح کی جانب ابتدائی قدم اٹھائے گئے۔ اگرچہ یہ اصلاحات نامکمل اور غیر منظم تھیں مگر چونکہ بعد کی مکمل اور منظم اصلاحات کی بنیادیں ان سے پڑی اس وجہ سے ان ابتدائی چیزوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوستان کوئی نیا ملک تو تھا نہیں یہاں کا ایک قدیم تمدن اور مکمل معاشرہ تھی۔ تو پھر اس میں تبدیلیوں کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اس کے مختلف وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد تھیں۔ ان دونوں کے الگ الگ قوانین تھے۔ پنڈت اور قاضی عوام سے ان قوانین کی پابندی کراتے تھے۔ مگر ہندو مذہب ایک قدیم مذہب تھا اور پنڈتوں اور برہمنوں کے جوڑ توڑ سے اس کے اصلی قوانین کی صورت بہت مسخ ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ بعض اصول قدیم زمانہ میں وقت کے لحاظ سے مناسب اور موزوں تھے مگر اب ماحول میں تبدیلیوں کی وجہ سے انسانی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ مسلمان ہندوؤں کے بعض رسوم و رواج سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان کو اختیار کرلیا اور اس طرح ان کے یہاں بھی بہت مضر اور غیر مفید اصول داخل ہوگئے۔ پھر ملک میں کچھ تعلیم پھیلنے لگی تھی۔ اور اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے رجحانات میں تبدیلی ہونے لگی اور ان کی یہ خواہش ہونے لگی کہ پرانے قوانین میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ اس کے علاوہ عیسائی مبلغین کی جدوجہد سے اکثر ہندوستانیوں نے عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ پھر ریل کی بنیاد اور توسیع سے تجارت اور آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہونے لگیں۔ مختلف قوموں اور طبقوں کے معاشی اور تجارتی میل ملاپ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے اور لوگوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ ان نئے مسائل کا حل نئے قوانین کے ذریعے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک میں جتنی اصلاحات ہوئیں ان کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب کسی جدید اصلاح کے لئے قدم اٹھایا گیا تو عوام نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ اور تعلیم یافتہ حضرات کی کثیر تعداد نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اور ہر نئی تحریک کے ساتھ ملک میں شور و شغب کا ہونا لازم و ملزوم قرار پایا۔

ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ہندوؤں میں ستی کی رسم مروج تھی۔ یعنی جب شوہر کا انتقال ہوجائے تو بیوہ عورت کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اپنے خاوند کی نعش کے ساتھ جل کر راکھ ہوجائے۔ چنانچہ ملک کی ہزاروں بلکہ لاکھوں دیویاں اس رسم کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اکبر نے اس رسم کو اڑانے کی کوشش کی تھی مگر اس کو اس سے زیادہ کامیابی

نہیں ہوئی کہ کسی عورت کو اس کی مرضی کے خلاف نہ جلایا جائے۔ پھر مارکوئس آف ویلزلی نے اپنی گورنری کے زمانہ میں اس کو ختم کرنے کی جدوجہد کی مگر اس کو بھی ناکامی ہوئی۔

۱۸۲۹ء کے قانون کی رو سے ستی ممنوع قرار دی گئی۔ اور عورت کو ستی ہونے میں امداد اور مشورہ دینے والوں کے لئے سزائیں مقرر ہوئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی ملک میں اس کے خلاف احتجاج ہوا مگر راجہ رام موہن رائے نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ قانون میں کوئی ترمیم نہ کرے اور اس طرح یہ قانون بن گیا۔

۱۸۲۸ء میں برہمو سماج کی بنیاد پڑی اس کا مقصد سماج کی اصلاح تھا۔ ہندو سماج میں بہت سی ایسی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں جو اصلی تعلیم کے بالکل متضاد ہیں اور مذہبی پیشواؤں اور پنڈتوں کا نہ صرف توہم پرست اور جاہل عوام پر کافی اثر تھا بلکہ ملک کے سمجھدار دماغ بھی ان کے زیر اثر تھے اور اُن کو ان کے خلاف لب کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اور جب کوئی مصلح کسی نئی تحریک کو لے کر اُٹھتا تھا تو اس کو اور اس کے پیروؤں کو بے دین بنا دیا جاتا تھا۔ مگر چونکہ ایسے فرقوں کی بنیاد صرف شخصی دماغ کا نتیجہ ہوتی تھی اس لئے یا تو وہ بہت جلد ختم ہو جاتے تھے یا اپنے اصلی مقصد کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔ مگر گذشتہ صدی کے دو فرقے برہمو سماج اور آریہ سماج کمزور بنیادوں پر قائم نہ ہوئے تھے ان دونوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کوشش کی۔ اور اس میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ برہمو سماج نے عورتوں کی تعلیم نئے قوانین، معاشری مساوات کو اپنا نصب العین بنایا۔ مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی غرض سے ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ اس نے ویدوں کی اصلی تعلیم کو اپنے پیش نظر رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم سادہ اور قدیمی اصولوں کے تحت ہونا چاہئے۔

ہندو مذہب میں بیواؤں کی شادی کی ممانعت نہیں ہے مگر رسم و رواج نے صورت اتنی بدل دی تھی کہ بیوہ کی شادی کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ اور بیوہ عورت اپنی بہتری اسی میں سمجھتی تھی کہ وہ شوہر کے مرنے پر خود بھی جان دیدے۔ ستی کے قانون نے عورت کو موت سے بچایا مگر ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا خاتمہ نہ کرسکا۔ لڑکیوں کی شادی کمسنی اور بچپن میں ہوجاتی تھی اور بڑی تعداد جوان ہونے سے قبل بیوہ ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے بعد جسطرح وہ بیوائیں سسک سسک کر زندگی بسر کرتی تھیں اس کو ان کا دل ہی خوب جانتا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے پنڈت ایشور چندر ودیاساگر

نے اس طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ یہ بڑے قابل، عالم اور ذی اثر انسان تھے۔ اور ۱۸۵۶ء میں قانون عقد بیوگان اہل ہنود نافذ کرا دیا۔ ہندوؤں کی کثیر جماعت نے اس قانون کی مخالفت کی۔ مگر بعض تعلیم یافتہ لوگوں نے ثابت کیا کہ عقد بیوگان دھرم شاستر کی رو سے جائز ہے۔ اور اس دلیل کا معقول جواب پیش نہ کیا جا سکا۔ اگرچہ اس قانون سے عقد بیوگان کا رواج نہ ہو سکا تاہم اس کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی گئی۔

ان دو رسموں کا خاتمہ کرنیکے بعد "طفل کشی" کا نمبر آیا۔ گذشتہ صدی تک یہ رسم ملک میں عام تھی۔ اگرچہ ۱۸۰۲ء کے قانون کی رو سے طفل کشی کو قتل کے مترادف قرار دیا گیا تھا مگر اس سے کوئی مناسب روک تھام نہ ہو سکی۔ اس رسم کا شکار زیادہ تر لڑکیاں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ کرنل واکر نے تخمینہ لگایا ہے کہ ۱۸۰۸ء میں کچھ اور کاٹھیاوار کے جھاریہ خاندانوں میں ۲۰ ہزار لڑکیاں موت کے گھاٹ اتاری گئیں۔ ایک ضلع سے یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ وہاں چار سو خاندانوں میں ایک بھی لڑکی موجود نہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے بیٹی کے باپ کہلانے کی بدنامی، اور جہیز اور شادی بیاہ کے اخراجات سے بچنے کے لئے اس سے اچھا نسخہ اور کوئی موجود نہ تھا کہ ان کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جائے۔ مارنے کے جو طریقے رائج تھے وہ بھی انسانیت کے لئے باعث شرم تھے، معصوم اور ننھی جانوں کو سرد ہوا میں چھوڑ دیا جاتا تھا یا سرد پانی میں ڈال دیا جاتا تھا اور وہ ٹھٹھر کر مر جاتی تھیں، گلا گھونٹ کر مارنے کا رواج تھا، زندہ دفن کر دینا بھی جائز تھا۔ اور فاقوں سے بھی ان غریبوں کی جان لی جاتی تھی۔ جب حکومت نے یہ دیکھا کہ اس رسم میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے تو ۱۸۷۰ء میں ایک دوسرا قانون خاص اسی واسطے بنایا تاکہ اس قبیح رسم کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستان میں اب اس رسم کا وجود نہیں ہے قطعی صحیح نہیں ہے چنانچہ مسٹر لکشمی۔ ن۔ مینن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اب بھی ایسے گاؤں ہیں جہاں ۲۰ سال سے شادی کی رسم ادا نہیں ہوئی ہے اور گاؤں والوں کو اس خصوصیت پر فخر حاصل ہے۔

برہمو سماج کی کوششوں سے اکثر اصلاحات عمل میں آئیں۔ عیسائی مبلغین کی جد و جہد بھی اس میں کافی دخل رکھتی ہے۔ ان کا اثر سارے ملک پر پھیل چکا تھا۔ دیسی باشندے عیسائی ہونے لگے۔ نئے مذہب نے پست اقوام کو مساوات کا درجہ عطا کیا۔ ان کے قدیم سماجی بندھنوں کو توڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعداد بڑھنے لگی۔

اب جو ہندو عیسائی ہو جاتے تھے ان کو ہندو قانون وراثت کی رو سے اپنے آبا و اجداد کی جائداد پر حق وراثت نہ پہونچتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے معاملات میں اکثر مرتبہ ان کے ساتھ انصاف نہ ہوتا تھا کیونکہ ان کے لئے کوئی خاص قوانین نافذ نہ تھے اور اصول دھرم شاستر، اور شرع شریف کے قوانین کا انطباق ان پر نہ ہو سکتا تھا سب سے پہلے لارڈ ڈلہوزی نے اس طرف توجہ کی اور ۱۸۵۰ء میں ایک قانون بنایا جس کی رو سے مذہب کی تبدیلی سے حق وراثت زائل نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح ان کے حقوق وراثت کا تو یقین ہو گیا مگر ان کے شادی بیاہ طلاق اور دوسری رسومات کے لئے بھی قوانین کی ضرورت تھی چنانچہ ۱۸۷۲ء میں دیسی عیسائیوں کے لیے شادی کا قانون بنا، ۱۸۷۴ء میں شادی شدہ عورتوں کی جائداد کے تحفظ کے لئے ایک قانون پاس ہوا جس کی رو سے تمام شادی شدہ عورتیں اپنی جائداد کی خود مختار مالک تصور کی جانے لگیں اور شوہروں کو بیویوں کی جائدادوں پر کوئی حق نہ رہا۔ البتہ قانون شوہروں پر کوئی ایسی پابندی نہ لگا سکا کہ وہ اپنی بیویوں کی جائداد کی کفالت پر قرض نہ لے سکیں ۱۸۶۹ء میں قانون طلاق نافذ ہوا۔

اس زمانہ میں پارسیوں نے حکومت سے استدعا کی کہ وہ ان کے لئے بھی قوانین بنائے اور قانونی طور پر صرف ایک شادی کی اجازت دے چنانچہ ۱۸۶۵ء میں پارسیوں کے لئے شادی اور طلاق کے قانون نافذ ہوئے۔

برہمو سماج کے نئے تخیلات کی بنا پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندو سماج کے لئے شادی کے نئے اصول مرتب کئے جائیں اور حکومت نے ۱۸۷۲ء میں اس قسم کا ایک قانون بنایا۔ اس میں ۱۹۲۳ء میں مزید ترمیم کی گئی۔ اس قانون کی رو سے ہندو، سکھ، جین، اور بدھ آپس میں شادی کر سکتے ہیں اور ایسی شادی "سول میرج" کہلائے گی۔

اس کے بعد مختلف ذاتوں اور طبقوں سے متعلقہ قوانیں مثلاً ۱۸۹۶ء میں مالاباریوں کی شادی کا قانون، ۱۹۰۳ء میں نوداردوں کی شادی کا قانون ۱۹۰۹ء میں انند طبقہ کی شادی کا قانون نافذ ہوا۔

اسلامی قانون میں ۱۸۸۰ء میں قاضی ایکٹ کے ذریعے سے تبدیلی ہوئی۔ قاضی ججوں کا کام کیا کرتے تھے اور حکومت کی جانب سے مسلمانوں کے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ شرع شریعت کی رو سے کرنے کے لئے

مقرر کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان سے عدالتی اختیارات لئے جانے لگے۔ مگر قاضی کا عہدہ اٹھ نہ سکا اور آج بھی ہر اُس آبادی میں جہاں مسلمانوں کی کافی تعداد ہوتی ہے حکومت کی جانب سے قاضی مقرر کیا جاتا ہے جو مخصوص رسومات کی تکمیل کرتا ہے۔

ہندوؤں کے قوانین میں ابتدا میں بعض ترمیمات ۱۸۵۶ء میں کی گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں ہندوؤں کے قوانین وراثت میں ترمیم ہوئی ۱۹۳۷ء میں ہندو خواتین کی جائداد کے تحفظ کا قانون بھی مجلس مقننہ سے پاس ہو کر نافذ ہوا۔

ہندوستان میں ایسا دور غلامی تو کبھی نہیں گذرا جیسا کہ امریکہ یا ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ممالک میں گذر چکا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں بھی غلامی کا رواج تھا اور بالخصوص عورتوں اور بچوں کی خرید و فروخت عام تھی، اگرچہ ۱۸۳۲ء میں بچوں کی خرید و فروخت، یا ان کو دھوکہ اور فریب سے ایک مقام یا ضلع سے دوسرے ضلع میں لے جانا سزا کے مستوجب قرار پا چکا تھا تاہم یہ سلسلہ بند نہ ہوا تھا۔ اور رہی سہی غلامی کا خاتمہ کرنے کے لئے ۱۸۴۳ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب انگلستان اور امریکہ میں غلاموں کی آزادی کا سوال اٹھایا گیا تو سارے ملک میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ بالخصوص امریکہ میں تو اس سلسلہ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں مگر ہندوستان میں جب امتناعی قانون نافذ کیا گیا تو کسی قسم کی مخالفت نہ ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں اس رسم کی زیادہ شدت نہ تھی۔

اُنیسویں صدی کے آخری عشرہ کا ذکر ہے کہ کلکتہ میں ایک کمسن بچی کی موت شادی کی وجہ سے ہوئی اس وجہ سے ۱۸۹۱ء میں حکومت نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے ۱۲ سال سے کم عمر لڑکی کی شادی ممنوع قرار دی گئی۔ اس قانون سے ہندوؤں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ کلکتہ کے بعض اخبارات نے اس قانون پر سخت نکتہ چینی کی۔ بمبئی میں تلک اور ان کے اخبار نے بڑی لعنت ملامت کی۔ ہندوؤں نے حکومت کے اس طرز عمل کو مذہب میں مداخلت قرار دیا۔ اور انھوں نے اعلان کیا کہ اب مذہب خطرہ میں ہے۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اور ملک میں اس مسئلہ کی طرف اس وقت تک کسی قسم کی توجہ نہ کی گئی تاوقتیکہ مس میو نے اپنی کتاب "مادر ہند" میں ہندوستان کی کمسن شادیوں کے بُرے نتائج پیش نہیں کئے۔ اس کتاب پر ہندوستانی بہت چراغ پا ہوئے۔

مگر اس نے ملک کے حساس اور ہمدرد لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ رائے صاحب ہربلاس سارداے نے بچوں کی شادی کا امتناعی بل کونسل میں پیش کیا۔ اس بل کے کونسل میں آتے ہی سارے ملک میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہندو مسلمانوں نے جی کھول کر اس کی مخالفت کی، وائسرائے کے پاس وفد بھیجے گئے جلسے ہوئے، تقریریں ہوئیں۔ اور یہ قرار دیا گیا کہ حکومت عوام کے مذہب میں مداخلت کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون پاس تو ہوا اور اس کی رو سے ۱۴ سال سے کم عمر لڑکی اور ۱۸ سال سے کم عمر لڑکے کی شادی ممنوع قرار پائی مگر قانون کی صورت ایسی مسخ ہو گئی کہ اس پر عمل کرانے میں بہت عملی دشواریاں پیدا ہو گئیں۔ نیز چونکہ یہ قانون صرف برطانوی ہند میں نافذ ہے اس وجہ سے لوگ دیسی ریاستوں میں جا کر آزادی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔

یہ مضمون بالکل نامکمل رہے گا اگر اس سلسلہ میں عمرانی قوانین کی ایک اور کڑی کا ذکر نہ کیا جائے اس سے میری مراد قوانین کارخانجات ہیں۔ اگرچہ جس وقت اس قسم کا پہلا قانون نافذ ہوا اس وقت ملک میں بڑے بڑے کارخانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی مگر جو کچھ بھی کارخانے تھے وہاں مزدوروں کے اوقات کار مقرر نہ تھے۔ ہر قسم کا ناجائز استعمال جاری تھا، دن میں تھوڑی دیر کے لئے بھی وقفہ نہ ملتا تھا۔ کمسن بچوں سے سخت محنت لی جاتی تھی، عورتوں سے زیر زمین اور کارخانوں میں رات کے وقت کام لیا جاتا تھا جس کی وجہ سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے لگی تھیں۔ ہوا اور صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ چنانچہ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت نے ۱۸۸۱ء میں پہلا قانون کارخانہ نافذ کیا یہ قانون محض بچوں کے لئے تھا اور اس کی رو سے ۷ سال سے کم عمر بچوں کو ملازم رکھنے کی ممانعت کر دی گئی نیز ۷ سال سے ۹ سال تک کے بچوں کے لئے ۹ گھنٹے مقرر ہوئے۔ دن میں ایک گھنٹہ کا وقفہ اور ہفتہ میں ایک دن کی تعطیل لازمی قرار دی گئی۔ سال بھر بعد دوسرا قانون نافذ ہوا اس میں کمترین عمر ۷ سال کے بجائے ۹ سال کر دی گئی۔ اور عورتوں کے لئے روزانہ ۱۱ گھنٹے مقرر ہوئے، ان کو ۵ بجے صبح سے قبل اور رات کے ۸ بجے کے بعد کام کرنے کی ممانعت کی گئی۔ دن میں ڈیڑھ گھنٹہ کا وقفہ لازمی قرار دیا گیا مزدوروں کے لئے بھی نصف گھنٹہ کا وقفہ مقرر ہوا۔ ۱۹۱۱ء کے قانون سے عورتوں کو سوائے روئی کے کارخانوں کے دیگر کارخانوں میں رات کو کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ۱۹۲۲ء میں ایک نیا قانون جاری ہوا اور کمترین عمر ۱۲ سال قرار پائی اور ۱۲ سے ۱۵ سال تک کے بچوں سے ۶ گھنٹے سے زائد کام لینا خلاف قانون ٹھہرا

اس قانون میں مزید ترمیمات ۱۹۲۶ء میں ہوئیں۔

پہلا قانون معدنیات ۱۹۰۱ء میں نافذ ہوا اگرچہ یہ بہت ہی ناکمل تھا اور ۱۹۲۲ء کی ترمیم کی رو سے عورتوں اور بچوں کے زیر زمین کام کرنے پر پابندیاں عائد کی گئیں اور ۱۹۳۷ء کی رو سے عورتوں کو کانوں کے اندر کام کرنے کی بالکل ممانعت کر دی گئی۔

کارخانوں میں جہاں بڑی بڑی مشینیں استعمال کی جاتی ہوں حادثات کے بھی کافی امکانات ہوتے ہیں جو بعض اوقات مزدوروں کو عمر بھر کے لئے معذور یا ہلاک کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں مزدوروں یا ان کے پس ماندوں کو کچھ معاوضہ ملنا چاہئے ۱۸۸۴ء میں جب بمبئی کے مزدوروں نے پہلی مرتبہ یہ مطالبہ پیش کیا تو کسی نے اس طرف توجہ نہ کی مگر جنگ کے بعد جب حالات تبدیل ہوگئے اور مزدوروں کی حالت میں استحکام پیدا ہوا تو حکومت نے ۱۹۲۳ء میں قانون معاوضہ مزدوران نافذ کیا۔ اگرچہ یہ قانون محض ایک تجربے کے طور پر جاری کیا گیا تھا مگر اب اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فی الوقت باوجود گوناگوں مشکلات کے یہ حقیقی ضرورت کو پورا کر رہا ہے اور ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اس کے عوض مستقبل قریب میں ایک جامع اور مستقل قانون نافذ کیا جائے

مختصر یہ کہ سو سال سے عمرانی قانون سازی کی رفتار برابر جاری ہے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اکثر اصلاحی اور معاشرتی قوانین نافذ ہو چکے ہیں اور بہت سے قانونی مسودات اب مجلس مقننہ میں پیش ہونے والے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہمارے ملک نے عمرانی حیثیت سے کافی ترقی کر لی ہے غلط ہے۔ اب بھی یہاں ایسی سینکڑوں رسمیں موجود ہیں جن کو روکنے کے لئے قوانین کی ضرورت ہے مثلاً کمسن لڑکیوں کی ضعیف العمر افراد سے شادیاں، ہریجنوں کو مندروں میں داخلہ کی ممانعت محض خواہشات کے تحت متعدد شادیوں کا رواج، بیواؤں کے ساتھ بدسلوکیاں وغیرہ

عمرانی ترقی کی ایک صدی گذر گئی۔ ملک کی زندگی میں ایک صدی اصلاحات کے لئے طویل مدت سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس زمانہ میں ہم نے ترقی نہیں کی بلاشبہ ہم بعض ایسی رسومات کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوئے جو انسانیت کی پیشانی پر داغ تھیں۔ مگر ہماری رفتار ترقی بہت سست رہی اور ہے۔ جاپان، ٹرکی اور دیگر ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم بھی ان کی تقلید کریں اور کم سے کم عرصے میں اپنے پرانے چولے کو اتار کر انسانیت کا صحیح جامہ پہن لیں۔

محمد احمد سبزواری متعلم ایم اے (ابتدائی)

بچے اور بوڑھے

ہر شب، سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے، وہ سب ایک کمرے میں ایک تخت پر بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے ننھے دماغوں میں آتا بکا کرتے، اور دھندلی کھڑکی میں، شام کی تیرگی، خواب آلود آنکھوں سے انھیں جھانکتی رہتی ہر گوشے سے خاموش سائے اپنے ساتھ عجیب و غریب حکایات اور کہانیاں لئے ہوئے اوپر کی طرف اُٹھتے ہوئے نظر آتے۔

اُن کے دماغ میں جو کچھ آتا کہہ ڈالتے لیکن اُن کے دماغ میں صرف بہار اور روشنی کی محبت اور اُمید افزا داستانیں ہی آتی تھیں۔ سارا مستقبل اُن کے لئے ایک مسرتناک تعطیل کا روشن دن ہوتا تھا۔ الفاظ زبان سے نکلتے تھے، ... ... نہایت آہستہ ... ... سرگوشیوں کے لباس میں مستور، اور صرف نصف سمجھ میں آتے تھے، اُن کے قصوں کی نہ ابتدا ہوتی تھی نہ انتہا، اور نہ اُن میں تسلسل ہوتا تھا، بعض اوقات چاروں بچے ایک ساتھ بول اُٹھتے، لیکن ایک کی وجہ سے دوسرا گھبراتا۔

بچے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتے تھے کہ دھندلی سی چاندنی میں، سب سے چھوٹے چار سالہ "نان تیک" اور سب سے بڑے دس سالہ "لوئی کا" کی شکلوں میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔

ایک شام کو ایسی خبر جسے وہ نہ سمجھ سکتے تھے، ایک ایسے مقام سے، جسے وہ نہ جانتے تھے، اُس فردوسی فضا میں پہنچی اور اس نے کہانیوں اور لطیفوں کا خاتمہ کر دیا۔ ڈاک سے انھیں یہ خبر ملی کہ اُن کا باپ سرزمین اطالیہ میں چل بسا۔

"لیکن وہ کب واپس آئیں گے؟" تان ٹسیک نے تعجب سے پوچھا۔

لوئی سکا نے اُسے کہنی مارتے ہوئے مغموم لہجہ میں جواب دیا۔ "وہ کس طرح واپس آ سکتے ہیں جبکہ خود اسکے یہاں چلے گئے"

یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے اور اس کے آگے کچھ نہ دیکھ سکتے تھے،

"میں بھی جنگ پر جا رہا ہوں" میٹی چی نے بلا غور و خوض زور سے چلا کر کہا۔

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔" تان ٹسیک نصیحتاً بولا۔

سب سے زیادہ لاغر، نازک اندام اور نحیف ملکا نے، جو اپنی ماں کے بڑے دوشالے میں لپٹی ہوئی تھی، اور ایک مسافر کی گٹھری معلوم ہوتی تھی، اپنے نرم دھیمے لہجہ میں کسی پوشیدہ مقام سے پوچھا۔

"جنگ کیسی ہوتی ہے مجھے بھی بتاؤ میٹی چی۔"

میٹی چی نے مطلب یوں سمجھایا۔ "سنو جنگ اس طرح کی ہوتی ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے پر چاقو سے حملہ کرتے ہیں، تلواروں سے قتل کرتے ہیں اور بندوقوں سے مارتے ہیں، جتنا زیادہ کوئی مارے اور قتل کرے اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ .. .. یہی جنگ ہے۔"

"لیکن وہ لوگ کیوں قتل کرتے ہیں اور کیوں ایک دوسرے کی جان لیتے ہیں؟" ملکا نے پوچھا۔

"شہنشاہ کے لئے"، میٹی چی نے کہا اور سب چپ ہو گئے۔

پھر فوراً ہی میٹی چی نے اپنے خیالات یکجا کئے تاکہ اُس خاموشی کو دور کر دے جو اس وقت ان پر بار گزر رہی تھی۔

"میں بھی دشمن سے لڑنے جا رہا ہوں۔"

"دشمن کیسا ہوتا ہے؟ کیا اُس کے سینگ ہوتے ہیں؟" ملکا کی کمزور آواز نے فوراً سوال کیا

"درحقیقت اُس کے سینگ ہوتے ہیں ورنہ پھر وہ دشمن کیسے ہو سکتا؟" تان ٹسیک نے متانت اور کسی قدر غصہ

سے جواب دیا۔ اور اب خود میٹی چی بھی صحیح جواب نہ جانتا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا۔ ۔ ۔ ۔ کہ اس کے سینگ ہوتے ہیں۔" اس نے رکتے رکتے آہستہ سے کہا۔

"اس کے سینگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ ہماری طرح انسان ہے۔" لوئی کا نے کہا۔

"مگر صرف یہ بات ہے کہ اس میں روح نہیں ہوتی۔" چند لمحوں کے بعد تان ٹیک سے پوچھا۔

"لیکن جنگ میں آدمی خدا کے یہاں کیسے چلا جاتا ہے؟"

"لوگ اسے جان سے مار ڈالتے ہیں۔" میٹی چی نے جواب دیا۔

"ابا جان نے میرے لئے ایک بندوق لانے کا وعدہ کیا تھا۔" تان ٹیک غمگیں لہجہ میں بولا

"وہ بندوق کیسے لا سکتے ہیں جب خدا کے یہاں چلے گئے؟" لوئی کا نے کسی قدر سخت لہجہ میں پوچھا۔

"اور لوگوں نے انھیں جان سے مار ڈالا"؟ تان ٹیک نے سوال کیا۔

"ہاں جان سے۔" لوئی کا نے جواب دیا۔

معصومیت اور بچپن سے آلودہ اور حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں میں سے سکوت اور غم تاریکی میں گھورنے لگا کسی نامعلوم فضا میں۔ ۔ ۔ دماغ اور دل میں محسوس نہ ہونے والی فضا میں۔

اس وقت جھونپڑے سے باہر ایک بنچ پر ان کے دادی اور دادا بیٹھے تھے، آفتاب کی آخری، سرخ اور سنہری شعاعیں گھنے درختوں میں سے گذر کر باغ میں آرہی تھیں۔ شام نہایت پرسکون تھی، مگر ایک مسلسل رونے کی آواز تھی۔ دونوں بوڑھی جانیں، مکر خمیدہ ایک دوسرے سے ملی بیٹھی تھیں، دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ اس طرح پکڑے ہوئے تھے جیسے زمانۂ دراز کے بعد یہ موقع ملا ہو۔ وہ دونوں آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے محروم تھیں اور کچھ بول نہ سکتے تھے۔

(ترجمہ)

محشر عابدی، بی اے، ایم۔ ایس سی (عثمانیہ)

نامۂ حبیب

کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں
کہ تم کو حسن کی نامہربانی سے شکایت ہے
تمہیں کچی کلی کی بے زبانی سے شکایت ہے
گنہ ناآشناؤں کی جوانی سے شکایت ہے
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

سنا ہی ضبط کو تم دل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوفِ رسوائی کو خود بینی سمجھتے ہو
یہ کیا سچ ہی مرے آنسو کو رنگینی سمجھتے ہو
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

جفا پرور اداؤں سے سنورنے کے ارادے ہیں
خدا کے، عرشِ الفت سے اترنے کے ارادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)

جھولا

ساون بھادوں کے دن تھے، دھرتی نے نیا روپ لیا تھا۔ کالے کالے بادل سینکڑوں سوانگ بدلتے، چہلیں کرتے، اِدھراُدھر دوڑتے پھرتے تھے، کبھی غصہ کی آندھی کی طرح تند اور پُرشور، کبھی بھرے ہوئے دل کی طرح اتھاہ، اور برس پڑنے پر تیار۔ زمین پر ہریالی کی موجیں اُٹھتی تھیں۔ مست ہوائیں آتیں۔ اور درختوں میں سے گاتی ہوئی گزر جاتیں۔ نیم کی چنچل پتیاں خوشی سے ناچ اُٹھتیں۔ کہنہ سال برگد بھی متانت سے سر ہلاتے پتوں میں چھپ چھپ کر بیٹھنے والے پپیہے، بیتاب ہوکر "پی ہو! پی ہو!" پکارتے اور ذرا دیر کو چُپ ہو جاتے، گویا اپنے "پی" کے جواب یا کم از کم اپنی صدائے بازگشت کے منتظر ہیں۔

میں سیول سروس کے امتحان مقابلہ سے فارغ ہوکر اپنے آبائی گاؤں میں انتظار کے دن گزار رہا تھا کبھی پرچوں کے نمبر جوڑتا، کبھی شکار کھیلتا، زیادہ تر چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ جی بہلاتا تھا۔ وہی گھر تھا، وہی فضا تھی، صرف دو چیزوں میں کچھ فرق معلوم ہوتا تھا۔ ایک تو آپا (میری والدہ) کی باتوں میں "لطیف اشارے" زیادہ ہوگئے تھے، دوسرے جمیلہ کے چہرے کی معصومیت پر کبھی کبھی مظلومیت کی چھاؤں آجاتی تھی۔

جمیلہ میری چچازاد بہن تھی۔ چچازاد کا یہ فرق ہمیں پہلے معلوم نہ تھا۔ اگر محلہ بھر کی بڑی بوڑھیاں اپنی ساری معلومات ایک سانس میں بیان کر دینے کے شوق میں بار بار اس کا ذکر نہ کرتیں، تو شاید یہ فرق محسوس بھی نہ ہوتا، اور نہ اتنی جلدی جمیلہ کو یہ معلوم ہوتا کہ اس کے ماں باپ بچپن ہی میں اسے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ ہم دونوں ایک ساتھ پلے اور بڑھے تھے۔ میرے مکان کے احاطے میں وہ نیم کا درخت اب بھی موجود ہے جس کے نیچے پلنگ پر بیٹھ کر ہم لوگ ساتھ ساتھ پڑھتے تھے، وہ دن بھی مجھے اب تک یاد ہے جب میری چھوٹی بہنوں سے سازش کر کے اس نے میری چڑیا جسے میں نے دن بھر کی محنت کے بعد پکڑ کر کتھے چونے کی مدد سے بلبل بنانے کی کوشش کی تھی، اڑا دی تھی، اور میں نے غصہ میں آکر ان تینوں کی گڑیاں مع اُن کے سارے جہیز کے گاؤں کے تالاب کی نذر کر دی تھیں۔ یہ بچپن کی باتیں ہیں۔ اب میں خیر سے سول سروس کے خواب دیکھتا ہوں، اور جمیلہ گھر کا سارا کام دیکھتی ہے، پانچ بجے صبح اُٹھ بیٹھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، سب کو ناشتہ کراتی ہے۔ وہ اب بھی آپا کی دست راست ہے، اور گھر کے سیاہ سفید پر اسکا اختیار ہے، لیکن اب وہ اگلی سی خوشدلی اس میں نہیں ہے، جب سے ہمسایہ گاؤں کے ایک معزز خاندان کی ماما کی آمد و رفت شروع ہوئی ہے اور آپا اس کے ساتھ سر جوڑے ہوئے کچھ "راز" کی باتیں کرنے لگی ہیں جمیلہ چپ چپ رہنے لگی ہے، دو ایک مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ ادھر اس ماما نے گھر میں قدم رکھا، اور اُدھر وہ آہستہ سے اُٹھ کر اپنے دالان میں چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی باتوں نے اس کے یتیمی کے احساس کو بہت تیز کر دیا ہے۔

برسات کا ایک نہایت پُرشور دن ہے۔ میری اصطلاح میں "برسات کا پُرشور دن" وہ ہوتا ہے جب بڑے بوڑھے بھی پائنچے ٹخنوں سے اونچے کئے "بسم اللہ، بسم اللہ" کہتے ہوئے، اپنے بچپن کی یاد میں، یا شاید اس کی تلاش میں ڈگمگاتے ہوئے کیچڑ پانی میں نکل پڑتے ہیں، یا جب نانی اماں "اپنی بتیسی بالائے طاق رکھ کر اپنی سب سے چھوٹی نواسی کو اس کی عام اجازت دے دیتی ہیں کہ وہ اُن کے پوپلے منہ میں دانت تلاش کرے، جب "کڑھائی" سارے گھر کا مرکز بن جاتی ہے اور بچوں کو شور مچانے اور ماماؤں کو بے وجہ بھی زور سے بولنے اور قہقہے لگانے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ میں سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا شکار سے واپس آیا، بچوں نے نیم کے درخت میں جھولا ڈالا ہے پہلے تو حسب دستور شکار کے متعلق مجھ سے

جرح کی، پھر ادھر سے مایوس ہو کر جھولنے کے لئے سر ہو گئے، نعیمہ نے کہا "اللہ بھائی جان آپ بھی جھولیے" سلیمہ نے تقاضا کیا "میرے اچھے بھائی جان مجھے جھلائیے" میں ان متضاد فرمائشوں سے بچنے کی آسان ترین ترکیب پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں میری نظر جمیلہ پر پڑی، دیکھا کہ درخت کا سہارا لگائے کھڑی ہے، میں نے پوچھا "کیوں جمیلہ جھولو گی" لڑکیوں نے شور مچا کر اس نئی تحریک کی داد دی "ہاں بھائی جان انھیں ضرور جھلائیے، یہ بہت ڈرتی ہیں" "اللہ جمیلہ آپا ہمارے کہنے سے صرف ایک دفعہ جھولے پر کھڑی ہو جائیے" میں نے دیکھا کہ جمیلہ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ واقعی جھولے سے بہت ڈرتی تھی، لیکن انکار نہ کر سکی، بچوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں، ہم دونوں کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ جمیلہ بہت ہچکچائی، ڈرتی ہوئی پٹڑے پر کھڑی ہوئی، دانت بھینچ لئے، آنکھیں بند کر لیں، رسیوں کو مضبوط پکڑ لیا۔ میں نے جھولنا شروع کیا۔

جھولا تیز ہوا، پینگ بڑھے، درخت کی ڈال لچکنے لگی، ہوا تیزی سے آنے جانے لگی، میری قمیص کے دامن اور جمیلہ کے دوپٹہ کے آنچل سے اُلجھ کر پھرنے اور سنسنانے لگی۔ جمیلہ آنکھیں بند کئے ہوئے جھول رہی تھی۔ خدا معلوم میرے دل میں کیا خیال آیا۔ میں نے ایک پینگ خاص طور پر بڑا لیا اور جب جھولا تیزی کے ساتھ واپس ہوا تو دوسری طرف مُنہ پھیر کر دھیمی آواز میں تین لفظ کہے "ہماری دلہن بنو گی" یا دش بخیر بہت دن پہلے، جب میں نو برس کا تھا اور وہ چھ سال کی، تو بڑے بوڑھوں کے اشارے سے سب کے سامنے یہ سوال اس سے کئی مرتبہ پوچھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اب اس عمر میں :: اپنے دل کی یہ قلابازی خود میری سمجھ میں نہ آئی۔

جمیلہ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چہرے پر خوف کے ساتھ ساتھ استعجاب کے آثار بھی تھے، مجھے غور سے دیکھنے لگی، میں بالکل بے تعلقی کے ساتھ جھولتا رہا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی، اپنی شرارت کی کامیابی پر بڑی خوشی ہوئی جھولا آہستہ آہستے ہوتے رک گیا۔ ہم لوگ اُتر پڑے بچے جھولنے لگے، لیکن جمیلہ وہاں سے ہٹی نہیں، کھڑی رہی بچے جھول چکے تو مجھ سے بہت رک رک کر کہنے لگی "بھائی جان کیا ایک مرتبہ ... اور ... نہ جھولیے گا" میں نے مصنوعی تعجب کے انداز سے اس کی طرف دیکھا تو جھینپ کر کہنے لگی "نعیمہ سلیمہ اکثر جھولنے کے لئے ضد کرتی رہتی ہیں میں چاہتی ہوں کہ میرا ڈر نکل جائے"

بچوں نے پھر شور مچایا، جھولا پھر چلا، ڈالیاں پھر لچکنے لگیں، ہوا پھر سائیں سائیں کرنے لگی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کہ اب جمیلہ ہمت کرکے آنکھیں کھولے ہوئے ہے، میرے چہرے پر برابر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ گویا یہ فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ پہلی مرتبہ جو الفاظ اُس نے سنے تھے، وہ میں نے کہے تھے، یا ہوا کی سائیں سائیں اور جھولنے کی گھبراہٹ میں لیے دھوکا ہوا تھا۔ میں اسی طرح بے تعلقی سے جھولتا رہا اور ایک پینگ خاص طور پر اتنا لمبا لیا کہ جمیلہ نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں اور میں نے پھر وہی تین لفظ ایسی آواز میں کہے کہ ہوا انھیں اس کے کانوں تک پہونچا دے۔ اب اس کے چہرے پر سرخی جھلک اُٹھی، تعجب کے ساتھ کسی قدر خوشی کی دھوپ چھاؤں بھی آگئی۔ پھر اُس نے پوری کوشش سے میرے قیافے سے پتہ لگانا چاہا۔ لیکن میں اسی طرح بے تعلقی کے ساتھ جھولتا رہا۔

اب جمیلہ خود فرمائش کرکے جھولنے لگی ہے، یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ تین لفظ جو محض میری شرارت کا نتیجہ تھے اس کے سازِ ہستی کے کن تاروں کو چھیڑتے ہیں، لیکن یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب اسے ان کے سننے کی عادت سی ہوگئی ہے اس کے خوف کا وہی حال ہے، جھولے پر قدم رکھتے ہی اس کا رنگ اڑجاتا ہے۔ ہونٹ کانپتے ہیں۔ لیکن اُن لفظوں کے متعلق یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ میں نے کہے تھے یا نہیں، وہ ہمت کرکے جھولنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی پیاس کا مارا، پانی کی تلاش میں گھنے اور ڈراونے جنگل میں بھی چلا جاتا ہے۔ ایک دن دوپہر میں، میں نے دیکھا کہ وہ اکیلی جھولے کے پاس کھڑی ہے اس نے اشارے سے ماما کو بلایا۔ اس سے کہا کہ خوب زور سے پینگ دو۔ اکیلے جھولنے کا جمیلہ کی عمر میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ خوف کے آثار پہلے سے کہیں زیادہ اُس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ لیکن محض یہ معلوم کرنے کی فکر میں کہ جب میں اس کے ساتھ نہ ہوں، تو وہ لفظ اسے سنائی دیں گے یا نہیں، وہ بہت دیر تک اکیلی جھولتی رہی، اُتری تو بہت نڈھال تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک وہ معمہ حل نہیں ہوا۔

برسات ختم ہوگئی، جھولا اُتر گیا۔ جمیلہ نے کچھ کہا نہیں، لیکن میں نے محسوس کیا کہ اسے افسوس ضرور ہوا، تخیل کا فریب ہی سہی، لیکن اب وہ لفظ اس کے کان میں نہ پڑیں گے، وہ اب پھر ویسی ہی خاموش ہوگئی ہے۔ بعض اوقات نظریں بچا کر مجھے ایک خاص انداز سے دیکھتی ہے، میری آواز پر کان رکھتی ہے کہ شاید لہجہ کا کوئی

فرق، آواز کا کوئی لوچ اب بھی اس کے شبہ کو یقین سے بدل دے، لیکن شاید اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

ان باتوں کو چار پانچ مہینے ہوگئے۔ اب بسنت رت ہے۔ کھیتوں میں ہر طرف سرسوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ زور شور کی آندھیاں آنے لگی ہیں جیسی مارچ میں اکثر آتی ہیں۔ جمیلہ اپنے دالان میں اکیلی بیٹھی ہے۔ آندھی سے سارے گھر کے دروازے زور سے کھلتے بند ہوتے ہیں، صحن میں جامن کا درخت زمین تک جھک جھک کر سیدھا ہوتا ہے، میں ادھر سے جا رہا تھا، شرارت کا ایسا موقع بہت دنوں سے نہیں ملا تھا، جیسے ہی آندھی کا ایک جھونکا بہت تیزی سے ادھر سے اُدھر گیا، میں نے وہی تین لفظ اس "صبا رفتار" قاصد کے سپرد کر دیئے، جمیلہ چونک پڑی، چہرے پر پھر مسرت جھلک اٹھی بیتاب ہو کر صحن میں نکل آئی، غور سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ آندھیاں اسی طرح فراٹے بھرتی ہوئی، گرجتی اور غراتی آ جا رہی تھیں جمیلہ صحن میں اکیلی کھڑی تھی، لیکن اس کے لئے اب اُن کے پاس کوئی پیغام نہ تھا۔ اس کے چند روز بعد میرا نتیجہ آگیا، میں سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا، اور ٹریننگ کے لئے چلا گیا۔

ان باتوں کو اب پانچ سال گزر چکے ہیں۔ گاؤں کے تالاب کئی مرتبہ بھر بھر کر سوکھ چکے ہیں۔ ہماری زندگیوں کی کشتیاں بھی اپنے الگ الگ دھاروں پر بہتی چلی جا رہی ہیں جمیلہ کی شادی تین برس ہوئے ہو چکی ہے، میں بھی شادی شدہ ہوں، چھٹیوں میں کبھی کبھی اُس سے ملنے کا اتفاق ہو جاتا ہے، اب وہ کچھ موٹی ہوگئی ہے، دو بچوں کی ماں ہے، اس کی بات چیت کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ کچھ مدافعانہ، کچھ جارحانہ، جیسا کہ غریب رشتہ داروں کا امیر رشتہ داروں کے ساتھ اکثر ہو جاتا ہے، میں نے دو ایک مرتبہ اس سے پہلی مرتبہ جھولا جھولنے کا ذکر چھیڑا، وہ نہ چونکی، نہ جھینپی، نہ مسکرائی۔ بے تعلقی کے ساتھ ایک ایک بات یاد کر کے بیان کرنے لگی۔ ان باتوں کے متعلق ہم سب کا طرز عمل وہی ہے جو ہم سب کا بڑے ہو کر اپنے بچپن کے کھیلے ہوئے کھلونوں کے ساتھ ہوتا ہے، جب ہماری مائیں یا بڑی بہنیں صندوقوں میں سے بڑی حفاظت کے ساتھ کپڑے میں لپٹا ہوا کوئی مٹی کا گھوڑا ہمیں دکھاتی ہیں تو ہم "عقلمند اور تجربہ کار" لوگ ایک خاص انداز سے مسکراتے ہیں گویا تعجب کرتے ہیں کہ کیا ہم کبھی اتنے بیوقوف بھی تھے کہ ان مٹی کے

گھوڑے کو دانہ گھاس کھلاتے تھے، یا اُس کپڑے کی گڑیا کا منہ دھلاتے تھے؛ کچھ ایسا ہی حال میرا ابھی ہے، لیکن اب بھی جب برسات میں، میں اپنے ضلع کا دورہ کرتا ہوا کسی ایسے دیہات میں جا نکلتا ہوں جہاں کمسن لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ جھولا جھولتے ہوتے ہیں تو مجھے دفعتاً پانچ چھ سال پہلے کی وہ بات یاد آجاتی ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں نے وہ تین لفظ کیوں کہے تھے اور اس " دلگی " سے میرا مطلب کیا تھا۔

وہاج الدین بی-اے بی-ٹی

دورِ بنی امیّہ کی شاعری

عصرِ اموی میں شعر کی حالت بالکل ہی بدل گئی۔ شاعری ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ سیاست اور حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی جب لوگوں کی طرزِ معاشرت اور خیالات بدلتے گئے تو شاعری نے بھی پلٹا کھایا۔ اس عہد کے ان خصائص کو ہم اجمالاً بیاں کریں گے۔

جاہلیت کی شاعری کے متعلق "الشعر دیوان العرب" والا مقولہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن نزول قرآن کے بعد گویا عربوں سے شعر و شاعری کی روح ہی سلب کرلی گئی۔ رسول اکرمؐ نے بھی جاہلیت کی مفاخرت، منافرت اور ہجو وغیرہ کو مذموم قرار دیا تھا اس پر عصرِ راشدین میں سختی سے عملدرآمد ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جماعتی اختلافات کی تائید شاعروں کی مدد سے ہونے لگی۔

خلفا بنی امیہ نے جن کی عمارت خلافت کھوکھلی بنیادوں پر تھی شاعری کی مٹی پلید کی اہل بیت کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا اور اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کے لئے انھوں نے شاعروں کو مالامال کر دیا۔ اہل بیت کے طرفدار شعرا بھی موجود تھے انھوں نے بنی امیہ کے خلاف اپنے ساتھیوں کو اکسانا شروع کیا۔ اس جماعت بندی کا اثر اس عہد کی شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ اس سے نہ صرف تحریض و ترغیب کی ابتدا ظاہر ہوتی ہے بلکہ سیاسی ہجو اور

ایک دوسرے کی کمزوریوں کے اظہار کی ابتدا بھی یہیں سے ہوتی ہے۔

بنی امیہ کی سیاست کے پنپتے ہی قدیم عربی مفاخرت اور عصبیت پروری نے زندگی کی سانس لی ہر قبیلے کے شعرا ر اپنے پرانے عزو شرف اور حسب و نسب کو جگانے لگے اپنی آن بان کے مقابل میں دوسرے کو کمتر سمجھنا بالکل معمولی بات تھی۔ یہاں پھر ایک مرتبہ جاہلیت کی روح کارفرما ہوگئی۔

راشدین کے عہد میں بیت المال سے شاید ہی کسی شاعر کو شاعری اور مدح وغیرہ کے سلسلہ میں انعام و اکرام ملا ہو البتہ حطیئہ کی شکایات سن کر جو مشہور ہجو نگار شاعر تھا اس سے حضرت عمرؓ نے شرفا کی عزت کو کئی ہزار درہم دے کر خریدا تھا کہ وہ پھر کسی شریف کی ہجو نہ کرنے پائے بیت المال بنی امیہ کے پاس عوام کا مال برائے نام ہو تو ہو مگر اس پر شاہانہ تصرف انھیں کا ہو اکرتا جس کی معمولی سی مثال یہ تھی کہ ایک ایک مدحیہ قصیدہ کے عوض شاعر کو اُن کے دربار سے ہزارہا درہم و دینار ملا کرتے۔ شاعروں کو ان کی سزا کا اتنا خوف نہ رہتا جتنا کہ عطایا کے بند ہونے کا اسی لئے وہ ہمیشہ ان کے گن گایا کرتے تالیف قلوب کے لئے بھی انھوں نے لاکھوں دینار اور زر وجواہر کو پانی کی طرح بہایا یہی وجہ تھی کہ اس عہد میں شاعری بالکل ہی بدل گئی۔

بنی امیہ کے خلفار کو شاعری سے خاص دلچسپی تھی ان میں سے بعض شاعر بھی تھے مثلاً یزید بن عبد الملک اور عبد الملک بن مروان کے بہت سے اشعار کی آج بھی روایت کی جاتی ہے ان کے درباروں میں ہمیشہ اچھے اچھے شعرا رہا کرتے۔ شعر و سخن کی محفلوں کے انعقاد میں خود خلفار حصہ لیتے۔ شاعروں کی منہ مانگی مرادوں کو یہ پورا کرتے اور شاعری کے نقد و بحث میں بہت انہماک ظاہر کیا کرتے تھے۔ ایک ایک شعر کی صحیح روایت کو جانچنے کے لئے یہ دور دور کے شعراے مدد لیتے اور راویوں کی آمد و رفت کے شاہانہ اخراجات کے خود متحمل ہوتے۔

اس کے علاوہ شعر و سخن سے عوام کی دلچسپی بھی شاعری کی ترقی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ بصرہ اور کوفہ کے اسواق میں ہزارہا لوگ ان مجلسوں میں حصہ لیا کرتے۔ بصرہ کا سوق مربد جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس خصوص میں بے حد مشہور تھا۔ شاعروں کی ٹولیوں کی ٹولیاں یہاں ہر وقت معروف شعر و سخن رہا کرتیں۔

عصر اموی کے شعر کی خصوصیات جیسا کہ متعدد بار بیان کیا جاچکا ہے کہ شاعری پروردۂ ماحول ہوا کرتی ہے۔ زمانہ کی ہر کروٹ اور سیاست کے ہر تبدل کا عکس آئینۂ شاعری

پر منعکس ہوتا ہے ۔ عصر اموی کے مندرجہ بالا انقلابات کی راگنیاں آپ ہر شاعر کے کلام میں پائیں گے ۔

اسی عہد میں عربوں نے شہری زندگی میں وہ کچھ لطف محسوس کیا تھا جس سے اب تک ان کے کان بھی آشنا نہ تھے دوسرے قرآن شریف اور حدیثوں کی فصاحت و بلاغت میں وہ قند و نبات سے زیادہ شیرینی پاتے ان تاثرات کی وجہ سے ان کے کلام سے جاہلیت کی اجنبیت، تعقید اور مشکل پسند اسلوب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اور اس کے بجائے اس میں روانی سلاست اور سادگی آ گئی ۔

تشبیب کی اس زمانہ میں کثرت ہو گئی ۔ اکثر شعراء تو عاشق ہو کر دل کی داستانیں بیان کرتے ورنہ اس عہد کے اچھے سے اچھے شاعر کے لئے تشبیب بیان کرنا اتنا فرض ہو گیا تھا کہ بغیر عاشقی کے ہی عاشقوں کی سی کیفیات بیان کرنے کی سخت ضرورت تھی ۔ غزل گوئی اور تشبیب نگاری کا شوق اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ مرثیہ کی ابتدا تک تشبیب سے کیا کرتے مثلاً دریدبن الصمتہ نے اپنے بھائی کے مرثیہ کی ابتدا تشبیب سے ہی کی ہے ۔ اگر جاہلیت میں عشاق شعرا کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی تو اس عہد میں ان کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی ۔ یہ سب مال و دولت کی فراوانی اور آسودگی کا انجام تھا"

فتوحات کی وجہ سے مال غنیمت کثرت سے حاصل ہوتا ۔ اس کے ساتھ ہی ہزار ہا حسین عورتیں کنیزیں بن کر آئیں اور یہ مسلمانوں میں تقسیم ہوئیں ۔ روم اور فارس کی ان مہ جبینوں کو دیکھ کر شاعری کے سمند ناز پر تازیانے برس جاتے اور اب راشدین کی سخت گیری کا زمانہ بھی نہ رہا تھا کہ حضرت عمرؓ کی طرح کسی عورت سے تشبیب کرنے والے شاعر کو کوڑوں سے پٹوایا جاتا ۔ لہذا شاعروں نے کھلے بندوں غزل گوئی اور عاشقی کی داستانیں قلمبند کرنی شروع کیں ۔

تشبیب کے میدان میں امیروں اور سلاطین کی عورتوں سے لے کر معمولی درجہ کی عورتوں تک ایک ہی حال تھا عورتیں اپنے حسن پر ہمیشہ سے ناز کرتی چلی آئی ہیں اور ان کے حسن کی تعریف میں ملکوتی نغمے گانے والوں پر وہ کیوں نہ رجھتیں ۔ اس عہد کے شاعر بھی ایسے منچلے تھے کہ تشبیب کی گلروادی میں خلفاء کی بیویوں اور لڑکیوں تک کو کھینچ لاتے چنانچہ اس وقت یہ کہا جاتا تھا ۔

والغوانی یغرّھنّ الثناء

حسین عورتوں کی آنکھیں بند کرنے والی چیز تعریف ہی ہے

ولید بن عبدالملک کی بیوی سے یمن کے شاعر وضاح نے تشبیب کی جس پر وہ مارا گیا ۔ عبدالملک کی بہن محمد بن مروان

کی ماں سے تشبیب کرکے عمر بن ابی ربیعۃ نے اس کی شہرت کو آسمان پر پہونچا دیا۔ جس سے خوش ہوکر اس نے عمر ابی ربیعۃ کے پاس ایک ہزار دینار روانہ کئے لیکن شاعر نے یہ کہکر لینے سے انکار کیا کہ "تشبیب کی اجرت نہیں لی جاتی" —— ایسے واقعات اس زمانہ میں بالکل عام تھے۔

جاہلیت کے غرور اور دوسروں کی تذلیل نے یہاں یوں ترقی کی کہ ہجو کو آسمان پر پہونچا دیا گیا۔ ہجو اس عہد میں اتنی عام ہوگئی کہ اسے شاعری کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھا جانے لگا۔

سیاسی ہجو کا رواج اسی عہد میں ہوا۔ امویین کے مال و دولت سے فیض پانیوالے بہت سے شعراء سیاسی ہجو نگاروں کے ضمن میں آجاتے ہیں۔ خلفاء زر و جواہر نچھاور کرکے غنیم کی ہجو کراتے اور اپنی شان و شوکت پر پر اتراتے تھے۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے شعراء اور پھر مہاجرین اور انصار غرض ہر ایک جماعت کے شاعر دوسرے کی توہین پر کمر بستہ رہتے۔

سیاسی ہجو کے علاوہ ادبی مہاجاۃ کا سلسلہ بھی جاری رہتا جیسے کہ جریر و فرزوق اور اخطل کے درمیان ہوا کرتا —— اس کی ایک ادنی مثال اردو میں جرأت و انشاء اور انہیں دو بیری جماعتوں سے دی جاسکتی ہے

شراب کی تعریف کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔ جاہلیت میں اعشیٰ، عدی بن زید وغیرہ نے شراب کی تعریف میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ اس عہد میں اخطل نے ان کی جگہ لی۔ ولید بن یزید نے بھی اس میدان میں اشہب قلم کو جولانی دی۔

اس عہد کی شاعری میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا وہ عرب کے علاوہ دوسرے لوگوں کا شاعری کے میدان میں اترنا ہے جیسے کہ موالیوں اور اہل فارس نے کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد دوسری قوموں کے لوگ مسلمانوں کی تہذیب اور آداب سے اتنے متاثر ہوتے کہ ان کی ہر چیز کو اپنے لئے اختیار کر لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ شاعری میں بھی انھوں نے بے حد ترقی کی —— اس کا ذکر تفصیلاً عصر عباسی کی شاعری کے بیان میں آئے گا۔

مندرجہ بالا خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر ہم اس عہد کے چند مشہور شعراء کی زندگیوں کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کے خصائص پر سرسری نظر ڈالیں گے۔

مخضرمی شعرا

طبقات الشعرا کے ضمن میں مخضرمی شعرا کا مختصر بیان آچکا ہے ان میں وہ شعرا شامل تھے جن کی زندگی کا کچھ حصہ جہالت میں بسر ہوا تھا اور جو بعد میں ایمان لے آئے تھے یعنی انھوں نے جہالت اور اسلام دونوں زمانے دیکھے تھے۔ ان شعرا میں کعب بن زہیر، حسان بن ثابت، حطیئہ اور خنسا بہت مشہور ہیں جن کے مختصر حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

کعب بن زہیر

المتوفی ۲۴ھ

ان کا نام ابو عقبہ کعب بن زہیر بن ابی سلمی المزنی ہے۔ شاعری انھیں وراثتاً ملی تھی۔ باپ شاعر، چچا شاعر، ماموں، نانا، بھائی شاعر۔ غرض ان کے خاندان کے اکثر افراد عطیہ شاعری سے مالا مال کئے گئے تھے اسی لئے کعب نے شاعری اور ادب کے ماحول میں تربیت پاکر اپنی شاعری کی ابتدا کی جس کی وجہ سے فصاحت و بلاغت ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں کعب اور ان کے بھائی بجیر بکریاں چرایا کرتے تھے اور روزانہ آنحضرتؐ اور اشاعت اسلام کے قصے سنا کرتے ایک مرتبہ بجیر نے آنحضرتؐ سے ملنے کے شوق میں کعب کو چھوڑ کر شہر کی راہ لی۔ آنحضرتؐ سے ملنے اور ان کی میٹھی میٹھی باتیں سننے کے بعد انھیں بھائی کے روکنے اور منع کرنے کا کچھ خیال نہ رہا اور انھوں نے سب سے بے نیاز ہوکر اپنے ایمان کو اسلام کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا۔ بھائی کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے ان کی اور آنحضرت صلعم کے دین کی ہجو کہی جس کا ایک شعر یہ ہے :-

على مذهب لم تلف اما ولا ابا	عليه ولم تعرف عليه اخا لكا

یعنی افسوس تم نے ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس کا علم نہ تمہاری ماں کو تھا اور نہ باپ کو اور نہ جس کو تمہارا بھائی جان سکا تھا۔

ان ہجویہ اشعار کو سن کر آنحضرتؐ نے ان کا خون مباح فرما دیا۔ اس نازک موقع میں ان کے عزیز دوستوں اور رشتہ داروں نے بھی ان کی مدد سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اب ان کی پریشانی اور خوف کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس اثنا میں ان کے

بھائی بجیر نے آنحضرتؐ کے پاس آنے اور ان سے معافی چاہنے کی ترغیب کی اور سمجھایا کہ رسول اللہؐ جیسی حلیم اور عفو نواز ہستی سے یہ بعید نہیں کہ وہ تمہاری خطاؤں کو درگذر کر دیں۔

کعب کو یہ نصیحت پسند آئی اور انھوں نے ایک قصیدہ آنحضرتؐ کی شان میں کہہ کر لوگوں سے چھپتے چھپاتے آئے اور طالب امان ہو کر آنحضرتؐ کے سامنے اپنا قصیدہ سنانے لگے جس کا مطلع یہ ہے :-

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول　　متیم اثرھا لم یفد مکبول

یعنی سعاد (ان کی محبوبہ) مجھ سے جدا ہو گئی جس سے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کی حالت ایسی بے بسی اور قید کی ہو گئی کہ جسے فدیہ دے کر بھی رہا نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اس قصیدہ کے جب اس شعر پر پہونچے :-

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　مھند من سیوف اللہ مسلول

یعنی رسول خدا ایک جگمگانے والے نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور وہ خدا کی تیز قاطع شمشیروں سے ایک برہنہ ہندی شمشیر ہیں۔

تو آنحضرتؐ نے انہیں ردائے مبارک عطا فرمائی۔ اس چادر کو ان کے بعد انکی اولاد سے حضرت معاویہؓ نے ۴۰ ہزار درہم دے کر خرید لیا اور عرصہ دراز تک یہ سلاطین کی تخت نشینی کے موقعہ پر اوڑھنے کے کام آتی رہی۔

یہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء میں سے تھے۔ لطیف تشبیہات اور عمدہ استعارات کے استعمال میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کے کلام میں تشبیہات اور کنایوں کی کثرت کی وجہ سے کچھ تعقید پائی جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کی شان میں تحریر کردہ ان کا متذکرہ بالا قصیدہ ادب میں بہت اہمیت رکھتا ہے حتیٰ کہ ان کے اس قصیدہ کو اس کے ابتدائی حروف یعنی "بانت سعاد" ہی کا نام دیا گیا ہے۔ فطری شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے کلام میں وہ سارے امتیازات اور وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس عہد کے مشہور شعراء میں — بلکہ جاہلیت کے عمدہ شاعروں میں بھی پائی جاتی تھیں۔

حسان بن ثابت

المتوفی ۵۴ھ

ان کا نام حسان بن ثابت اور کنیت ابو الولید ہے۔ یہ انصاری تھے۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور جاہلیت میں پرورش پائی اور شاعری کے لالہ زار میں انھوں نے زندگی کی سانس لی۔ ابتدائی زندگی میں منذر اور غسان کے سلاطین کی طرح اور ان کے تحائف بھی قبول کرتے رہے آل جفنۃ کی تعریف میں انھوں نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کرڈالا جس کے عوض انھیں مال و دولت کا بے شمار حصہ ہاتھ آیا۔ ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی انھوں نے تحائف کے بھیجنے میں کمی نہیں کی اور قسطنطنیہ سے ان کے قاصد برابر اونٹوں پر مال و دولت لادکر لے آتے۔

آنحضرت صلعم جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تو انھوں نے انصار کے ساتھ اسلام قبول کیا اور آنحضرتؐ کی مدح میں اپنی شاعری کے ترنم ریز رباب کو چھیڑا لیکن ان کا سب سے زبردست کارنامہ قریش کے حامی کفار شعراء کے مقابل میں اترنے کا رہا۔ جب آنحضرتؐ کے خلاف وہ لوگ پیش کیا کرتے تو آنحضرتؐ حسان کو حکم دیتے کہ ان کا دنداں شکن جواب دیں۔ آنحضرت کے اس قول پر کہ "ان کی ہجو کرو روح القدس تمہاری مدد پر رہیں گے" حسان اپنی شاعری کے سمند باد پا کو مہمیز کرتے اور دشمنوں کا ہجو سے جواب دیتے۔ اس کی وجہ سے انکی شہرت سارے عرب میں پھیل گئی اور ان کے شعری کمالات کا لوہا مان لیا گیا۔

ان کے اخراجات کے لئے بیت المال سے انھیں کافی رقم مل جاتی اور یہ بڑے آرام سے اپنی زندگی بسر کرتے۔ انھوں نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی اور ۵۴ھ میں انتقال کیا۔

حسان قوی القلب اور بہادر نہیں تھے لیکن فخر اور حماسہ میں بھی انھوں نے قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ مدح اور ہجا ہی پر ان کی مایۂ ناز شاعری کا دارومدار ہے۔ ان کے الفاظ نہایت پُرشکوہ اور رعب دار ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی شاعری غلطیوں سے مبرا نہیں۔ ان کے ایک قصیدہ کے صرف مطلع میں خنساء نے جس کا بیان آگے آئے گا، متعدد نقائص نکال کر انھیں شرمندہ کیا تھا۔ تاہم مخضرمین میں ان کی بڑی قدر و منزلت

کی جاتی ہے۔

خنسا سُلمیہ

المتوفاۃ ۲۴ھ

اہل نجد کے قبیلہ قیس کی شاخ تمیم سے خنسار کا تعلق تھا۔ اس کا نام تماضر بنت عمرو بن الشرید ہے۔ خنسار کا لقب اتنا مشہور ہوگیا کہ لوگ اس کا نام بھی بھول گئے۔ یہ سردار قبیلہ کی لڑکی تھی اور خود بھی بہت بہادر اور الوالعزم واقع ہوئی تھی اس کے دونوں بھائی صخر اور معاویہ بھی سرداران قبائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عز و شرف کی بلندی حسب و نسب کی اچھائی اور حکومت و سیادت کی وجہ سے عربوں کے عام فخر و غرور کے علاوہ اس کے کلام میں رفعت اور بلندیٔ خیال کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔

اس کے حسن و جمال اور علم و ادب سے متاثر ہو کر قبیلہ ہوازن کے ذی مرتبت سردار اور حشم کے مایہ ناز شہسوار دُرید بن الصمۃ نے اس سے شادی کرلی لیکن شوہر اور اس کے قبیلہ کی محبت اس کے دل میں کوئی جگہ پیدا نہ کرسکی۔ اس کی آزادیٔ روح اور فطری جوش کے سیلاب میں کسی جذبہ یا ماحول کی وجہ سے رکاوٹ پیدا نہ ہوسکی۔ وہ آزاد پیدا ہوئی اور عمر بھر آزاد رہی۔

شاعرہ تو یہ فطری تھی۔ اس کے اشعار میں ابتدا ہی سے لوچ اور رقت پائی جاتی تھی لیکن اس کی شاعری کی دنیا میں انقلاب اس کے بھائیوں کی موت کے بعد ہی آیا۔ اس کے دونوں بھائی صخر اور معاویہ مارے گئے اور خنسار نے ان کی موت پر وہ رونا رویا اور آنسوؤں کے وہ سیلاب بہائے کہ آسمان بھی اپنی بے مائگی پر آج تک ندامت کے آنسو بہاتا ہے۔

اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بھائیوں سے بے حد محبت کرتی تھی اور خصوصاً صخر سے۔ صخر نے ہر مشکل وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ ہر معاملہ میں اس نے بہن کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کی تھی اور تحفہ تحائف سے ہر وقت بہن کو خوش کرنے کی فکر کیا کرتا تھا۔ ان باتوں کا خنسار کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ اس نے ساری عمر کے رونے دھونے کو بھی اس کی عنایات کے کم ترین بدلے سے بھی کمتر خیال کیا۔

اسلام کی آمد کے ساتھ ہی اس نے آنحضرتؐ کی خدمت میں اپنے قبیلہ کے ساتھ آکر بطیب خاطر اسلام قبول کیا اور سچے دل سے محاسن اسلام کی شیدائی ہوگئی چنانچہ قادسیہ کی جنگ میں اس نے اپنے لڑکوں کو غیرت دلاکر میدان جنگ میں روانہ کیا جہاں اس کے چار بیٹوں نے ایک ہی دن جام شہادت نوش کیا لیکن اس کی دلیری بہادری اور صبر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ اس نے منہ سے آہ تک نہ نکالی۔

اس اولوالعزم عورت پر صدہا مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ شوہر نے اس کی مدد نہ کی اور نہ یہ اس کی خواہاں تھی۔ بیٹے جنگ میں ہلاک ہوئے اور دوسری تکلیفیں اسے اٹھانی پڑیں لیکن ان سب کا مقابلہ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کیا۔ لیکن آخری عمر تک بھائیوں کی موت پر اس کا رونا کم نہ ہوا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ اس سے گفتگو کی اور چاہا کہ اسے رونے دھونے سے باز رکھیں اور ان حرکات کو اسلامی تعلیمات کے خلاف دکھلایا لیکن اس پر اثر کہاں اس نے اور شدت سے آہ و زاری شروع کی اس پر انھوں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ بہرحال کوئی شخص اس کے غم واندوہ میں چارہ ساز نہ بن سکا۔

روتے روتے اس کی آنکھیں سفید ہوگئی تھیں اور اس کی شکل وصورت بالکل ہی بدل گئی تھی بالآخر اسی حالت میں ۲۴ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔

خصوصیات شاعری

عہد جاہلیت میں اور اسلام کے بعد کسی زمانہ میں بھی بلحاظ سوز و گداز اور اضطراب خنساء کی شاعری کا جواب نہیں پیش کیا گیا۔ سلاست روانی اور آمد اس کے کلام میں ابتدا ہی سے تھی اس پر مستزاد اس کے دکھی دل کی تڑپ اور یاس آگیں ماحول کی جراحت لوازی سے ایک خاص کیفیت اور ایک مخصوص رنگ پیدا ہوگیا جو عرب کی ایک نازک خیال اور طلیق اللسان شاعرہ کے لئے سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ فخر اور مرثیہ نگاری میں مردوں میں کم اور عورتوں میں اس کا جواب کوئی نہیں۔ اس کے اشعار دل کی عمیق گہرائیوں کے درد کی پراثر آوازیں ہیں جو سنگدل سے سنگدل انسان کے دل پر بھی بغیر اثر کئے نہیں رہ سکتے۔ اس کے اشعار دیکھ کر ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے اس کے جاہلیت میں پرورش پائے ہوئے دل پر ذرہ برابر اثر نہیں کیا۔

الحطیئۃ
المتوفی ۵۹ھ

اس کا نام جرول بن اوس عیسیٰ اور کنیت ابو ملیکہ ہے۔ بنی عیسیٰ میں پیدا ہوا لیکن قسمت کی گردش نے بچپن ہی سے وہ رنج و مصائب میں مبتلا رہا۔ سب سے پہلے تو اس کے نسب ہی میں خرابی تھی حسب و نسب کی کمزوری اس زمانہ میں انسان کی ترقی کی راہ میں بے پناہ مصائب کی حامل ہوتی چنانچہ حطیئۃ بھی اسی کمزوری کی وجہ سے انگشت نمائی کا مرکز بن گیا اور سماج میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

جس شخص کو معاشرت ہمدردی اور عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی اس کے دل میں فطرۃً سماج سے بدلہ لینے اور اس کے افراد کو رنج پہونچانے کا جذبہ کارفرما ہوجاتا ہے چنانچہ حطیئہ نے بھی اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دیا اس کے علاوہ اپنی زندگی گزارنے اور حیات کی تکالیف کا مقابلہ کرنے کا سوال بھی درپیش تھا چونکہ اس کے کام اور اس کی محنت کی بھی سوسائٹی میں کوئی قدر نہیں تھی اس لئے ان دونوں سوالوں کا حل اس نے اپنی خداداد قابلیت یعنی شاعری کے بل بوتے پر کرنا چاہا۔

شاعری ہی کے ذریعہ جس کا ایک وافر حصہ قدرت نے اسے عطا کیا تھا، اس نے اپنی معاش کے حاصل کرنے اور سماج سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ حطیئہ سے لوگوں کی نفرت کی اور بھی کئی وجوہات تھیں جن میں اس کی بدصورتی بدخلقی، بدظنی، بخل، بددینی اور بدنفسی کو بھی بڑا دخل ہے۔ نحوست اس کو پیدائش سے گھیرے ہوئی تھی۔ لڑائی جھگڑا اس کی فطرت میں داخل تھا، نیکی کرنے والے کے ساتھ فوراً برائی سے پیش آنا اس کی فطرت ثانیہ تھی۔

لوگوں کی انگشت نمائی سے بچنے اور اپنی شخصیت کی حفاظت کے لئے اس نے مدافعت میں ہجو گوئی اختیار کی یہ متزلزل عقاید کا شخص تھا اور برائی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسلام قبول کیا لیکن کچھ دن بعد مرتد ہوگیا۔ پھر ایمان لے آیا لیکن عقیدہ کی پختگی اسے مرتے دم تک حاصل نہ ہوسکی۔

اس کی ہجو کا لوگوں کو اتنا خوف تھا کہ اس سے بچنے کے لئے اس کی منہ مانگی مراد پوری کرتے۔ قبائل اپنی عزت کے تحفظ کے لئے اسے بیشگی رقم ادا کرکے پیچھا چھڑاتے۔ یہ جہاں جاتا وہاں ہر شخص اپنے ننگ و ناموس کے

بچاؤ کے لئے کچھ نہ کچھ دے دیتا اور یہ بھی ایسا دنی النفس تھا کہ نیکی کرنے والوں کی ہجو سے باز نہ آتا چنانچہ یہ حضرت عمرؓ کے گورنر زبرقان بن بدر کی ہجو کرنے سے بھی باز نہ آیا جنھوں نے اس کی دستگیری کی تھی۔

زبرقان بن بدر نے حضرت عمرؓ کے پاس اس کے رویہ کی شکایت کی، حضرت عمرؓ نے اسے قید میں بھجوادیا یہاں سے اس نے ان کی خدمت میں توبہ نامہ روانہ کیا اور آئندہ سے ایسی حرکات نہ کرنے کی معافی چاہی قید سے چھوٹا لیکن اس کی روش میں کوئی فرق نہ آیا۔

یہ اپنے آپ کو بڑا منحوس خیال کرتا تھا۔ اس کی ہجو گوئی کا دائرہ اوروں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس نے خود اپنے خاندان اور قبیلہ تک ہجو کی اور اس کا یہ ضبط یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ اس نے ماں، باپ کی ہجو کہی اور بالآخر خود اپنی ہجو سے بھی باز نہ آیا۔

ان واقعات کو سنکر حضرت عمرؓ نے اس سے باقاعدہ ایک معاہدہ کیا اور یہ طے کر دیا کہ تین ہزار درہم لے کر وہ عمر بھر ہجو گوئی سے باز رہے گا (بعض پانچہزار بھی کہتے ہیں) اور اس طرح انھوں نے مسلمانوں کی عزت کی حفاظت کی اور اب اس نے مجبوراً ہجو گوئی بند کر دی لیکن اس کی فطرت کو کون بدل سکتا تھا حضرت عمرؓ کے انتقال تک تو خاموش رہا لیکن ان کے انتقال کے ساتھ ہی پھر اپنی اسی روش پر چل کھڑا ہوا

خصوصیات شاعری

حطیئہ فطری شاعر تھا، شاعری کے اس سرمایہ کے مطالعہ سے جو اس نے اپنی باقیات میں چھوڑا ہے اس کی شعری قوتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
اس کی شاعری کے موجودہ ذخیرہ کی بنا پر اگر اس عہد کے مشہور شعراء کے صف اول میں نہیں تو دوسری صف کے شعراء میں پیش پیش رہے گا۔

ہجو گوئی کے باعث ہی حطیئہ کا نام پیچھے پڑ گیا ورنہ بلحاظ شاعری تاریخ ادب میں اس کا نام بے حد ضروری ہے۔

اسلامی شعراء

اسلامی شعراء سے مراد جیسا کہ طبقات الشعراء میں ذکر کیا گیا ہے وہ شاعر ہیں جو عہد رسالت سے لے کر خلافت بنی امیہ کے اختتام تک ہوئے۔ تاریخ ادب میں کسی زمانہ کا تعین کسی خاص سنہ سے کرنا نہایت مشکل ہے۔

اس لئے کہ ادبی پیداوار اور کسی عہد کے سارے ادیبوں اور عالموں کا خاتمہ ایک ہی سال میں نہیں ہوا کرتا بلکہ یہ سلسلہ تو یونہی جاری رہتا ہے صرف کسی مشہور واقعہ یا انقلاب انگیز زمانہ ہی سے تاریخ ادب کے دور مقرر کرنے میں مدد لی جاتی ہے اسی لئے ہم یہاں عہد رسالت سے لے کر بعد کے پورے شعرا کی تقسیم ایک علحدہ گروہ میں کرتے ہیں جسے "اسلامی شعرا" کے گروہ سے منسوب کریں گے اسی گروہ کے مشہور شعرا میں جمیل بن معمر عمرو بن ابی ربیعۃ، راعی، اخطل، جریر، فرزدق اور طرماح بن حکیم ہیں جن کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کا اجمالی حال یہاں پیش کیا جائے گا۔

جمیل بن معمر
المتوفی ۸۲ھ

قبیلۂ بنی عذرۃ کے اس پروردۂ حسن وعشق شاعر کا نام جمیل بن عبداللہ بن معمر ہے۔ قبیلۂ بنی عذرۃ حسن وعشق کی رنگین رومانیوں کے سلسلہ میں پہلے ہی سے مشہور تھا اس میں جمیل جیسے حساس شاعر کا پیدا ہوجانا پس سونے پر سہاگہ ہوا۔ طبیعت ابتداء سے شاعری کی طرف مائل تھی اس پر مستزاد وادی قری میں بثینہ سے پہلی ملاقات کا ہونا اور عشق کے دیوتا کا ان کے دلوں کو محبت کے سنہرے تیروں سے زخمی کرنا ہے۔ الفت کی پینگوں کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری کم وکیف حیات کی چاشنی اور کلام کے سحر اثر میں بھی اضافہ ہوتا چلا۔

بثینہ سے جمیل کی محبت گنگا جل کے نرمل دھارا کی طرح پاک، بے لوث اور سچی تھی عرب کے قدیم دستور کی بناء پر شادی سے پہلے ان دونوں کی محبت کے چرچے ہوجانے کی وجہ سے ان کی شادی ناممکن تھی اس ستم انگیز رسم کی وجہ سے جمیل اپنی محبوبہ کے دائمی وصل سے محروم ہوکر دائمی ہجر کے صدمے اٹھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور بثینہ کی شادی توبۃ نامی ایک شخص سے کر دی گئی۔

بثینہ کی شادی ہونے کے باوجود ان کی محبت کے دریا کی روانی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اور الٹا اس میں جوش اور تیزی پیدا ہوگئی۔ زمانہ کی اس روش کا جمیل کے دل ودماغ پر نہایت گہرا اثر پڑا چنانچہ اس کی شاعری ان سے متاثر ہوکر کندن کی طرح جگمگانے لگی

جمیل کو اسی لازوال عشق کی بنا پر" امام المحبین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ اپنی شاعری میں اس نے جن لطیف جذبات اور نازک حسیات کو بیان کیا ہے ان کی بنا پر اور میدان عاشقی میں صبر و شکر وفا کیشی اور دل سوزی سے اس نے ان مصائب کا مقابلہ کیا ہے ان کی وجہ سے اگر اسے عاشقوں کا امام کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں

خصوصیات شاعری جمیل کو سوائے الفت کے رنگین ترانوں کے گانے کے اور کچھ کام نہ تھا۔ میدان عشق میں اترنے کے بعد نہ اسے فخر و غرور کا خیال باقی رہا تھا اور نہ عزت و ناموس کا ڈر۔ جمیل کے سچے خیالات اور حقیقی جذبات کی روح اس کے ایک ایک شعر سے ٹپکی پڑتی ہے۔ جو شیرینی اور دلکشی اس کے اشعار میں ہے اس کا جواب اس عہد کے معدودے چند شعرا میں مل سکتا ہے۔

ثبینہ کی دلکش تصویر اس کے دماغ سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتی۔ ثبینہ کے قبیلہ کے ساتھ ساتھ وہ تو لا آوارہ گردی کرتا ہے بالآخر یمن اور شام سے گزر کر وہ مصر پہونچتا ہے۔ یہاں بھی وہ یہی گنگناتا ہے ؎

گو میں رہا رہین ستمہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اور اسی عالم میں وہ ۸۲ھ میں انتقال کرجاتا ہے۔

عمرو بن ابی ربیعۃ

۲۳ھ تا ۹۲ھ

قریش کی شاخ مخزوم کے اس نسیب گو شاعر کا نام عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعۃ اور کنیت ابو الخطاب ہے یہ مدینہ میں اسی رات میں پیدا ہوا جس رات کو حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا اسی سلئے کہا گیا کہ ,,حق اٹھا لیا گیا اور باطل بھیجا گیا۔

اس کا باپ آنحضرت کے عہد ہی سے گورنر تھا اور حضرت عثمانؓ کے عہد تک گورنر رہا یہی وجہ تھی کہ جب عمرو بن ابی ربیعۃ کی آنکھ کھلی تو عیش و عشرت کے سامان مہیا تھے۔ مال و دولت کی کمی نہیں تھی اور اسے ماحول بھی ملا تو حسن و عشق کی دنیا میں لے جانے والا گویا طبیعت کی افتاد ہی ایسی پڑی جسے لازمۂ شاعری کہا جائے۔

شاعری کا خداداد ملکہ میٹھی لوریوں کی شکل میں اس کے کانوں میں گونجتا رہا اسی لئے اس نے بسم اللہ شاعری ہی کی پڑھی۔

تھوڑا عرصہ بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ اس کے اشعار بڑے بڑے شعرا کے لئے بھی سامان لطف و لذت مہیا کرنے لگے۔ اپنے ایک خاص رنگ اور ایک مخصوص اسلوب کی بنا پر بہت جلد اسے بڑے شعرا کی صف میں شامل کر لیا گیا۔

عیش پسند طبیعت، ماحول کی رنگینی اور درد آشنا دل کی شوخیوں کی وجہ سے غزل گوئی اور نسیب اس کی فکر طبع کا میدان قرار پایا۔ شریف اور عالی نسب عورتوں سے اپنے اشعار میں تشبیب کرنے میں شاید ہی کسی نے اس سے زیادہ دلیری دکھائی ہو۔ جس طرح ہجو میں حطیئہ نے امیر غریب، شریف اور وضیع سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا اسی طرح تشبیب میں عمرو نے خلیفہ اور امرا کے حرم اور لڑکیوں سے لے کر راستہ پر جانے والی ہر دلکش صورت کے ساتھ ایک ہی سلوک روا رکھا۔

بڑے بڑے لوگ جہاں اس کے اشعار سن کر خوش ہوتے اور داد دیتے تھے وہیں خائف بھی رہتے کہ کہیں اپنی بہو بیٹیوں کا ذکر بھی اسی طرح منظر عام پر نہ آجائے۔ ہر حسین عورت اس سے لرزاں رہتی۔ آئے دن اس قسم کی شکایتیں سن کر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اسے یمن کے در حبشہ کے درمیان بحر احمر کے کسی دور افتادہ جزیرہ میں قید کر دیا۔ یہاں کی تکالیف سے تنگ آکر اس نے اپنی روش سے باز آنے کی قسم کھائی تب کہیں جا کر اُسے رہائی ملی۔

آخری عمر اس نے پاکبازی اور زہد و طاعت میں بسر کی۔ ستر سال کی عمر پا کر ۹۳ھ میں اس نے انتقال کیا۔

خصوصیات شاعری اس کے اشعار میں فطری ہیجان اور جوش کی جھلکیاں ہر جگہ نمایاں ہیں سلیس الفاظ اور آسان ترکیبوں سے اس کا کلام مملو ہے۔ وصف خوب بیان کرتا ہے۔ اس کے اشعار میں ایک ترنم ہے ابن جریج کہتا ہے کہ "ہودجوں میں رہنے والی شریف اور عالی نسب حسین خواتین کے لئے عمرو بن ابی ربیعۃ کے اشعار سے بڑھ کر کوئی شے خطرناک نہیں"

عورتوں کی تعریف و توصیف میں اس نے سارا زور قلم صرف کیا ہے۔ غزل گوئی میں خود کلامی کے علاوہ اس نے بعض بہترین مکالموں کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

سراپا کی دلکش مرقعوں کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپ گفتگو اور میٹھی میٹھی باتوں کی نقل اُتارتا ہے نیز اپنے کردار اور افعال کو صاف اور صریح انداز میں بیان کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔

اخطل
المتوفی ۹۵ھ

تغلب کے اس جلیل القدر شاعر کا نام غیاث بن غوث بن الصلت اور کنیت ابو مالک ہے۔ اپنے قبیلہ کے اکثر لوگوں کی طرح یہ بھی نصرانی تھا ماں باپ نے اس کی تربیت پر کوئی توجہ نہ برتی جس کے سبب یہ بدکردار اور بدخلق نکلا۔ پرلے درجے کا شرابی تھا۔ دن رات اسے سوائے نشہ بازی کے اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ جزیرہ میں جہاں یہ پیدا ہوا تھا وہاں سے نکل کر حیرہ میں رہنے لگا۔

فطرۃً شاعری پر اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ اوائل عمر میں تغلب کے ایک اور شاعر کعب بن جعیل سے اس کی نوک جھونک ہوئی اس نے کعب کی ایسی ہجو لکھ ماری کہ وہ غریب ہمیشہ کے لئے شاعری کے میدان سے غائب ہوگیا اسی دن سے اخطل کا ستارہ چمکنے لگا اور اس کی شہرت پھیلتی گئی۔

اس کے آسمان شہرت پر مہر نیمروز کی طرح چمکنے کا بڑا سبب خلفائے بنی اُمیہ کی سرپرستی ہے اپنی مطلب برآری کے لئے ایک موقع پر یزید ولی عہد معاویہ نے اُسے کچھ دے دلا کر اپنے مخالفین کی ہجو پر اکسایا۔ اس کام میں یہ پہلے ہی سے مشاق تھا۔ اس واقعہ سے چند ہی دنوں میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کی ہجو کا جواب دینے والا انصار علی کے پاس نعمان بن بشیر تھا۔

انصار علی کے خلاف جب اس نے ہجو یہ نظمیں لکھنی شروع کیں تو خلفا رنبی اُمیہ نے اس پر مال و دولت کے ڈھیر کے ڈھیر پنچھاور کئے خصوصاً عبدالملک بن مروان کا یہ درباری شاعر بن گیا حتیٰ کہ خلیفہ ہمیشہ اسے اپنے سامنے رکھتا۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ یزید کی طرفداری میں انصار کی ہجو کرنے پر معاویہ نے اس کی زبان کاٹنے کی سزا دی تھی لیکن اب اس کے ہر شعر پر تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتیں اور عطایا سے نوازا جاتا۔

عبدالملک شعر کا بڑا اچھا نقاد تھا اور اخطل کی شاعری اسے بہت پسند تھی۔ اس کے علاوہ سیاسی اعتبار سے

بھی اس کی اعانت ناگزیر تھی، اسی لئے اس نے اخطل کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا۔ ایک مرتبہ اس کے دلکش اشعار سے متاثر ہو کر اس نے منادی کرنے کا حکم دیا کہ اخطل بنی امیہ کا شاعر ہے۔ اور آگے چل کر عوام میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ "یہ شاعر امیر المومنین بلکہ شاعر عرب ہے۔ یہ درجہ اخطل سے پہلے کسی کو بھی نصیب نہ ہوا تھا

باوجود اس کے کہ اخطل ہمیشہ بنی امیہ کے دربار میں رہتا اور مسلمانوں سے ملتا جلتا لیکن اس نے اپنے عقائد میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔ وہ آخر تک نصرانی کا نصرانی رہا۔ خلیفہ کے پاس بھی جاتا تو شراب کے نشہ میں مخمور رہتا۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ صہبائے دوشینہ کے خمار سے مدہوش ہو کر خود خلیفہ یعنی عبدالملک کو کہا کہ شراب پلایئے اس پر عبدالملک بہت بگڑا مگر کچھ نہ کیا اور اخطل نے ایک قصیدہ کہہ کر نہ صرف اُسے منا لیا بلکہ دس ہزار درہم انعام بھی پایا۔

مسلمان اس کی حرکتوں پر بہت بگڑتے لیکن خلیفہ کی حالت دیکھ کر خاموش رہ جاتے۔ وہ علانیہ مسلمانوں پر حملے کرتا ان کے مذہبی عقاید کا مضحکہ اڑایا کرتا لیکن خلیفہ بھی خاموش ہی رہتا۔ صرف یہی کمزوری تھی بلکہ شاعر پرستی و شعر نوازی میں غلو کہنا چاہیے جس پر خلفائے بنی امیہ آج تک مورد لعن طعن قرار پاتے ہیں۔

خلیفہ کے محل میں یہ ہر وقت بلا اجازت داخل ہو سکتا تھا۔ ریشم کے ایک طویل جبہ میں ملبوس رہتا سینہ پر صلیب لٹکتی رہتی اور لمبی گھنی ڈاڑھی ہمیشہ شراب میں تر رہتی۔

عبدالملک پر اس کا اتنا اثر تھا کہ اس کی ہر بات کی تکمیل بلا چون وچرا کر دیتا۔

خصوصیات شاعری اس دور کے سب سے بڑے تین شعرا میں اخطل بھی ایک ہے یعنی اخطل، جریر، فرزدق۔ جریر اور فرزدق کی ہجو گوئی کے سلسلہ میں اخطل کا بھی نام آتا ہے۔ جریر نے اخطل کے فیصلہ سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کی اس پر اخطل اور جریر میں بھی ایک مدت تک اس ہجو کا سلسلہ جاری رہا لیکن بڑھاپے کے سبب اخطل نے اسے مناسب نہ سمجھا۔

جریر خود کہتا ہے کہ "اخطل کا اور میرا مقابلہ اس وقت ہوا جبکہ اس کا ایک دانت باقی تھا (یعنی وہ بڑھا ہو چکا تھا) اگر اس کے دو دانت ہوتے (یعنی وہ جوان ہوتا) تو مجھے نگل جاتا"

جدت طبع اور نازک خیالی میں جریر اور فرزدق دونوں پر اخطل فوقیت رکھتا ہے۔ اخطل مدح میں ثالث ثانی

ہے۔ شراب کی تعریف جتنی اس نے کی شاید ہی اور کسی نے کی ہو۔ ہجو کے میدان کا استاد نہیں۔ قصائد طویل لکھتا ہے اور نہایت فصیح و بلیغ یہ بھی عجیب شاعرانہ دماغ رکھتا تھا کہ اپنے سے برتر سوائے اعشیٰ کے کسی کو نہ جانتا اور اسی کے اسلوب کی پیروی کرتا۔

باوجود شراب و کباب سے متاثر ہو کر شعر کہنے کہ اس کے اشعار ہر قسم کی رکاکت اور سوقیانہ پن سے مبرّا ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ "اخطل شراب پینے تک شعر نہیں کہتا لیکن جب شعر کہتا ہے تو ایسا کہ دوشیزاؤں کو بھی اس کے سننے میں عار نہ ہو"

جب حماد الراویہ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو اُس نے کہا "مجھ سے ایسے شخص کے متعلق کیا پوچھتے ہو جس نے شعر کو نصرانیت کی طرف پھیر دیا"

اخطل کبھی دمشق میں رہتا تھا اور کبھی بلاد جزیرہ میں بدل جایا کرتا ستّر سال کی عمر پاکر خلیفہ ولید کے ابتدائی زمانہ میں یعنی ۹۵ھ میں انتقال کیا۔

جریر
المتوفی ۱۱۰ھ

قبیلۂ تمیم کے اس نامور شاعر کا نام جریر بن عطیۃ بن الخطفی اور کنیت ابو حزرۃ ہے۔ ساتویں مہینے میں بمقام یمامہ پیدا ہوا اور بادیہ میں پرورش پائی۔ فطری ذوق اور عمدہ صحبتوں کی وجہ سے فصاحت و بلاغت کا ماہر بن گیا۔ بلندی خیال اور شگفتگی طبع کے باعث اس کی شاعری کی کشتی کو بحر سخن میں رواں دواں ہونے کے لئے کسی باد مخالف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

جریر کی شاعری کا ستارہ یمامہ میں ہی طلوع ہوا تھا لیکن اُسے چمکنا بصرہ میں دکھلانا تھا چند دن کے بعد جب اسے اپنی شعر گوئی اور اپنے وجدان صحیح پر پورا پورا اعتبار ہو گیا تو بصرہ کے ارادے چل نکلا۔ بصرہ میں اس زمانہ میں فرزدق کا طوطی بول رہا تھا لیکن جریر کی قابلیت نے بہت دن اسے گمنامی میں نہ رکھا۔

جریر نے یہاں آتے ہی امراء عظام اور رؤسائے کبار کی مدح شروع کی اس سے نہ صرف اس کی شہرت

آناً فاناً پھیلتی گئی بلکہ مال و دولت کا ایک وافر حصہ بھی اس کے پاس جمع ہوگیا۔ فرزدق جو مدت سے یہاں کے رنگ دیکھا ہوا تھا اس کی اس غیر معمولی ترقی اور فوری اوج پر حیران ہوگیا بلکہ حسد کی ایک لہر اس کے سینہ میں دوڑ گئی۔ ان کے اختلافات کی بنیاد بس یہیں سے رکھی گئی۔

جریر ایک زمانے تک یزید کے دربار میں رہا جہاں اوروں کی مدح میں آسمان تخیل کے تارے توڑے وہیں عبدالملک کے گورنر حجاج بن یوسف کی تعریف میں عرش خیال کے نیم واصدف سے دُرہائے بے بہا کے تار لگا دیئے جس سے اس کی قدر و منزلت دوچند ہوگئی یہ خبر عبدالملک تک بھی پہونچی لیکن اس خیال سے کہ اپنے ایک گورنر کے پاس رہنے والے شاعر کو خود طلب کرنا مصلحت خسروانی کے خلاف ہے اس لئے خاموش ہو رہا۔ دوسرے یہ کہ یہ تمیم کا شاعر تھا جنھوں نے ان کے خلاف انصار کی مدد کی تھی۔ عبدالملک کا مطلب پاکر حجاج نے اپنے بیٹے محمد کے ہمراہ ایک وفد کے ساتھ اسے خلیفہ کے پاس روانہ کیا اول تو عبدالملک نے اس پر کوئی توجہ ہی نہ دی بالآخر حجاج کے فرزند محمد نے اس کی سفارش کی تب کہیں اسے دربار میں قصیدہ سنانے کی اجازت ملی اس نے اس موقع پر ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا قصیدہ سنایا جس سے عبدالملک بہت خوش ہوا اور کئی ہزار درہم انعام میں دیئے۔

جریر نہ حسب نسب میں اپنے ہمعصر شاعروں میں خصوصاً فرزدق وغیرہ سے ممتاز تھا اور نہ اس کا گھر ہی کسی خاص شہرت کا مالک۔ برخلاف اس کے وہ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی تھا لیکن اپنی ذاتی قابلیت اور خداداد جوہر کے باعث اس نے اپنی راہ آپ پیدا کی۔

جریر کی شہرت کا ایک اور باعث فرزدق اور اس کی ہجو نگاری ہے۔ دوسروں کے جھگڑے میں دخل دیکر فرزدق نے اس کی ہجو پر کمر باندھی بس یہیں سے ان کی مشہور ہجو نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادب عربی میں جتنی شہرت اس واقعہ سے ان دونوں شاعروں کی ہوئی اتنی شاید ہی کسی اور ادب میں کسی شاعر کی ہوئی ہو

برسوں ان کے اختلافات کا سلسلہ جاری رہا اس میں کئی اور مشہور شاعر بھی شریک ہوئے جن میں اخطل اور راعی بہت مشہور ہیں۔ اخطل تو بڑھاپے کے سبب خاموش ہو رہا لیکن راعی جو بنو نمیر کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ باقاعدہ اس سے مقابلہ کرتا رہا۔ جریر نے ایک واقعہ سے مشتعل ہو کر اسی بیت کا ایک قصیدہ ایک ہی رات میں اس کی ہجو میں لکھا اور دوسرے دن مربد کی محفل میں اسے سُنایا جہاں بہت سے شعراء جمع تھے جن میں خود

راعی اور فرزدق وغیرہ موجود تھے۔

ہجو کیا تھی قبیلۂ نمیر کے لئے موت کا پیغام تھا۔ راعی تو اپنے گھرانے کو لے کر فوراً یہاں سے چلتا بنا اور پھر کبھی اس کا ذکر سننے میں نہ آیا ادب میں اس کی ہجو کی اتنی شہرت ہے کہ آج تک قبیلہ نمیر کے لوگ اپنا نام و نسب بتاتے ہوئے شرماتے ہیں۔

فرزدق اور جریر کی علحدہ علحدہ جماعتیں تھیں اس زمانے میں بڑے بڑے شعرا کے ساتھ نوشق شعرا اور تلامیذ کے گروہ ہوتے تھے۔ جریر پر فتح پانے کے لئے فرزدق کی جماعت کے ایک رکن نے چار ہزار درہم اور ایک گھوڑا انعام بھی رکھا تھا لیکن کوئی اسے حاصل نہ کرسکا۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرانہ قابلیت اور ہجو نگاری میں جریر کو کتنا ملکہ تھا۔

ایک مرتبہ اسی شاعروں کی ایک جماعت نے جریر سے مقابلہ کرنا چاہا کہ سب مل کر اُسے شکست دیں مگر جریر نے تنہا ہی ان سب کو ایسا تنگ کیا کہ انھوں نے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ یہی وجوہات تھیں جن سے اس کی شہرت کے آفتاب پر کبھی اندھیرا نہ چھایا۔

آخری عمر میں اس نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی بھی مدح کی لیکن انھوں نے اس پر کچھ التفات نہ کیا۔ فرزدق کی وفات کے چند ہی ماہ کے اندر ۱۱۱ھ میں اس کا بھی انتقال ہوگیا اور اعشیٰ کی قبر کے بازو یمامہ میں اسے بھی سپرد خاک کیا گیا۔

خصوصیات شاعری

جریر کی زندگی کا دارو مدار شاعری پر تھا حسب و نسب کے لحاظ سے یہ معمولی درجہ کا انسان تھا جریر کو اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا اسی لئے اس نے نیکی، دینداری خوش خلقی اور انسانیت سے زندگی گذارنے کا تہیہ کرلیا جس کا اثر اس کے اشعار سے بخوبی واضح ہوتا ہے برخلاف اس کے اخطل اور فرزدق دونوں گمراہی میں مبتلا تھے۔ اخطل نصرانیت کی وجہ سے شراب خواری، جھوٹ اور بدراہ روی کو خاطر میں نہ لاتا اور فرزدق فخر و غرور میں ہی مبتلا رہتا۔ فرزدق کا فسق و فجور اور بددینی بھی ضرب المثل تھی۔

جریر نے اخطل اور فرزدق کی طرح کبھی یاوہ گوئی اور فحش نگاری میں حصہ نہیں لیا وہ جو کچھ کہتا خواہ

بلحاظ اثر کتنا ہی تلخ ہو کبھی عامیانہ اور سوقیانہ انداز سے نہ کہتا۔

اخطل نے جریر کے متعلق کیا ہی عمدہ رائے ظاہر کی ہے فرزدق اور جریر کی شاعری کے متعلق جب اس سے اپنا خیال ظاہر کرنے کو کہا گیا تو اُس نے کہا

"فرزدق ینحت من صخر و جریر یغرف من بحر"

فرزدق بلند چٹانوں سے ڈرتا ہوا آتا ہے تو جریر پُرسکون سمندر کی سطح سے چلو بھر لیتا ہے

فرزدق

المتوفی سنہ ۱۱۰ھ

جریر کے مقابل تمیم کے اس اعلیٰ پایہ شاعر کا نام ہمام بن غالب بن صعصعۃ اور کنیت ابو فراس ہے۔ بصرہ میں پیدا ہوا اور یہیں پروان چڑھا اسی لئے زبان اس کی باندی اور فصاحت اس کی کنیز تھی۔ ایام طفولیت ہی سے ادبی مسائل، نحوی اختلافات اور شعر و شاعری کے قصے اس کے گوش گذار ہوتے رہے جس کی وجہ سے شاعری کے میدان میں اپنے سمند باد پیما کو جو لانی دینے کے بعد راستہ کی کسی بلندی اور پہاڑوں کی کسی اونچائی سے اس کی سرعت رفتار میں کوئی فرق نہ آیا۔

رئیس قوم کا فرزند اور شرافت نسبی و بلندی جاہ کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کی شہرت کو پھیلتے زیادہ عرصہ نہ لگا۔ باپ نے واقعہ جمل کے بعد اسے "شاعر" کہہ کر حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے روکھے پن سے کہا "قرآن پڑھاؤ"۔ اسی دن سے فرزدق نے بھی جب تک قرآن حفظ نہ کر لیا شعر نہ کہا۔ علیؓ کے گھر سے اور ان کے حکم سے اسے اتنی عقیدت و اُلفت تھی۔

باپ کی تربیت میں اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔ موسیقی اور شعر گوئی میں اس کے باپ نے ہی اس کی رہبری کی۔ ادب کے گہواروں میں پل چکا تھا اور فصاحت کے معدن سے اس نے موتی چنے تھے۔ اس لئے اس کا کلام ہر قسم کے نقائص سے بالکل نہیں تو بہت کچھ پاک رہا۔

فنون لطیفہ کا ماہر عزت و شہرت کی دیوی کے پیچھے بھاگا بھاگا پھرتا ہے فرزدق نے بھی اپنی قسمت

آزمانے کے لئے کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کا تقرب حاصل کیا۔ یہاں لسے روپیہ پیسہ بھی بہت ملا۔ پھر خلفاء کی تعریف میں مشغول ہوا خصوصاً عبدالملک کی لیکن آل علیؓ کی محبت نے اسے زیادہ دن بنو امیہ کی مدح میں مشغول رکھنا مناسب نہ سمجھا اسی لئے وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

بلحاظ فطرت فرزدق بہت خراب آدمی تھا۔ اس کے عقاید میں بھی تزلزل تھا۔ دین میں کمزوری کے علاوہ اس کے اخلاق و عادات، چال چلن اور بول چال میں بھی کمینگی اور رذالت کا اظہار ہوتا تھا۔ فسق و فجور، زنا کاری اور عیاشی اس کے محبوب مشاغل تھے۔ اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں جریر نسبی کمزوری کے باوجود اپنے ذاتی حسن اخلاق کی بنا، اس فرزدق سے بدرجہا بہتر تھا جو باپ داد اکے کارناموں پر ٹیکا لگا کر اپنے فرایض کی کوتاہی سے ننگ خاندان نکلا۔

جریر اور فرزدق کی ہجو نگاری کے ابتدائی زمانہ میں اہل مدینہ نے فرزدق کے تلخ لہجہ اور تیر و نشتر کے سے الفاظ کی شکایت مروان کے پاس کی۔ مروان نے اس کے اقوال کی تردید چاہی لیکن فرزدق نے اسے ہجو کی دھمکی دی جس سے خائف ہو کر مروان نے انعام و اکرام دے کر اس سے پیچھا چھڑایا۔

اہل بیت کی محبت اس کے دل میں بہت تھی۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک حج کے لئے آیا لوگوں کے ہجوم اور اژدحام میں راستہ ملنا مشکل تھا۔ ہشام بھی اسی ریل پیل میں کھڑا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک طرف سے علی بن حسین علیہ السلام تشریف لے آئے۔ صورت سے جلال اور رعب ٹپکا پڑتا تھا۔ آپ کو دیکھ کر مجمع کائی کی طرح چھٹنے لگا۔ ہشام نے دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے دریافت کیا، "یہ کون ہے؟" اس پر فرزدق جو موجود تھا اس نے ان کی مدح میں فی البدیہہ ایک قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے:-

هذا الذی تعرف البطحاء وطاءته — یہ وہی ہیں جن کے پیر کے روندنے کا شرف بطحا کے میدانوں کو حاصل ہے۔

والبیت یعرفه والحل والحرم — انھیں نہ صرف بیت (خانہ کعبہ) جانتا ہے بلکہ حل اور حرم بھی ان کے مداح ہیں۔

اس غیر متوقع تعریف کو سن کر ہشام چراغ پا ہوا اور فرزدق کو گرفتار کر کے قید کر دیا لیکن فرزدق نے وہاں اس کی ہجو کہہ دی جس پر ہشام نے اسے رہا کر دیا۔

فرزدق آخری عمر تک بصرہ ہی میں رہا اور مربد میں اپنے فن کے کمالات دکھاتا رہا بالآخر ۱۱۰ھ میں

جریر سے چند ماہ قبل سو سال کی عمر پاکر انتقال کر گیا۔

خصوصیات شاعری "پدرم سلطان بود"، کی راگنی اس کے کلام میں سب سے نمایاں ہے۔ اپنے قبیلہ اور اپنے ذات کی برتری ہمیشہ اس کے پیش نظر رہی۔ اپنے شاندار خاندانی روایات کے فخریہ تذکرہ کو خلفا وقت کے سامنے دہرانے سے بھی باز نہیں رہتا۔ افتخار ہی کی بدولت اس کے الفاظ بڑے بڑے شاندار اور پُر شکوہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے کلام میں تعقید بھی پائی جاتی ہے۔

فرزدق کے کلام میں تنوع بہت ہے۔ اخطل، جریر بلکہ اس زمانہ کے اکثر شعراء ایک ہی ڈگر پر چلتے رہے۔ فرزدق نے شعر کے میدان میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ ایام عرب کے پُر جوش تذکرے جاہلیت کے اسلوب کی پیروی اور قدیم تخیل کے احیاء کی وجہ سے فرزدق کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس کے بیانات و تاریخی شواہد سے بعض اوقات رواۃ بھی متعجب ہوتے ہیں۔ بلحاظ نحو اس کا درجہ بہت بلند ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ "اگر فرزدق کے اشعار معدوم ہو جاتے تو ایک تہائی عربی دنیا سے رخصت ہو جاتی"۔

الطِّرِمّاح

المتوفی سنہ ۱۰۰ھ

طرمّاح بن حکیم قبیلہ طے سے تعلق رکھتا تھا۔ قرن اوّل کے نصف آخر میں دمشق میں پیدا ہوا اور شام کی گمراہ کن جماعتوں میں نشو و نما پاتا رہا۔ شباب کی ابتدائی منزلوں میں وہ بنی امیہ کی فوج کے ایک رکن کی حیثیت سے کوفہ آیا یہاں اس کی ملاقات خارجیوں کے ایک شیخ سے ہوئی جس کی صحبت میں بیٹھنے اور گفتگو کرنے سے اس کے خیالات بھی بدل گئے حتّٰی کہ یہ پورا خارجی بن کر رہا اور آخری عمر تک خارجی ہی رہا۔

کوفہ میں اس کی دوستی کمیت بن زید اسدی نامی شاعر سے ہوئی۔ کمیت گو عقیدہ، مذہب اور نسب کی رو سے اس سے بالکل مختلف تھا یعنی وہ کوفی شیعہ تھا اور عدنان سے تعلق رکھتا تھا اور طرمّاح شامی اور قحطان کی اولاد میں اور بلحاظ عقیدہ خارجی پھر بھی ان کی دوستی میں فرق نہ آیا۔

امرا کی مدح کرکے اس نے بھی خوب خوب صلے پائے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا رہا۔ اخلاق و کردار کے لحاظ سے طرماح نہایت عمدہ آدمی تھا۔ اس کے خیالات بلند اور نظر وسیع تھی۔ ہمت و دلیری میں بھی سینکڑوں میں جواب نہ رکھتا۔ مجاہدین کی طرح لڑ کر مرنا پسند کرتا تھا اور اس کی دعا مانگا کرتا لیکن اس کی یہ دعا قبول نہ ہوئی اور طبعی موت سے ۱۰۰ھ میں مرا۔

خصوصیات شاعری طرماح نے شہر میں آنکھیں کھولیں اور شہری زندگی ہی میں اپنی عمر گزاری اس لئے بدوی اثرات کا شائبہ تک اس کے کلام میں نہیں۔ کوفہ اور بصرہ میں نحویوں اور راویوں کی صحبت میں بیٹھنے سے اس کی زبان منجھ گئی اور خیالات وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے۔ طرماح اور کمیت دونوں شہری تھے لیکن مناظر صحرا کی عکس کشی بھی خوب کرتے۔ اس لئے ان پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شہر میں رہ کر جنگل کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

اصمعی اور ابو عبیدہ نے اسلامی شعراء میں طرماح اور کمیت کی شاعری کو عیب لگائے ہیں جس طرح جاہلیت میں عدی بن زید اور امیۃ بن ابی الصلت کو مورد الزام ٹھرایا گیا تھا۔ اس کے باوجود طرماح نہایت پر گو اور شگفتہ کلام کہنے والا تھا۔ طمات میں بھی اس نے زور قلم صرف کیا ہے اور اس عہد میں بڑے بڑے اسلامی شعراء کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا تھا۔

اسلامی شعراء کے ضمن میں ہم نے صرف چند مشہور شعراء کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کے خصوصیات پیش کئے ہیں اور یہاں اتنی گنجایش نہیں کہ اور شاعروں کے حالات بھی پیش کئے جاسکیں تاہم اس عہد کے بیشمار شعراء میں سے چند مشاہیر کے نام ہی کم سے کم یہاں بیان کر دینے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے راعی کا نام آتا ہے۔ اس کا نام عبید بن حصین نمیری تھا ۹۰ھ میں انتقال کیا۔ جریر کی ہجو کی وجہ سے یہ عمر بھر کے لئے بدنام ہوگیا۔ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اور اونٹوں کی صفات بیان کرنے میں غلو کی وجہ سے اس کا نام راعی مشہور ہوا۔

رجز گوئی میں ابو النجم کو اسی عہد میں اولیت کا رتبہ حاصل تھا۔

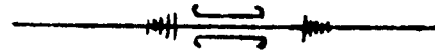
بنی امیہ کے دیگر مددگار شعراء میں ابو العباس، اعشیٰ، ربیعہ المتوفی ۸۵ھ اور ابو صخر الہذلی مشہور ہیں۔

آل مہلب کی طرفداری کرنیوالوں میں زیاد الاعجم متوفی ۱۰۰ھ کا نام خاص طور پر لئے جانے کے قابل ہے۔

آل علیؑ کی محبت میں جنھوں نے اپنی شاعری کے مایہ ناز سرمایہ کو تیار کیا ان میں کمیت بن زید متوفی ۱۲۶ھ (جس کا اجمالی ذکر طرماح کے ساتھ آچکا ہے) اور ایمن بن خریم اسدی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

خارجی شعراء میں طرماح کے بعد عمران بن خطان متوفی ۸۹ھ کا نمبر آتا ہے۔ غزل و تشبیب کے میدان میں کثیر عزہ متوفی ۱۰۵ھ جس کے نام کا دوسرا جزء جو مجنوں کا نام ہے شدید عشق کی بنا پر اس سے آج تک جدا نہو سکا مجنوں لیلیٰ۔ جس کو دنیائے اردو میں اُلٹا کر لیلیٰ مجنوں کر لیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ مذہب عشق میں تقدیم و تاخیر کوئی چیز نہیں۔ ذوالرمہ متوفی ۱۱۷ھ جو اسی میدان کا بہت بڑا شاعر تھا۔ احوص متوفی ۱۰۵ھ اور ابن میادہ بے حد شہرت رکھتے ہیں۔

ابوالفضل ام۔ اے (عثمانیہ)



حیدرآباد کی جدید مطبوعات

آخری رسول۔ از مولوی ماہر القادری صاحب۔ ناشر:- مولوی خواجہ بہاء الدین صاحب مکتبہ علمیہ چار مینار
چھوٹی کراؤن تقطیع ۹۸ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے (۸/)

خواجہ بہاء الدین صاحب نے سلسلہ مطبوعات مکتبہ علمیہ قایم کیا ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے۔ چونکہ اس کے بانی ایک صاحب ذوق اور اُردو کے مخلص خدمت گذار ہیں اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر یہ سلسلہ کامیاب ثابت ہو۔ اُنھوں نے یہ بہت اچھا کیا کہ اس کا آغاز ایک ایسی کتاب سے کیا جس میں شہنشاہ کونین کے مقدس حالات نہایت سلیس زبان میں جمع کئے گئے ہیں۔ مولوی ماہر القادری صاحب اُردو کے نوجوان شاعروں میں خاص شہرت رکھتے ہیں اُنھوں نے اپنی اس تالیف میں واقعات کی صحت اور طرز بیان کی سلاست و سادگی کا انتہائی لحاظ رکھا ہے اس موضوع پر سیکڑوں کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن حضرت خاتم الانبیاء کی زندگی کے ہر پہلو پر ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں غزوات کو خاص طور پر پھیلا کر بیان کیا گیا ہے کیونکہ مصنف کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے جمود و تعطل اور خوابیدہ احساس کو فلسفہ جہاد کی چٹکی ہی بیدار کرسکتی ہے۔ جو مسلمان بچہ غزوات کو سمجھ کر پڑھ لیگا

سورج کی روشنی کی طرح میرا ایقان ہے کہ کوئی غیر خدائی قوت اسے مائل نہیں کر سکتی اور مشکلات و مصائب کے ہجوم میں اس کا قدم نہیں ڈگ سکتا۔"

یہ کتاب دلچسپ ہے اور اس کا اسلوب اس قدر شگفتہ ہے کہ بچے اور بڑے سب اس کو دل لگا کر پڑھ سکتے ہیں

اسلامی طب ۔ از قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی منشی فاضل صفحات ۲۰۷ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس

اس کتاب میں اسلامی طب کی شاہی سرپرستیوں کا ایک دلچسپ تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ مؤلف کو تاریخی کتب کے مطالعہ کا خاص ذوق ہے۔ اور یہ کتاب اصل میں اسی کا نتیجہ ہے۔ اس کا اسلوب سلیس اور سادہ ہے البتہ کہیں کہیں، قدیم طرز تحریر کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اور بعض جگہ ایسی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں جو اردو ادب سے نامانوس ہیں۔ ان میں سے بعض کے لئے تو پہلے سے اردو میں اصطلاحیں یا الفاظ موجود ہیں اور جن کا استعمال عام طور پر تمام ہندوستان میں کیا جاتا ہے۔ ایسے مستعملہ الفاظ کی جگہ نئے الفاظ یا اصطلاحوں کا استعمال کرنا جدت پسندی تصور ہوگی خواہ وہ جدت ایجاد بندہ کیوں نہ ثابت ہو۔ فہرست ماخذات کی جگہ محولات، فہرست مضامین کی جگہ یادداشت مضامین، تقریظ کی جگہ تقریض جیسے الفاظ اس خصوص میں قابل ذکر ہیں۔ اردو میں جو الفاظ جن شکلوں کے ساتھ رائج ہو گئے ہیں اُن پر قایم رہنا اور ان کی عام ترویج زبان کی یکسانیت اور ہم آہنگی کے لئے ضروری ہے۔ اگر ہر صاحب قلم مروجہ اصطلاح کو چھوڑ کر نئے الفاظ اختیار کرنا چاہے اور اس ایجاد پر فخر کرے تو اُردو زبان کے مخالفین اس افراتفری اور اس کے اہل قلم کے دماغی انتشار سے ضرور فایدہ اٹھائیں گے۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ تمام اہل اردو کو اتفاق اور اتحاد کے ساتھ اپنی زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کے لئے سرگرم رہنا چاہئے۔

مولوی معین الدین صاحب رہبر ایک نوجوان صاحب ذوق ہیں ان کی جودت طبع اور علمی انہماک قابل قدر ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں دکن کی شاہانہ طبی سرپرستیوں کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں وہ اگرچہ ان کے وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہیں لیکن یہ موضوع بجائے خود ایسا ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ خاص کر گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے متعلق ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس کتاب کے

تعارف میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مستقل کتاب کی صورت میں داخل نہیں ہوئی بلکہ اس کا خاکہ معلوم ہوتا ہے" اس لئے توقع ہے کہ آیندہ لایق مؤلف اس کو ایک مستقل کتاب بناکر شائع کریں گے۔

دکن کی زبان ۔ از مولوی لطف علی صاحب عارف ابوالعلائی۔ قسط اول صفحات ۴۸۔ قیمت ۸؍

عارف ابوالعلائی صاحب کئی کتابوں مثلاً فرہنگ عثمانیہ، تذکرہ سلاطین دکن، حیات سالارجنگ اول کے مؤلف ہیں ان کے کلام کا ایک مجموعہ ریاض عارف بھی شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر رسالہ ۳۰ قسطوں میں شائع ہوگا یہ پہلی قسط ہے اور اس میں ابھی ردیف الف ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے اور اس کی تکمیل کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ کسی زبان کی فرہنگ یا لغت مرتب کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ عارف صاحب نے ہمت تو کی ہے خدا کرے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوں۔ اور اس زبان کی ایک مکمل فرہنگ تیار کرسکیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ اپنے ساتھ اور اصحاب کو بھی شریک کر لیتے تاکہ یہ کام زیادہ صحت اور اطمینان کے ساتھ انجام پاتا۔

ایک ایسی فرہنگ میں جس میں دکن کی زبان پیش کی جارہی ہو ایسے الفاظ کو شامل نہیں کرنا چاہیئے جو شمالی ہند میں بولے جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کا کوئی انتظام نہیں کیا جائے گا تو کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی اور اس کا افادی پہلو کمزور پڑ جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک دکن کی چند قدیم اردو کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر نہ آجائیں اس قسم کا کام نامکمل رہے گا۔

اس قسط کی تمہید میں اردو اور دکنی زبان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اصلاح طلب اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔ توقع ہے کہ مؤلف جدید ترین تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔

قلعہ معلی کی جھلکیاں ۔ از عرش تیموری (مرزا احمد سلیم شاہ عرش تیموری) صفحات ۲۷، قیمت ۸؍

مرزا نظام شاہ صاحب لبیب اردو کے ایک اچھے شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ ادب کی خدمت کا ولولہ رکھتے ہیں اور کئی سال قبل رسالہ "افادہ" شائع کرتے تھے۔ عرش تیموری مؤلف کتاب ہذا انھیں کے فرزند ہیں

اور انھیں علم و ادب کا ذوق اپنے والد سے حاصل ہوا ہے۔

اس کتاب میں نہایت اختصار کے ساتھ دلّی کے آخری زمانہ کے بعض واقعات موثر اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں یوسف بخاری صاحب دہلوی مصنف موتی کا تعارف ہے جس میں نوجوان مولف کے متعلق مختصر سی معلومات درج ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرشؔ صاحب ابھی سولہ برس کے ہیں۔ عنفوان شباب ہے لیکن اسکے باوجود شاعری بھی کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

عرش صاحب کی یہ ابتدائی کوشش اُن کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے مستحق تحسین ہے یقین ہے کہ وہ آیندہ اپنے فاضل باپ کی زیر نگرانی اپنی تصنیف و تالیف کو جاری رکھیں گے اور اُردو کے ایک اچھے خدمتگذار ثابت ہونگے

نذر عقیدت ۔ مرتبہ مولوی سید محمود صاحب بی۔ اے ایل ایل بی (عثمانیہ) صفحات ۲۳۶۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد۔

حضرت محبوب سبحانی غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانیؓ کی شان میں عربی و فارسی اور اردو میں جو نظمیں اس وقت تک لکھی گئی ہیں اُن کو اس مجموعہ میں نہایت خوش سلیقگی اور اہتمام کے ساتھ جمع کیا گیا ہے حضرت اور اُن کی اولاد کی درگاہوں کے فوٹو دیئے گئے ہیں۔ ٹائیٹل نہایت خوشنما ہے اس پر بارگاہ غوثیہ کا فوٹو بلاک بھی منعکس ہے۔

حضرت غوث اعظمؒ اسلام کے بہت بڑے خدمت گذاروں اور بزرگوں میں ہیں۔ وہ اولیاء اللہ کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں تقویت ایمان اور صداقت قلب پیدا کرنے کے لئے آپ نے جو طریقے اختیار کئے وہ آج تک رائج ہیں۔ صوفیا کے کئی گروہ اور طریقت کے کئی مسلک آپ ہی سے فیض پاتے ہیں۔ رشد و ہدایت کے اکثر سلسلے آپ تک منتہی ہوتے ہیں۔ آپ کا روحانی کمال، خرق عادات، اور کرامتیں بہت مشہور ہیں۔ بڑے بڑے اولیاء اور کاملین نے آپ سے کسب فیض کیا ہے اور دور دور تک اسلام اور ایمان کی روشنی پھیلائی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ مذہب و عقیدت کی طرف پہلی سی توجہ نہیں رہی لاکھوں مسلمانوں کے دل آپ کی محبت سے معمور اور اُن کے ایمان آپ کی ہدایتوں پر چلنے کی وجہ سے قوی ہیں۔ ہر محفل سماع میں بزرگوں

کے عرسوں اور زیارتوں میں آپ کی شان میں نظمیں اور قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ ان سب کو ایک جا جمع کرنا مشکل نہ تھا، لیکن جس سلیقے سے سید محمود صاحب نے یہ کام سر انجام کیا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو تصنیف و تالیف کا بڑا اچھا ذوق ہے۔ وہ حضرت محبوب سبحانیؒ کے عربی کلام کا مجموعہ بھی اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کرنا چاہتے ہیں اور مختلف قلمی و مطبوعہ نسخوں سے اس کا ایک مسودہ بھی مرتب کر لیا ہے۔ ان رشحات قدسیہ کے علاوہ انھوں نے اپنا سفرنامہ حرمین شریفین بھی قلم بند کیا ہے جو یقینی ہے کہ دلچسپ ثابت ہوگا۔

زیر نظر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے عربی، فارسی، اُردو، اس طرح مطالعہ کرنے والے کو دنیائے اسلام کی تین اہم زبانوں کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا موقع حاصل ہے۔ علاوہ ازیں جملہ اصناف سخن کے نمونے اس میں موجود ہیں۔ قصیدے بھی ہیں اور مثنویاں بھی غزلیں بھی ہیں اور رباعیاں بھی ان کے علاوہ قطعے اور ہر قسم کے ترکیب بند بھی شامل ہیں۔ اب تک اُردو زبان میں جو انتخابات شائع ہوئے ہیں وہ زیادہ تر حدیث عشق مناظر قدرت یا قومی موضوعوں سے متعلق ہیں مذہبیات و مناقب کی جانب کم توجہ کی گئی ہے۔

اس مجموعہ کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قبیل میں بھی ہماری شاعری کم مایہ نہیں ہے۔ مرثیوں کے مجموعوں کی طرح اگر بزرگان دین اور اولیا اللہ کے مناقب وغیرہ سے متعلق نظمیں بھی اسی طرح سے جمع کر دی جائیں تو اُردو ادب کے خزانہ میں ایک اچھا اضافہ ہوگا اور یہ معلوم ہوگا کہ اردو شاعری کا دامن محض عشق و عاشقی اور خاص کر غزلوں سے معمور نہیں ہے۔

سید محمود صاحب نے بڑے اچھے کام کی ابتدا کی ہے اور جس خوش اسلوبی سے یہ کتاب شائع کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل جائے گی۔

نظر کے دھوکے ۔ از محمد بدر الدین خان صاحب شکیب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ سابق مدیر مہتمم مجلہ عثمانیہ چھوٹی تقطیع صفحات ۱۲۳۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

بدر شکیب صاحب جامعہ عثمانیہ کے صاحب ذوق انشا پردازوں میں سے ہیں مجلہ عثمانیہ کے مدیر رہ چکے ہیں اور اپنی تعلیم کے بعد سے اب تک تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان کے چھ

افسانے شامل ہیں بہ زیادہ تر آجکی ہیں اور مصنف کے تخیل کی پیداوار ہیں ان کا اسلوب صاف و سلیس ہے اور ان میں حیدرآباد کی زندگی کو نہایت دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے اس قسم کے افسانوں کی ملک کو ضرورت ہے جن میں زبان کی لطافتوں اور اسلوب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے اخلاق و عادات پر نہایت صحیح نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا جائے۔

یہ کتاب فن افسانہ نویسی کے معیار سے بھی بلند پایہ ہے اور جو لوگ اس صنف ادب کا ذوق رکھتے ہیں انھیں اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

تجرباتی تعلیم ۔ از حبیب احمد صاحب بی ۔ اے ۔ بی ٹی اُستاد ریاضی و سائنس عثمانیہ سنٹرل ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ حیدرآباد ۔ صفحات ۲۰۴ ۔ قیمت تین روپے (سے ر)

مولوی حبیب احمد صاحب سائنس میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں فن تدریس میں اصولی اور عملی امتیاز حاصل کیا ہے انھوں نے عام فہم سائنسی ادب کا ایک سلسلہ قایم کیا ہے جس کی ایک کتاب لاسلکی نشر اس سے پہلے شائع ہو چکی ہے اور مجلہ عثمانیہ میں اس پر تبصرہ بھی کیا جا چکا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ دو اور کتابیں بھی مرتب کر رہے ہیں جو سائنس کے متعلق عام دلچسپ معلومات کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہوں گی ۔ ان عام فہم کتابوں کے علاوہ انھوں نے اپنی جدید ترین اعلیٰ معلومات اور دماغی کاوش کے اقتضا سے زیر نظر فنی کتاب مرتب کی ہے جو فن تعلیم کے ایک ایسے تازہ ترین شعبہ پر لکھی گئی ہے جس کے متعلق خود مغربی زبانوں میں کم لکھا گیا ہے اور ہماری زبان میں تو اس موضوع کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی ۔ یہ کتاب نہایت محنت اور جستجو کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کے مطالعہ سے ہمارے ․․ رسین اور تعلیمی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ طلبا کی قابلیت اور استعداد کا پتہ کس طرح سے لگایا جاتا ہے ۔ نصاب تعلیم ، درجہ بندی ، ترقی جماعت وغیرہ کے اہم مسائل کیوں کر طے پاتے ہیں ۔ غرض فن تعلیم سے متعلق اس قسم کی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس کو مولف نے بڑی خوبی سے مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں چھ ابواب ہیں اور ہر باب نہایت ٹھوس اور مفید معلومات پر مبنی ہے ۔ اس قسم کی کتابوں کی اُردو کو بیحد ضرورت ہے ۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ٹرننگ کالج حیدرآباد کے دیگر فیض یافتہ بھی مولوی حبیب احمد صاحب کے نقش قدم

پر چل کر اس قسم کی مفید فنی کتابیں اُردو زبان میں مہیا کر دیتے۔

ایمان سخن۔ مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام۔اے لکچرار اُردو سٹی کالج چھوٹی کراؤن تقطیع صفحات ۱۴۰۔ قیمت بارہ آنے (۱۲/)

شیر محمد خاں ایمان حیدرآباد کے بڑے مشہور شاعر اور اُستاد فن تھے۔ نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں انہی کے فیوضات سخن نے حیدرآباد میں اُردو شعر و شاعری کی محفلوں کو سرگرم رکھا۔ شاہ تجلی کے شاگرد تھے اور ان کے بعد ان کے جانشین ہوے۔ ایمان نے اپنے آخر زمانہ میں بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ حیدرآباد کے اکثر بڑے شعرا ان کے تلامذہ تھے جن میں محمد صدیق قیس اور ماہ لقا بائی چندا بہت مشہور ہیں۔

ایمان کے قصیدے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ دکن میں نصرتی و تجلی کے بعد ایمان ہی کے قصیدوں کا درجہ ہے وہ سودا کے معاصر تھے اور اُن کے قصیدے اُردو زبان کے اچھے قصیدوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ایمان سخن میں مولوی سید محمد صاحب نے ان کے اکثر قصیدے بھی شائع کر دیئے ہیں اور غزلوں اور دیگر اصناف سخن کا بھی وافر نمونہ شامل کیا ہے۔ ایمان سخن کا ہر شعر انتخابی ہے اس میں حشو و زوائد کہیں نظر سے نہیں گذرتے۔ اس قسم کے انتخابات کے مطالعہ سے اردو شاعری کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اور توقع ہے کہ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اس سے ضرور مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

قیدی

شادی، اپنی ہو یا کسی دوست عزیز کی، ہے بڑی پُر لطف چیز!

ہمارے ایک عزیز نے بھی، کچھ روز پہلے، شادی رچائی۔ یہ بزرگ ہیں تو تیس چالیس کے ملازم، لیکن ان کی فراخ حوصلگی قابل تعریف اور میرے لئے تو مہیب تھی۔ شادی کے کوئی دو مہینے پہلے سے تیاری شروع کر دی گئی۔ قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو ہر ہفتہ عشرے میں ایک دفعہ یاددہی کی جاتی کہ شادی میں شریک ہونے کے لئے تیار رہیں۔ آخر بڑے انتظار اور اہتمام کے بعد، وہ دن آ ہی گئے کہ شادی منڈھی، اور عقد کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ دولہا میاں نے اپنی تنخواہ پر آٹھ سو، ہزار کا قرض نکالا، اور وقتی ضرورتوں کے لئے بھی، دوست احباب سے رقمیں لے رکھیں کہ وقت پر دشواری نہ ہو۔ مشہور ہے کہ شادی اور میت کے کام کبھی رکے نہیں رہتے۔ دینے والوں نے دل کھول کر دیا۔ اور لینے والوں نے بے کھٹکے لیا۔ اور ایسا لیا کہ لینے کے تمام ذریعے ختم کر دیئے۔ جب کہیں جا کر شادی کا یہ آغاز ہوا۔

قریبی رشتہ دار، ہفتہ بھر پہلے ہی بلا لئے گئے۔ ہم کو بھی ہر روز کوئی نہ کوئی دعوت آتی رہتی کہ آج "رت جگے" کی رسم ہے۔ "کل دولہا کے چچا کے یہاں سے ناشتہ آئے گا۔" "پرسوں دلہن کے گھر سے ناشتہ آنے کا دن ہے۔" "پیر کو ہمارے ہاں سے ناشتہ جائے گا۔" غرض عقد کے دن تک ہفتے کے پورے دن، صبح، دوپہر یا شام، کوئی نہ کوئی

دعوت اور کوئی نہ کوئی رسم ضرور مقرر تھی۔

عقد کے روز، دولہا میاں، رات بھر، دوستوں کے ساتھ، راگ رنگ اور رسموں کی بھرمار کے ساتھ، دوسرا "رت جگا"، مناتے رہے۔ اور صبح سویرے، پچھلے پہر کے تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں، تاش کا جوڑا، زیب تن کئے، گھوڑے پر سوار، "تاشہ مرفہ"، اور نوبت نقارہ بجاتے، اس شان سے چلے، جیسے کوئی بڑا بادشاہ ایک حقیر قلعہ کو فتح کرنے جا رہا ہو۔

برات اس کروفر سے، جب دلہن کے گھر پہنچی، تو داخلے کے دروازے کو بند پایا۔ محاصرے کا مضمون مکمل ہو گیا یہ سالے کی شرارت تھی۔ اِدھر اُدھر دور تک کوئی نظر ہی نہ آتا تھا، جس کے ذریعے پیام سلام کا سلسلہ چھیڑا جائے جب دیر ہو گئی تو باہر کھلبلی مچ گئی۔ لیکن مورچے کے پیچھے سے کوئی صدا ہی نہیں اٹھتی تھی۔ آخر تنگ آ کر محاصرہ کرنے والوں نے گالیاں بکنی شروع کیں۔ جب کہیں چل کر سوال و جواب شروع ہوئے۔ بڑے ہی لطف کی باتیں ہیں بڑے منانے پھسلانے کے بعد سالا، ایک اشرفی لے کر پسپا ہوا، اور ہم دراتے اندر گھس پڑے۔

قاضی صاحب پہلے ہی سے مہیا رکھے گئے تھے "اللھم الف"، والا معاملہ جلد طے پا گیا۔ اب مصری چھواروں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اور یہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ معانقوں کا طوفان برپا ہوا جو وقفے وقفے سے شام تک جاری رہا۔

دعوتیوں کی کمی نہیں تھی۔ پانچ، چھ سو آدمی، "از صبح تا نصف النہار تناول ماحضر"، کے لئے جوق در جوق تشریف لا رہے تھے۔

سخت گرمی کے دن تھے۔ تپش اور گھٹن سے حال پتلا ہو رہا تھا۔ لیکن پھر بھی ہم میں سے ایک بھی اس محفل نشاط سے اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ درآمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس کان نشاط میں جو داخل ہوتا تصویر نشاط بن جاتا تھا۔ جب تک تناول ماحضر کا سلسلہ جاری رہا، صدا دینے والے نے بار بار صدا دی۔

"حضرات، دسترخوان تیار ہے تشریف لے چلئے" ادھر دوست احباب میں سرگوشیاں ہوتی ہیں۔

"عجب مرغ بے ہنگام ہے۔ عین مزے میں خلل انداز ہو رہا ہے"

"گویا اس روحانی غذا سے زیادہ لذیذ پلاؤ قورمہ ہے"

"بھئی ہم تو دولہا کے دسترخوان پر بیٹھیں گے"

"اجی کہاں چلے؟ ایسی بھی کیا جلدی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے شام ہی سے دعوت کی تیاری کر رکھی ہے۔"

"نہیں جناب، میں تو کھانے وانے سے فارغ ہو کر، اطمینان سے گانا سنوں گا۔"

ادھر پائین بزم سے سُریلی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔

"تمہیں بزم طرب نوشہ، مبارک ہو، مبارک ہو"

پھڑکنے والے ایک طرف سے پھڑک کر داد دے رہے تھے۔

"ماشاء اللہ" "سبحان اللہ" "بھئی واہ" "واہ وا" "غضب کا شعر ہے" "لطف کا شعر ہے" "مزے کا شعر ہے" "پھر کہنا" "غضب کر دیا"......

ایک گوشہ میں، چند نفاست پسند احباب، ریش و بروت تراشیدہ، چست اور تنگ سلک اور ٹوئیڈ کی شیروانیاں، رنگ برنگ کے پاتابے، اور بائیں ہاتھ کی کلائیوں پر سونے چاندی کی گھڑیاں پہنے، ایک دوسرے سے لگے چمٹے، اس طرح بیٹھے تھے کہ اس کی گود میں اس کا زانو دبا ہوا ہے، اور اس کے کندھے پر اس کا ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ دمبدم سگریٹ کے کش لیتے جاتے اور ساری محفل کو دھواں دھار کرتے جاتے تھے۔

ادھر سے ذرا ہٹ کر، نوعمروں کا ایک اور جھمگٹا تھا، جو اپنے نازک اور نفیس چہروں، رنگ برنگ کی تنگ پوشتنوں سے گانے والی نوجوان چھوکریوں کو بھی شرما رہے تھے۔

ان کے پیچھے دولہا کے ماموں، موچھوں پر تاؤ دیتے، اپنے بڑے بوڑھے ساتھیوں کے حلقے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اس حلقے کا رنگ ہی جدا تھا۔ کسی کی سفید، فرنچ وضع کی داڑھی پر حنا کا خضاب بہار دے رہا تھا، کسی کی لمبی لمبی گل دار موچھیں، کسی کی کالی کالی گھنی داڑھی کے اندر سے دو روشن آنکھیں مشعلوں کی طرح چمک رہی تھیں اور کسی کی کالی "خشخشی" داڑھی کے درمیان بکھرے ہوئے سفید سفید بال، گنگا جمنی روپ یا دھوپ چھاؤں کا سماں دکھا رہے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنی خاص اصطلاحوں میں لطف سرود کا پورا پورا حق ادا کر رہے تھے۔

میں نے محفل سے اُٹھنے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ لیکن دولہا میاں کی اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔ اور عزیز بھی روک رہے تھے۔ کہ تم چلے جاؤ گے تو بیٹھے گا کون۔ میں نے کہا۔

"تو یہ محفل کچھ کم ہے؟"

"اُس سے کیا ہوتا ہے۔ یہی تو موقعے ہوتے ہیں۔ عزیز اور دوست پھر کس دن کے لئے ہیں کیا یہ موقعے روز آتے ہیں"

"کیوں نہیں، بشرطیکہ تم چاہو۔ خیر یہ موقع توخوشی کا ہے۔ رفافت کا وقت تکلیف کا ہوتا ہے"

"بھئی کیا آدمی ہو۔ خدا نہ کرے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خوشی اور لطف، عزیزوں، دوستوں کے ساتھ دو بالا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس منطق سے حاصل کیا، کہہ دیا کہ آپ نہیں جاسکتے، بس تصفیہ ہوچکا۔

سچ تو یہ ہے کہ گرمی کی تکلیف تھی ورنہ شاید اس اصرار کی ضرورت نہ ہوتی۔ غرض تھی، کباب، شیرمال، انڈے اور مرغ کی سفید بریانی، رنگین پلاؤ، ڈبل کا میٹھا، سیویوں کا میٹھا، بادام کا میٹھا، سب کچھ کھا کر بھی، میں دن بھر، دولہا کے قریب، آدھا مسند عروس پر اور آدھا چاندنی کے فرش پر شام کے پانچ بجے تک بیٹھا رہا کبھی پان کھاتا کبھی سگریٹ پیتا اور کبھی سگریٹ پیتا اور پھر پان کھاتا، پہاڑ سا دن کاٹا۔ پانچ بجے، جب سب اہل محفل تھک کر مردہ ہوگئے، تو چائے پینے کے لئے اُٹھے۔ میں بھی نماز کے بہانے مسجد گیا اور تھوڑی دیر کے لئے دماغ کو سکون نصیب ہوا۔ پھر جلد ہی ہاتھ منہ دھوکر، چائے پینے کے لئے حاضر ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر چائے کا لطف بھی دو بالا بلکہ "سہ بالا" ہوجاتا ہے۔ حوصلہ مند دو دو تین تین پیالیاں پی گئے پھر بھی "ہل من مزید" کی صدائیں لب پر جاری تھیں۔ چائے کا سامان اُٹھنے کے بعد سب نے پھر پان چبانا اور سگریٹ جلانا شروع کیا۔

یقین تھا کہ اب جو محفل جمے گی تو خوب ہی لطف رہے گا۔ لیکن ڈھلتے دن کی دھوپ اور پھر اس گھٹن کا مقابلہ دشوار تھا۔ میں نے ہمت ہار دی۔ اور ادھر اُدھر ٹہل کر شام کرنے ہی کو مناسب جانا۔

چراغ جلے جب واپس آیا ہوں محفل کا وہی انداز تھا وہی لطف اور وہی قہقہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس تربتر غذا کے ہضم کرنے کی بھی کوئی صورت نکالنی چاہئے۔ چل کر جلوے کی گڑبڑ کیوں نہ شروع کروں؛ رات کے نو دس بجے تک بہرحال وقت کاٹنا تھا۔ پھر دلہن والوں سے ہماری قرابت بھی تھی۔ خواہ مخواہ دخل درمعقول ہوکر وقت گذارنے کے لئے مشغلہ پیدا کرلینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ یہ تصفیہ کرکے، میں دلہن کے بھائی کو ڈھونڈنے لگا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ زنانہ مکان کی طرف گیا کہ وہاں سے کسی کو بلاکر سلسلہ جنبانی شروع کروں۔ لیکن وہاں بھی رسائی مشکل تھی۔ کیونکہ دروازے پر سواریاں تیار کھڑی تھیں اور پردے کا انتظام تھا۔ جب سواریوں کو ہٹنے میں بہت دیر ہوگئی تو

میں سیدھا زنانہ دروازے پر پہنچا۔ آواز دینے ہی کو تھا کہ اندر سے سسکیوں کی اور رونے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں
میں نے خیال کیا کہ شاید کوئی عزیز جلوے تک ٹھہر نہیں سکتے ہوں گے۔ دلہن سے رخصت ہو کر جا رہے ہیں۔ اور دلہن عادت
کے مطابق رو رہی ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں کسی کے ڈانٹنے اور خفا ہونے کی بھی صدا سُنائی دی۔ شادی کے گھر میں یہ
چیز کچھ غیر مانوس سی تھی۔ مجھے دریافت حال کا خیال ہوا۔ اپنے گھر کی ملازمہ کو آواز دی۔ وہ باہر آئی تو دیکھا اس کی آنکھ
سے آنسو جاری ہیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟" اس نے کہا "دلہن کے نانا آئے ہیں ......
وہ بہت خفا ہو رہے ہیں۔ اور اپنے لوگوں کو سوار کر کے لے جا رہے ہیں۔" میں اب مطلب سمجھا۔ میں نے کہا۔ اچھا ذرا
انھیں میری طرف سے آداب عرض کر، اور کہہ کہ میں باہر کھڑا ہوں۔ اگر زحمت نہ ہو، تو یہاں تک تشریف لائیں
میں انھیں سمجھا لوں گا۔ اس نے کچھ اور کہنا چاہا، لیکن میں زنانہ حصے سے باہر نکل چکا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ بڑے
میاں مذہبی آدمی ہیں کسی رسم رسوم پر خفا ہو گئے ہوں گے اور بیوی بچوں کو لئے جا رہے ہیں میں انھیں سنبھال
لوں گا۔ اتنے میں بڑے میاں، نہایت مغموم لکڑی ٹیکتے باہر نکلے۔ میں نے ادب سے سلام کیا۔ اور ان کا غصہ ٹھنڈا
کرنے کے خیال سے کہنے لگا "عورتیں، ہوتی ہیں ناقص العقل، خواہ مخواہ یہ رسم و رسوم کے جھگڑے لے بیٹھتی ہیں .....
یہ سُن کر، وہ کمر تان کر سیدھے کھڑے ہو گئے، اور آنکھوں سے آگ کے شعلے برسا کر کہنے لگے۔ ذرا آپ اپنے
بھائی کو تو دیکھیے ... چلے ہیں عورتوں کی عقل پر رحم کھانے، مرد ہو کر کوئی رسم ترک نہیں کر سکتا"۔

"قبلہ یہ بھی اُن کی والدہ اور بہنوں ہی کے ڈھکوسلے ہیں"

"اپنا دل نہ چاہے تو بچاؤ کے سینکڑوں پہلو ہیں۔ ماں بہنوں کا آسرا خوب لیا۔ آجکل کے لونڈے تو عورتوں سے
زیادہ ناقص العقل ہیں، ہر چیز خلاف شرع، ہر بات کافروں کی سی"

بڑے میاں کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکے، اور پھر کہنے لگے
"وہاں وہ حالت ہے، اور یہاں رنڈیاں نچوائی جا رہی ہیں۔ کیسے خون سفید ہو گئے ہیں"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"قبلہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ آخر معاملہ کیا ہے"

"تم پڑھے لکھے ہو، تم بھی ؟ اس لہو و لعب سے باز نہیں رکھ سکتے ؟ اچھا اگر تمہاری والدہ بیمار پڑی دم توڑتی

ہوتیں، تو کیا تم اس ہنگامہ کو جائز رکھتے "۔ خدایا اس دنیا پر قہر کیوں نہیں نازل ہوتا۔ اللہم احفظنا من عذاب النار"،

اب بڑے میاں پر پوری رقت طاری تھی۔ اور ان کے رونے کی آواز سن کر، زنانے میں کہرام مچ گیا۔ میرے حواس مختل تھے۔ کبھی زنانے دروازے کی طرف بھاگنا چاہتا تاکہ حقیقت حال معلوم کروں اور کبھی بڑے میاں کو سمجھانے کے لئے ان کی طرف بڑھتا، لیکن ان پر ایسی رقت طاری تھی، شدت غم سے ان کی سفید داڑھی کا بال بال اس طرح کانپ رہا تھا اور جسم کی بوٹی بوٹی ایسی پھڑک رہی تھی کہ، ان کو دلاسا دینے کی کوشش کرنا، ان کے غم کا مضحکہ اڑانا معلوم ہوتا تھا۔ اُدھر گھر میں ایسا کہرام برپا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کوئی میت گھر سے نکل رہی ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو اچانک کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں اسی کشمکش و پیچ میں کھڑا تھا کہ دلہن کے بھائی، صورت سُکھائے، اُدھر سے گذرے۔ نانا کو جو روتے دیکھا تو سیکل پھینک ان کے گلے پڑکے رونے لگے۔ مجھے بڑا تعجب تھا کہ یہ لوگ، اور خاص طور پر دلہن کے بھائی جو چند ساعت پیشتر، دعوتیوں کی سربراہی میں مصروف تھے، اچانک کس غم جانکاہ میں مبتلا ہوگئے کہ شادی کے گھر میں واویلا مچ گئی۔ یہ سب لوگ تو اس غم پنہاں کے محرم راز تھے۔ اور میں جو صبح سے ان کے ساتھ تھا، ناواقف محض تھا۔ یہی سوچتے ہوئے تھوڑی دیر تک، میں چپکا ایک دیوار سے لگا کھڑا رہا۔ جب ان دونوں کی رقت کچھ کم ہوئی تو دلہن کے بھائی کو بڑے میاں سے علحدہ کیا۔ بڑے میاں نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیا حال ہے؟"

"بے چینی بہت ہے۔ اب تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹر نے کئی پچکاریاں دیں۔ کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ٹھہر ٹھہر کر بنجا کا نام دُھرا رہی ہیں"

یہ کہتے ہی کہتے پھر طوفان اُمڈ آیا۔ اور اندر اور باہر دونوں جگہ سے آہ و بکا کی ایک زوردار صدا اٹھی۔

ادھر محفل نشاط سے نغموں اور قہقہوں کی صدائیں برابر اُٹھ رہی تھیں۔ گانے والی گا رہی تھی۔

خوشی کا وقت ہے، اچھا سماں ہے، خوب محفل ہے"

اب تو مجھ سے بھی ضبط نہ ہوسکا، بے اختیار آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ حالانکہ وجہ اب تک معلوم نہ ہوسکی تھی۔

مجھے روتا دیکھ کر، دلہن کے بھائی میرے پاس آئے اور سمجھانے لگے۔

"خیر، جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ نصیر بھائی (دولہا) کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان کی خوشیوں پر پانی پھر جائے گا۔ جایئے جلدی کیجئے۔ میں جلوے کی تیاری کراتا ہوں۔ جو کچھ ہو، دلہن کے جانے کے بعد"۔ وہ برابر ہچکیاں لے رہے تھے۔ میں نے پوچھا "آخر معاملہ کیا ہے؟ کون بیمار ہیں؟"

"اماں دواخانے میں ہیں۔ کل سے بے ہوش ہیں۔ رت جگے کے دوسرے روز ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ گڑبڑ میں بے احتیاطی ہو گئی ہوگی۔ پیر کو دواخانہ بھیجا گیا۔ آج صبح سے حالت ذرا خراب ہے"۔

"تو پھر یہ ہنگامہ کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ عقد ہو چکا، کافی تھا"۔

"ہم تو مان بھی لیں۔ لیکن پھوپی ماں (دولہا کی ماں)، اور ان کے لوگ اس کو نہیں مان سکتے"۔

"تو کیا والدہ کی بیماری کی انھیں خبر نہیں؟"

"اطلاع تو تھی۔ لیکن شاید اس کی خبر نہیں کہ آج صبح سے ان کی حالت اچھی نہیں ہے"۔

"اچھا۔ تم نانا جان، اور ان کے گھر کے لوگوں کو سوار کر کے روانہ کردو۔ میں سب انتظام کر لیتا ہوں"۔

"لیکن انہیں، نصیر بھائی کو اور نجما کو اس کی خبر نہ ہو"۔

"اس کا اطمینان رکھو۔ لیکن نجما کو بھیجنے کی ضرورت ہی کیا پڑی ہے؟"

"بھائی، آپ کو معلوم نہیں۔ پھوپی ماں اور شاید نصیر بھائی بھی اس پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ دلہن کو جانے ہی دیجئے"۔

"لیکن نجما کا کیا حشر ہوگا؟"

"یوں بھی، اس کا برا حال ہے لیکن پھوپی ماں، دلہن کو لئے بغیر جا ہی نہیں سکتیں۔ اس عمل درآمد کو بدلنا آپ کے میرے بس کی بات نہیں ..... پھر اب باقی کیا رہا ہے سب کچھ تیار ہے۔ آپ مہربانی کیجئے۔ دولہا جس قدر جلد روانہ ہو جائے اچھا ہے"۔

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں سیدھا زنانہ دروازے پر پہنچا۔ اور دولہا کی ماں کو بلایا۔ وہ بھی رو رہی تھیں ان کو روتا دیکھ میری ہمت بندھی کہ انھیں راضی کر لینا آسان کام ہے۔ بچاری دلہن کی جان تو عذاب سے چھوٹ جائے گی

یہ سوچ کر میں نے پہلے تو انھیں دلاسا دیا۔ پھر سمجھایا کہ "دیکھئے۔ آپ کی بھابی کا حال خراب ہے وہ تو خیر خدا کے بھروسے پر ہیں۔ آپ دلہن کے ساتھ ہمدردی کیجئے۔ اس کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ اگر اس کو یہیں چھوڑ جائیے تو کیا ہرج ہے؟"

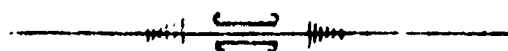
میرے آخری الفاظ سنتے ہی، اُن کے آنسو خشک ہو گئے۔ اور گھبرا کر کہنے لگیں "بجا میری بیٹی ہے۔ بیٹی سے بڑھ کر ہے۔ اس کے لئے جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اسی لئے تو گھر لے جانا مناسب سمجھتی ہوں۔ وہاں اس کا دل بہل جائے گا۔ لیکن..... لیکن یہ کیسے ہو سکے گا کہ دولہا، دلہن کے گھر سے تنہا واپس جائے۔ یہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ آپ ابھی رسوم سے ناواقف ہیں۔ یہ بدشگونی ہے۔ ہاں وہ چاہے تو کل بھیج دونگی۔"

اس گفتگو کے سننے کی اب مجھ میں تاب نہیں تھی انھیں اسی طرح بکتا چھوڑ کر میں وہاں سے نکل گیا۔ مارے رنج کے برا حال تھا۔ میں ان کے تصفیہ کن لہجہ سے سمجھ گیا، کہ میں تو کیا، دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی ان کو اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکیگی۔ میں دولہا سے بھی ملنے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اگر وہ اس وقت میری بات نہ مانتا تو شاید میں اُسے مار بیٹھتا۔ وہ اپنی ماں کے خلاف مرضی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

مرنے والے تو بچ نہیں سکتے تھے، لیکن بیچاری، دلہن کی قید مصیبت، اور نزاکت حال پر دل مسوس رہا تھا۔ اسی پیچ و تاب میں، میں گھر لوٹ آیا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ، اِن اللہ کے بندوں نے ایک رسم بھی نہیں چھوڑی۔ روتے جاتے تھے اور رسم ادا کرتے جاتے تھے ۔ رسم ادا کرتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، اور جس وقت یہاں جلوے کی رسم پوری ہو رہی تھی اُدھر دلہن کی ماں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہی تھی۔

عبدالقادر سروری



شباب

کبھی جو جھوم کر اٹھوں تو ابرِ نو بہار ہوں
تڑپ کے گر پڑوں کبھی، تو برق شعلہ بار ہوں
جمال ہوں، جلال ہوں میں نور ہوں میں نار ہوں
شباب میرا نام ہے میں شانِ کردگار ہوں
مصور حیات کا لطیف شاہکار ہوں

میں رونمائے ذات ہوں، میں مظہرِ صفات ہوں
میں حاصلِ وجود ہوں میں وجہ کائنات ہوں
تبسم حیات ہوں، میں خندۂ نشاط ہوں
کسی کی چشمِ شوخ کی نگاہ التفات ہوں
جو مسکرا کے گر پڑے وہ برق بیقرار ہوں

گلوں کو وردِ بر زباں ہیں میری خود فروشیاں
زبان خار پر رواں ہیں میری سخت کوشیاں
بہار کی حرارتوں میں میری گرم جوشیاں
خزاں کی سرد مہریاں ہیں میری چشم پوشیاں

میری ہنسی بہار ہے میں خالق بہار ہوں

مری نگاہ شوخ کا گزر تجلیات میں
اسیر شش جہات ہیں مرے تخیلات میں
مری نظر دخیل ہے مزاج کائنات میں
میں چاند توں سے کیوں ڈروں نہیں خود ہوں انکی گھات میں
میں شہسوار زندگی، حریف روزگار ہوں

مرے ہی مد و جزر سے عروج اور زوال ہے
میرے بغیر ارتقائے زندگی محال ہے
میرے ہی عزم سے جوان دہر کہنہ سال ہے
مری ہی جرأتوں کا نام حکم ذو الجلال ہے
ضمیر روزگار ہوں، مزاج کردگار ہوں

ذرا جو اپنی شوخیٔ عمل کو اشتعال دوں
پہاڑ راستہ میں ہو تو مسکرا کے ٹال دوں
قبائے ماہ کھینچ لوں، کلاہ مہر اچھال دوں
سپہر کہنہ سال کی کمر کا خم نکال دوں
میں ضرب ذو الجلال ہوں، میں سیف کردگار ہوں

مری ہی لغزشوں سے ہے یہ رنگ و آب زندگی
مری غلط روی سے ہے یہ پیچ و تاب زندگی
مرے گنہ کے ذوق سے کھنچی شراب زندگی
مرے ہی دل کی گرد میں ہیں انقلاب زندگی
مری متاع زندگی، میں اسکا اشتہار ہوں

وہاج الدین شمیم

”ابوالحسن تاناشاہ روایات کی روشنی میں“

ابوالحسن تاناشاہ سلطنت گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ہے جو اپنی خوش طبعی اور نازک مزاجی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے عہد کی کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس سے اس کے صحیح حالات معلوم ہوسکیں اس کی ابتدائی زندگی بالکل تاریکی میں ہے۔ اب تک صحیح طور پر نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ کون تھا اور کہاں اس کی نشوونما ہوئی تھی۔ اس کے متعلق جو روایتیں زبان زد ہیں وہ کسی اور روشنی میں اسے پیش کرتی ہیں یعنی ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تاناشاہ قطب شاہی خاندان سے نہ تھا بلکہ وہ ایک دور دراز ضلع کا رہنے والا تھا۔ نواح تعلقہ سدی پیٹھ میں جو شہر حیدرآباد سے ۶۰ میل شمال مشرق میں واقع ہے اس کے متعلق بہت سی روایتیں سنی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالحسن اسی نواح کا رہنے والا تھا۔ روایت یہ ہے کہ ابوالحسن موضع انمنت گیری کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق ایک نوربافت یعنی ندافت خاندان سے ہے۔ یہاں اس کو تانو پکارتے ہیں۔

تاناشاہ کا وطن

انمنت گیری[1] ایک چھوٹا موضع ہے۔ تعلقہ سدی پیٹھ کے شمال میں تقریباً ۱۲ میل پر واقع ہے کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ مشہور مقام بہت آباد تھا اور ایک پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے

---

[1] انمنت گیری۔ موجودہ ضلع بندی کا لحاظ کرتے یہ تعلقہ سرسلہ میں شامل ہے گر سدی پیٹھ کی شمالی سرحد سے ملا ہوا ہے۔

بہت کچھ دلکش بھی تھا لیکن اب یہ ویران ہو گیا ہے اور اب صرف کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ اس موضع کے مالک مختار "اکنا مادنا"، دو برہمن بھائی تھے اور یہ اُس برہمن راجہ کے رشتہ دار تھے جس کی راج گوپال پیٹھ[1] میں راج دھانی تھی۔ راج گوپال پیٹھ کی بہت سی عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ اور اکثر مندر ہیں منجملہ اور عمارتوں کے علی پور[2] کی وادی بھی قابل ذکر ہے (جو علی پور گنڈی کے نام سے مشہور ہے) یہ ایسا مقام ہے جہاں ایک زمانے میں سیکڑوں چور قزاق چھپے رہتے تھے اور جہاں ہزاروں مسافر قتل و غارت کے شکار ہوتے تھے چنانچہ یہاں سرکار گولکنڈہ کی طرف سے ایک چوکی قایم تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان چوروں کا انسداد "اکنا مادنا" کے سپرد تھا۔ لیکن روایت ہے کہ یہ خود چوروں سے ملے ہوئے تھے اور حکومت کو بتانے کے لئے براے نام چوکی کی نگرانی کرتے تھے۔ اس قدر ضرور صحیح ہے کہ مسافروں کی سہولت کی خاطر ان لوگوں نے اس چوکی کے قریب ایک پختہ باولی جس کو "کونیر" کہتے ہیں تعمیر کرائی تھی جو آج تک ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ انت گیری سے کورٹہ تک ایک سڑک بھی تعمیر کرائی تھی اور اس کے دونوں طرف درخت بھی لگوائے تھے جو آج تک کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ اس سڑک کے متعلق کہا جاتا ہے یہ محض اس واسطے بنائی گئی تھی کہ ان کی لڑکی جو کورٹہ میں بیاہی گئی تھی اس کی آمد و رفت میں سہولت ہو۔

تاناشاہ کا خاندان اور نوربافوں کی اصلیت

قطب شاہی سلطنت کے زمانے میں جہاں جہاں قطب شاہی عملداری تھی علم ایستادہ کرنے کے احکام تھے۔ چنانچہ اب تک اکثر موضعوں میں سرکاری علم اور سرکاری عاشور خانے موجود ہیں اور اُن کے خاندانی محافظ اور مجاور بھی ہیں جو پایۂ تخت گولکنڈہ سے مامور ہوتے تھے۔ اور اُن کو اپنے فرائض انجام دینے کے صلے میں کچھ زمین بھی بطور انعام دی گئی تھی جو اب تک برقرار ہے۔ ظاہر ہے کہ مرور زمانے کے ساتھ ان کی نسلوں میں اضافہ ہوتا گیا اور آج ہر موضع میں ان کے کئی کنبے نظر آتے ہیں چونکہ مقامی لوگوں کے ساتھ ان کی بود و باش تھی اس لئے یہ لوگ ان کے ساتھ اس قدر گھل مل گئے کہ ان کا تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے مگر ان کے ناموں سے ان کے عقاید کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عقاید وہی ہیں جو شاہان قطب شاہیہ کے تھے۔ مثلاً ان کے نام علی صاحب

---

[1] راج گوپال پیٹھ۔ تعلقہ سدی پیٹھ کا ایک موضع جو سدی پیٹھ شمال مشرق میں ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے جس کے اطراف زبردست فصیل اب تک موجود ہے

[2] علی پور۔ انت گیری سے ۳ میل مشرق میں واقع ہے۔

حسین صاحب، ابن صاحب، گرڈ صاحب وغیرہ وغیرہ ہوتے تھے مگر مقامی ماحول کے اثر سے "علی گا، حسین گا، ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے کو نہ تو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں اور نہ ہندوؤں میں۔ مسلمانوں کو وہ ترک اور بڑی ذات سمجھتے ہیں اور ہندوؤں کو ہندو۔ اس طرح یہ دونوں فرقوں سے اپنا رشتہ نہیں جوڑتے۔ بلکہ اپنے کو الگ رکھتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں وہ سرکاری معاش کافی نہیں ہونے لگی تو انھوں نے روئی کا کام شروع کیا روئی کات کر تاگا بناتے اور تاگے سے نواڑ وغیرہ بننے لگے۔ بالآخر یہ ان کا پیشہ ہو گیا اور وہ اب اسی پیشہ سے پکارے جاتے ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ انت گیری میں بھی اس قسم کا ایک خاندان آباد تھا ایک بیوہ "حسین بی" تھی جس کے تین لڑکے تھے۔ بڑے کا نام "بڑے صاحب" منجھلے کا نام "علی صاحب" اور چھوٹے کا نام "تانے صاحب" تھا جو اکثر تانو پکارا جاتا تھا۔ بڑے دو بھائی روزانہ محنت مزدوری کے لئے جاتے تھے مگر تانو جو سب سے چھوٹا تھا گھر میں رہتا تھا اور لاڈ و پیار میں پل کر لاؤبالی اور آرام طلب ہو گیا آخر کو محنت سے جی چرانے لگا۔ اس کی ماں اس پر ہمیشہ خفا ہوتی رہتی اور اکثر مار دھاڑ بھی کیا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جس وقت تانو اپنی ماں کے ہاتھوں پٹیا جا رہا تھا اس وقت اکنا مادنا۔ اشنان کر کے واپس آرہے تھے۔ انھوں نے بہ نظر انصاف تانو کی ماں سے اس کو مارنے کا سبب دریافت کیا۔ ماں نے وجہ بیان کی کہ وہ آرام طلب ہے کام نہیں کرتا اور اس طرح وہ سزا کا مستحق ہے۔ "اکنا مادنا کو اس پر ترس آیا اور انھوں نے اس کو اپنے پاس کھانے کپڑے پر ملازم رکھنے کا وعدہ کیا اور اپنی گڑھی میں ساتھ لے گئے۔

تاناشاہ کی پرورش تعلیم اور ملازمت خانگی

تاناشاہ اب اکنا مادنا کی گڑھی میں آرام سے رہنے لگا اس کے ذمہ صرف اتنا کام تھا کہ روزانہ سویرے اٹھ کر اکنا مادنا کے واسطے بڑ کے پتر ولیاں لاتا۔ مگر وہ اس دوران میں تلنگی اور کچھ کچھ فارسی لکھنا پڑھنا سیکھنے لگا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ تاناشاہ پو پھٹے اُٹھ کر اس بڑ کے درخت کے پاس پہنچا جس کے پتے وہ روزانہ لے جایا کرتا تھا۔ اور جب پتے توڑ کر انھیں سمیٹ کر یکجا کر چکا تو اسے نیند سی آنے لگی وہ پتوں کی گٹھری کا تکیہ بنا سو رہا۔ یہاں تک صبح ہو گئی سورج کی تیز کرنیں اس پر پڑنے لگیں اتنے میں ایک کالا ناگ جو قدیم زمانے سے اس پیڑ کے قریب رہتا تھا۔ اس کے قریب آیا اور اس نے

پھن سے تاناشاہ کے چہرہ پر سایہ کرنے لگا۔

تاناشاہ کے واپس نہ ہونے سے اکنّا مادنّا کے کھانے میں دیر ہونے لگی تو وہ غضب ناک ہوکر ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئے لیکن انھوں نے عجیب نظارہ دیکھا۔ چونکہ وہ برہمن تھے اس لئے برہمنوں کے عقاید کے اعتبار سے فوراً سمجھ گئے کہ یہ لڑکا کسی روز ضرور بادشاہ ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے منتروں اور دعاؤں سے ناگ کو تاناشاہ سے علیحدہ کیا اور تانو کو جگایا۔ اگرچہ تانو بہت ہی شرمندہ ہوا مگر اکنّا مادنّا نے اس کے قصور سے چشم پوشی کی اور اپنے ساتھ لے گئے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے تانو کو اپنے پاس بلایا اور بہت ہی نرم لہجہ میں کہا کہ دیکھ ہم تیرے آقا اور مالک ہیں اور تو ہمارا نمک خوار ہے اگر تو کبھی کہیں کا بادشاہ یا بڑا آدمی ہوجائے ہمیں کیا دے گا۔ تانو (تاناشاہ) تو اس کو مذاق سمجھ کر ٹالتا رہا مگر جب انھوں نے اصرار کیا تو تانو نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ اچھا اگر بادشاہ ہوجاؤں تو میری اختیار میں جو بڑی چیز ہوگی وہ تھیں دوں گا۔ مگر چونکہ وہ برہمن اپنے علم کی وجہ سے اپنے اس عقیدے پر پورا بھروسہ رکھتے تھے اُس کی گفتگو پر بھروسہ نہ کرکے اس سے ایک تحریری اقرار نامہ بھی لکھوالیا۔ چونکہ تاناشاہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ بادشاہ بھی ہوگا۔

تاناشاہ کی تخت نشینی

۱۶۷۲ء میں عبداللہ قطب شاہ سلطان گولکنڈہ کا انتقال ہوا چونکہ بادشاہ کے کوئی لڑکا نہ تھا اس لئے امرائے سلطنت نے یہ تصفیہ کیا کہ بادشاہی کے لئے ایسا شخص منتخب کیا جائے جو منجانب اللہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنی سلطنت اور اس کے باہر کے تمام حکمرانوں میں یہ اعلان کیا کہ فلاں روز بادشاہ کا انتخاب ہوگا۔ سب میدان گولکنڈہ میں جمع ہوں۔ اب کیا تھا وقت مقررہ پر لاکھوں آدمیوں کا جم گھٹا ہوگیا جس میں اکنّا مادنّا بھی تاناشاہ کو لئے پیچھے کھڑے تھے اور سب سے آگے راجے مہاراجے اور بڑے بڑے امرا کا اجتماع تھا

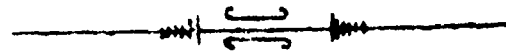
اس زمانے کے رواج کے مطابق ایک ہاتھی کے سونڈ میں موتیوں کا ہار دیا گیا تاکہ جس کسی کے گلے میں ہاتھی ہار ڈال دے وہ بادشاہ تسلیم کرلیا جائے۔ ہاتھی ہارے کر صفیں پار کرتا ہوا چکر لگاتا رہا اور بالآخر اسی تاناشاہ (تانو) کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ سب کو حیرت ہوئی کہ یہ ہار ایک غریب لڑکے کے گلے میں کیسا پڑا جو کسی طرح مستحق شاہی نہیں تھا۔ اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ ہاتھی کو پھر ہار دیا جائے۔ ہاتھی کو دوبارہ گشت کرایا گیا۔ جب اس مرتبہ بھی ہار تانو کے گلے

یں پڑا تو پھر تیسری مرتبہ گشت کرایا گیا۔ تیسرے دفعہ بھی ہار تانو کے گلے میں پڑا۔ اس کے بعد یقین کر لیا گیا کہ تانو ضرور منجانب اللہ ہے۔ فوراً تانو کو محل کے اندر لے جا کر شاہی کپڑے پہنا کر اس کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا اور تانو قطب شاہی خاندان کی روایت کے مطابق اپنا نام ابوالحسن قطب شاہ رکھ کر "تانا شاہ" کے لقب سے مشہور ہوا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی لڑکی سے شادی بھی کر لی۔

اکنا مادنا کی دیوانی

چند دنوں کے بعد اُس کے پُرانے آقا اور مالک اکنا مادنا تانا شاہ کے محل پر حاضر ہوئے۔ دربان نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ دو برہمن جہاں پناہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اجازت ملی کہ اندر آنے دو۔ یہ دونوں آداب شاہی بجا لا کر ایک طرف بیٹھے۔ بادشاہ ان کو پہچان نہ سکا اور ان کے آنے کا سبب دریافت کیا اس پر انھوں نے اپنی سرگذشت سنائی اور ساتھ ہی ساتھ بادشاہ کے واقعات بھی کہتے گئے تانا شاہ مسکراتے ہوئے اپنے پچھلے زمانے پر نظر دوڑانے لگا اور ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اکنا مادنا نے تانو کا وہ اقرارنامہ پیش کیا جو امانت گیری میں مرتب پایا تھا۔ تانا شاہ اب اچھی طرح سمجھ گیا کہ یہ وہی اس کے قدیم آقا ہیں جنھوں نے اس کی پرورش کی اور تعلیم بھی دی تھی۔ لہذا اب تانا شاہ نے اپنے قول و تحریر کے مطابق ان کو سرکار گولکنڈہ کی دیوانی عطا کی۔ اس طرح اکنا مادنا گولکنڈہ کے رکن رکین بن گئے۔

شیخ محمد خلیل اللہ متعلم سال چہارم



محفل سخن کی چند شمعیں

شاعر ہیں اور مجسم شعر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں "زلف پریشان" کے مضامین تو بہت ہیں لیکن کبھی اپنے گیسوؤں کو بگڑنے نہیں دیتے۔ ان کی شاعرانہ نیازمندیوں کا ہر پہلو ناز سے خالی نہیں ہوتا خود تڑپتے ہیں اور دوسروں کو تڑپاتے ہیں یہی ان کی حسن کاری ہے۔ شاعری کو موسیقی میں رنگ دیتے ہیں اور اس طرح محفل پر وجدانی کیفیات طاری کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار بربط دل کے ہم آہنگ نغمے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے سننے والوں کے دلوں میں روح بن کر سما جاتے ہیں۔ اقبال کے پرستار ہیں لیکن تغزل کے بغیر ان کی زندگی مشکل ہے۔ ان کے جذبات کا دھارا ہمیشہ غزل کی شادابیوں میں ہی خوش فعلیاں کرتا نظر آتا ہے۔ وہ "حسین عشق" ہیں اور جہاں حسن نظر آتا ہے وہاں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زندگی اور زندہ دلی کا ایک دریا جو ہر جگہ بہنے لگتا ہے۔ ان کی گیسوؤں کی پریشانی میں جن کو سنوارنے کی کوشش کی جاتی ہے، زندگی کی ساری سرشاریاں لہراتی نظر آتی ہیں۔ سادہ مزاج ایسے کہ جہاں بناوٹ دیکھتے ہیں گھبرانے لگتے ہیں۔ روتے کبھی نہیں، ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں یہی ان کی زندگی ہے طبیعت میں لاپرواہی ہے

اور جو دل میں ہوتا ہے زبان پر لاتے ہیں۔ زندہ دل ایسے کہ جذبات عشق سے بھی کھیلنے لگتے ہیں اور بزم حسن میں بھی جہاں "دستور زبان بندی" ہوتا ہے، کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ طبیعت حسن کارانہ پائی ہے اور ہر چیز میں حسن کے متلاشی رہتے ہیں شاعری میں شبابیات اور شوخی کا رنگ غالب ہے۔ بعض وقت صاف گوئی سے کام لیتے ہیں تو بہت کچھ لکھ ڈالتے ہیں۔ قدیم جکڑبندیوں سے بچتے ہیں لیکن اتنا بھی نہیں کہ نظمیں ٹیگور کا ترجمہ بن جائیں۔

شاعر نہیں ہیں مگر شاعر بن گئے ہیں۔ ان کی ایک نظم جو بحر کی پابندیوں سے بہت آزاد تھی، ناسشناسوں کی محفلوں میں ایسی مقبول ہوئی کہ ان کو غلط فہمی ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں اور لکھے جاتے ہیں۔ کہے جاتے ہیں اور گاتے ہیں گردن کے خم اور انگلیوں کے ارتعاش کو ترنم سمجھتے ہیں اور ترنم کو شاعری۔

لکھ لیتے ہیں۔ قدیم دبستان کے پیرو ہیں لیکن سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے ہیں بعض وقت نہ ہنس کی چال باقی رہتی ہے اور نہ کوّے کی صرف پھدکنے لگتے ہیں پہلے تحت اللفظ سناتے تھے۔ اب گانے لگے ہیں۔ اور گانے میں فن کارانہ آتار چڑھاؤ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خود ساختہ "سخن شناس" ہیں۔ اپنی ہر چیز کو توصیفی تمہید کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن دوسروں کے شاہکاروں کو بھی قابل ستائش نہیں سمجھتے۔ ان کی شاعری بے رنگ، بہر رنگ ہے اس لئے "معجون مرکب" بن کر رہ گئی ہے۔

شاعر ہیں اور شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے تبسم میں بھی افسردگی کی شان ہوتی ہے "قنوطیت" کا رنگ غالب ہے ان کا کلام "جوش کی شبابیات ہیں میر کا سوز و گداز" معلوم ہوتا ہے۔ ان کا ہر شعر دل سے نکلتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے ان کے ہر ساز میں سوز کا ایک پہلو ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی ہر رنگینی میں دل کی دھڑکنوں کو بکھیرتے ہیں اور دل کی ہر دھڑکن سے رنگینیاں پیدا کرتے ہیں۔

ان کا تخلص تو ہر شخص سنتا ہے لیکن کلام بہت کم لوگوں نے سنا ہے۔ شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ شعریت کے

دلدادہ ہیں. خدمت ادب کی مصروفیتیں فکر سخن کا موقع نہیں دیتیں. جذبات سے مجبور ہو کر کبھی کبھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ان کے کلام میں زور سخن کی تمام صلاحیتیں نظر آتی ہیں.

شعریت کے قلب پر ایک نشتر اور ذوق سخن کے سینہ پر ایک بوجھ. شاعری سے کوئی تعلق نہیں لیکن ہر مشاعرہ میں ناخواندہ مہمان بن کر نازل ہو جاتے ہیں. عینک پوش آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سناتے ہیں. ان کے اشعار مزاحیہ نہیں ہوتے لیکن ان کی سنجیدگی خود ایک دعوت قہقہہ ہوتی ہے. ارباب محفل ہنسے بغیر نہیں رہتے لیکن ان کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی. سناتے ہیں، سنائے جاتے ہیں سننے والے بیزار ہو جاتے ہیں لیکن سنانے والا بیزار نہیں ہوتا.

زندگی کی مصروفیتوں نے ان کو شاعری کے میدان سے دور کر دیا ہے وہ شاعر تھے اور شاعر ہیں. لاابالی طبیعت پائی ہے. خوددار اتنے کہ خاکساروں سے خاکساری کرتے ہیں لیکن سربلندوں سے کبھی انکسار گوارا نہیں ہوتا. حسن کاری ان کا خاص موضوع ہے. اب بھی کبھی جذبات کی دنیا میں کھو جاتے ہیں تو کچھ لکھے بغیر نہیں رہتے. اتنے شعریت نواز کہ "آواز قدم" سے بھی شاعری پیدا کر دیتے ہیں. سگار منہ میں ہو اور فرصت ملے. تو ان کی گل افشانیاں "شباب شعر" کا دریا بہانے لگتی ہیں سگار تو ہمیشہ منہ میں رہتا ہے لیکن فرصت انہیں بہت کم نصیب ہوتی ہے.

ایک مقدس خاندان کی سربرہستی. بہت خاموش لیکن ہر خاموشی معنی خیز. زندگی کی الجھنوں کو ٹھکراتے ہوئے سرشاریوں کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں. بے تکلف دوستوں کے لئے سامان دلچسپی ہیں. ان کی شاعری سوئے ہوئے جذبات کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیتی ہے. اور سامع لذت گناہ میں کھو جانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے.

اس محفل کے میر لیکن بہت متین ہر متانت شوخیوں سے معمور. زندگی کے تلخ لمحے ان کو مصروف کار رکھتے ہیں لیکن وہ عدیم الفرصتی میں بھی وقت نکال ہی لیتے ہیں. ان کا تخیل بہت بلند ہے. ادبی خدمات میں بہت شہرت حاصل کی ہے لیکن شعرگوئی کا راز ابھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے.

صورت پر پریشانی کے آثار، لباس میں بے ترتیبی، خیالات میں انتشار، شاعری کو اقلیدس سمجھتے ہیں۔ الفاظ چن چن کر جماتے ہیں اور خیال کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی ہر نظم ایک معمہ ہے جس کو حل کرنے کے بعد کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے مغلق الفاظ کے۔

ان کی محفل میں اب بھی شمع جلتی ہے جس پر پروانے نثار ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے اب بھی ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ ان کے گلشن میں اب بھی بلبلیں گاتی ہیں۔ ان کا معیار حسن اب بھی وہی یعنی نرگسیں آنکھیں زلف سنبل، صراحی دار گردن، پتلی کمر۔ ان کے معشوق کی کمر میں اب بھی تلوار لٹکی ہوئی۔ ان کے آئینہ ادب پر اب بھی آبی دوپٹہ کا نقاب۔ ان کی محبت اب بھی "وصال و فراق" کی حدیثوں کا ایک افسانہ۔ غرض ان کے لبوں پر ہمیشہ "قدامت پرستی زندہ باد" کا نعرہ رہتا ہے۔

شعر کہتے ہیں لیکن سناتے شرماتے ہیں۔ آنکھ میں آنسو نہیں رہتے لیکن چہرہ پر ہمیشہ آثار گریہ نظر آتے ہیں کبھی کبھی ہنس لیتے ہیں تو گویا اپنی نوجوانی پر ایک احسان عظیم کرتے ہیں۔ جھجکتے ہوئے فکر سخن کرتے ہیں اور فکر سخن کرتے ہوئے جھجکتے ہیں لغزش کھاکر سنبھلتے ہیں اور سنبھل کر لغزش کھاتے ہیں مشق جاری رکھیں تو کامیاب شاعر بن سکیں گے

بہت اچھے شاعر ہیں۔ مادی حیثیت سے جراحت پاش لیکن روحانی حیثیت سے جراحت رسیدہ۔ مریضوں کے لئے مسیحا اپنے درد آشناؤں کے لئے مسیحا کے محتاج لیکن ان کی نظریں زہریلے جراثیم بھی شباب و شعر کا سرمایہ ہیں۔ آسمان سخن پر "بدر" بن کر چمکتے تھے لیکن اب خاموشی کے بادل میں چھپے بیٹھے ہیں شاعری کو ان کی روشنی کی ضرورت ہے

شعرستان اورنگ آباد کی پیداوار۔ ان کی من کی بانسری کے نغمے اب تک فضا میں گونج رہے ہیں لطیف انداز میں کہتے ہیں اور کہہ کر لطافت پیدا کر دیتے ہیں۔ پرانے پیمانوں میں نئی شراب چھلکاتے ہیں خود بھی مست ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی مست بناتے ہیں۔

گلستان سخن کے شمیم روح پرور لیکن زندگی کی گھاٹیوں سے دور مہکنا چاہتے ہیں۔ ان کی جدت بھی قدامت کی حدوں میں محصور ہوتی ہے۔

کہتے ہیں ازدواجی زنجیروں نے ان کے پائے سخن کو آگے بڑھنے نہ دیا۔ اگر ایسا ہے تو شعریت کی یہ تباہی نوجوانوں کے لئے ,,ہوشیار باش،، کا پیام ہے۔

دبستان لکھنو کے ایک پختہ مشق شاعر۔ اچھا لکھتے ہیں۔ جب قدامت پر اتر آتے ہیں تو شاعری کو قدامت کے رنگ میں بسا دیتے ہیں لیکن جب جدید انداز میں گلفشانی کرتے ہیں تو جدید رنگ کی سرشاریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے نغمے بہت کم بلند ہوتے ہیں لیکن جب بلند ہوتے ہیں تو سارے ماحول کو مجسم نغمہ بنا دیتے ہیں ان کے دل میں درد ہے اور زندگی شائد اسی کا نام ہے۔

زندہ دلوں کی محفل کی جان ہیں اور خیر سے شاعر بھی بن گئے ہیں۔ ستائے جانا ان کی فطرت میں داخل ہے لوگ چھیڑتے ہیں تو جھنجلا اٹھتے ہیں۔ جب کوئی نہیں چھیڑتا تو خود چھیڑتے ہیں اور اس طرح چھیڑ چھاڑ کی دعوت دیتے ہیں۔ اپنا کلام بہت کم لوگوں کو سناتے ہیں اس لئے کہ ان کی نگاہ میں کوئی بھی سخن فہم نہیں۔ اشاعت کے لئے نظمیں بھیجتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں چھاپتا۔ اور وہ مدیروں پر کور ذوقی کا الزام دھر کے جی کو تسکین دیتے ہیں۔ ,,لذت آزار،، ان کی نفسیات کا نچوڑ ہے۔ وہ جیتے ہیں صرف آزار سہنے کے لئے۔

زندگی میں دو تین نظمیں لکھ لی ہیں یا لکھائی ہیں۔ ہر محفل میں ان ہی کو سناتے ہیں اور اس مضحکہ خیز انداز میں سناتے ہیں کہ زاہدوں کی بھی خشک مزاجی کا بھرم کھل کر رہ جاتا ہے۔ مجمع میں نمایاں ہونے کی بہت کوشش کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی طرف کوئی بھی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ ہر شخص ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ ہر ایک کے دامن پر دراز ہو جانا چاہتے ہیں۔

مغالطہ کی یہ جیتی جاگتی تصویر بھی عجیب چیز ہے۔

اچھے شاعر ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ اپنے آپ کو حزیں سمجھتے ہیں لیکن ان کے حزن پر تبسم کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے۔ محبت ان کا نصب العین ہے۔ اور محبت کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کا کلام جذباتی ہوتا ہے اور وہ جذبات کے رو میں بہتے نظر آتے ہیں "ترک سخن" کا عزم کیا ہے۔ فطرت انہیں اس عزم میں کامیاب کردے تو یہ بڑی ستم ظریفی ہوگی۔

میکش

اسی محفل کی ایک اور "کافوری" شمع چھوٹی جا رہی ہے۔ ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس شمع کو جل مرنے والے پروانوں کے ڈھیر سے اٹھا کر سر محفل لے آئیں۔

(ادارہ)

شاعر بھی ہیں اور شاعر گر بھی اور کبھی کبھی شعر بھی بن جاتے ہیں۔ سانولے سلونے، آنکھوں میں ہمارے شاعروں کے خیالی معشوق کا سا تیر افگنی کا شوق مگر دل میں درد اور کسک ہے۔ معشوق کے جذبات کے اظہار میں ان کی جولانی طبع خوب جوہر دکھاتی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت انھیں اپنی ہی تصویر کھینچنی ہوتی ہے۔ رنگین اور شوخ مزاج —— ان کا مقبول کلام بھی وہی ہے جس میں ان کی طبیعت کا اصلی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ شعر کہنے کا اتنا شوق ہے کہ اس کم عمری میں چشم بددور ایک ضخیم دیوان تیار کر چکے ہیں۔

برسات کی ایک سُہانی شام

ہیں فضائے چرخ پر پھر بدلیاں چھائی ہوئی
پھر بہاریں لُٹ رہی ہیں جوش پر آئی ہوئی

کھنچ رہی ہے پھر فلک پر اک کمانِ ہفت رنگ
پھر کسی افسردہ دل کی موت ہے آئی ہوئی

اس قدر پُر کیف ہے گرتے ہوئے پانی کا شور
مہرِ عالمتاب کو ہے نیند سی آئی ہوئی

چہرۂ تاباں پہ کس نے ڈال دی کالی نقاب
رو رہی ہے نو عروسِ شام شرمائی ہوئی

چومتی ہیں پھر نگاہیں سبزہ زارِ دشت کو
جس میں کالی ناگنیں پھرتی ہیں لہرائی ہوئی

غنچہ و گل ہنس رہے ہیں لہلہاتا ہے چمن
نکہتِ گُل باغ میں پھرتی ہے اترائی ہوئی

پتّی پتّی جھومتی ہے وجد میں ہے شاخسار — سروِ سنبل پر بھی ہیں سرمستیاں چھائی ہوئی

چشمِ نرگس کیا کھلی گویا گلستاں کھل گیا — ہر طرف بادِ صبا پھرتی ہے اٹھلائی ہوئی

میکدہ پر جھوم کر آیا ہے ابرِ نوبہار — جام و ساغر پر نظر پڑتی ہے للچائی ہوئی

بھر رہے ہیں پھر کلیلیں مہوشانِ سیم ساق — چال اٹھلائی ہوئی ہے آنکھ شرمائی ہوئی

کیا ہو ایسے میں کوئی گر چھیڑ دے اپنا رباب — شرط یہ ہے دوش پر زلفیں ہوں لہرائی ہوئی

ابر کے ٹکڑے دلِ شاعر پہ جادو کر گئے — ورنہ کب تھی یوں طبیعت رنگ پر آئی ہوئی

ہائے یہ دلکش مناظر اور ظفر اپنا یہ حال
قلب مضطر چشم گریاں، روح گھبرائی ہوئی

محامد علی عباسی
متعلم ام۔ ایس سی

سرسیدکی ظرافت

مولانا حالی نے غالب کے حسنِ بیان اور ظرافت کے متعلق کہا ہے کہ اگر ان کو حیوانِ ناطق کی بجائے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور ان کی حاضر جوابی کی مثالیں اور دلچسپ لطیفے جمع کئے جائیں تو اچھی خاصی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

کم وبیش یہی حال سرسید مرحوم کا ہے۔ اگر وہ ایک طرف خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور قوم کے لئے نمونہ پیش کرتے تو دوسری طرف زندہ دلی اور ظرافت سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

ان کی فصاحت آمیز ظرافت، ان کے مضامین و تقریروں اور حاضر جوابیوں سے ظاہر ہوتی ہے خطوط میں مختصر جملوں میں پورے مفہوم کو ادا کرنے اور بات میں سے بات پیدا کرنے میں اُن کو ملکہ حاصل تھا۔ بالخصوص "مسئلہ تعددِ ازدواج" پر اُن کا بحث مباحثہ، اسلامی دسترخوان کی تصویر اور لفظ "انشاء اللہ" پر لطیفہ وغیرہ کے پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ظرافت کا عنصر اُن پر کتنا غالب تھا اور یہ چیز کتنی ان کے رگ وریشہ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

ان کی تصانیف اور پُرلطف چٹکلوں کو پڑھنے کے بعد نہ صرف ان کی زندہ دلی کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدرتِ زبان

کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

علی گڑھ کالج کے قایم کرنے کا خیال ان کے سر میں ایسا سمایا تھا کہ باوجود ضعیفی وہ ہر قسم کی ذلت کو برداشت کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اپنی قوم کے مفاد کی خاطر انھوں نے کالج کی عمارت کے چندے کے لئے ایک تھیٹر میں گانا بھی پسند کیا۔

ان کی سوانح حیات سے قطع نظر یہاں ان کی ظرافت کی مثالیں ان کی زبان ہی میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ ان کے زور بیان اور معانی آفرینی کا کامل نمونہ پیش نظر ہو سکے اور ان کے دل و دماغ کے باریک نکات اور ان کے دلچسپ طرز بیان کا اندازہ ہو جائے۔

سر سید ایک بار ادب کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اس کے معنی سراسر غلط سمجھائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بیجا پابندی کی وجہ سے اس ملک کا بچہ نہایت غبی ڈرپوک اور کمزور فطرت کا (حامل) ہوتا ہے۔ کہتے ہیں" ہمارے ہاں ادب کے یہ معنی ہیں کہ لڑکا اپنے بزرگوں کے ڈر کے مارے کوئی سچی بات منہ سے نہ نکال سکے۔ اور جھک جھک کر بلا ضرورت سلام پر سلام کرے۔ یہ ویسا ہی ادب ہو جیسا کہ ایک بندر والا اپنے بندر کو سکھاتا ہے کہ ٹانگ اٹھا کر کھڑا رہے۔ ہاتھ جوڑ کر گردن جھکا کر سامنے آئے۔ اور ایک اشارہ کے ساتھ ڈگڈگی پر چڑھ بیٹھے۔ مگر یہ ادب نہیں بلکہ سوء ادب ہے کیونکہ اس سے لڑکے کو ریاکاری و ظاہرداری کی تعلیم ہوتی ہے۔

سر سید کی دلچسپ گفتگو سے نہ صرف جدت اور ندرت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ بحث طلب چیزوں پر بلحاظ تحقیق و تدقیق کافی روشنی بھی پڑتی ہے۔ اور اس زمانے کے مولویوں اور ملاؤں کے فتوؤں کی گرم بازاری میں ان کی آزاد خیالی کی کامل جھلک نظر آتی ہے۔

ایک بار سہارنپور کی مسجد کے چندے کے لئے ایک شخص نے دست سوال دراز کیا۔ سر سید نے کہا صاحب میں تو خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر میں ہوں اور آپ اینٹ، پتھر چونہ کے مکانوں کی فکر میں ہیں۔ جائیے میں کچھ نہ دوں گا۔

سر سید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔ جو صاحب (یہاں مولوی علی بخش خاں مرحوم صدر الصدور گورکھپور کی طرف اشارہ ہے۔ جنھوں نے بغلبہ آرا مولوی اور ملا، سر سید پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور بغرض منظوری مکہ معظمہ بھی گئے تھے)

ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کہ تشریف لے گئے تھے ان کو ہمارے کفر کی بدولت حج اکبر نصیب ہوا کیونکہ وہی زمانہ تھا، ان کے لائے ہوئے فتویٰ ہم بھی دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی (ہجو کرنے والا) اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بنا دیتا ہے۔

انھوں نے ان خیالات کا اظہار ایسے زمانہ میں کیا اور مضامین اس وقت لکھے جبکہ ہندوستان کی فضا بہت مکدر ہوگئی تھی۔ مولویوں نے جس کو چاہا کافر کہہ دیا اور لوگ اس پر ایسے ٹوٹ پڑتے کہ اس کی زندگی دوبھر ہوجاتی تھی۔ چنانچہ مولانا حالی نے اسی زمانہ میں یہ شعر کہا ہے

اسلام اے فقیہو ہی ممنون بہت تمہارا ۔ اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر

یہی وہ زمانہ تھا جبکہ مولانا نذیر احمد کی کتابوں کو ہولی کی طرح جلاکر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور سرسید کے نیچری مذہب سے دور رکھنے کی دونوں ہاتھ اٹھاکر خدا سے یوں دُعا مانگی جاتی ہے

طفیل شافع محشر بچالے نیچری شر سے ۔ مسلمانوں کو تیری ذات کا ہے آسرا باقی

اگرچہ وہ مخالفین کے مجمع میں تقریریں کرتے تھے لیکن آزادروی کو ہاتھ سے نہ دیتے اور کبھی پست ہمت نہ ہوتے تھے۔

سرسید ہر غرض مند کا کام کرتے اور ہاتھ بٹاتے تھے لیکن کبھی کسی کی سفارش نہ کرتے۔ ایک شخص جو اس چیز سے ناواقف تھا ان سے جاکر ملا اور کہا کہ گذشتہ رات اس نے خواب دیکھا ہے کہ ایک محسن قوم جو بڑے بزرگ معلوم ہوتے تھے ایک بلند جگہ پر بیٹھے ہیں اور جو حاجتمند آتا تھا اُس کی مراد پوری کردیتے تھے۔ اس کا ایقان ہے کہ وہ ہستی ان ہی کی ہوسکتی ہے لہذا اس کی حاجت پوری کی جائے۔

سرسید نے کہا حضرت اس معاملہ میں آپ کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔ میں کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ وہ جن کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے میں نہیں بلکہ کوئی شیطان ہوگا۔

سرسید جب لندن میں تھے تو ہندوستان سے مختلف اخباروں اور روزناموں کو جمع کرکے اور جس طرح انھوں نے انتظام کیا تھا ہر ماہ ڈاک کے ذریعے تمام پرچے ان کو بھیجے جاتے تھے۔ ان پرچوں میں وہ ہندوستان کی فضا اور مولویوں کی ان کے خلاف تقریریں، بدظنی اور فتوے جاری کرنے کے واقعات کا غائر مطالعہ کرتے تھے۔

انہی ہنگاموں میں ایک بار ان کے پاس "شعلہ طور" کا پرچہ پہنچا جس میں مولوی امداد علی نے (یہ وہی مولوی ہیں

جن کی نذیر احمد سے خوب چلی تھی، الفنسٹن کی تاریخ کے ترجمہ کے حوالے سے سر سید پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ اور لکھا تھا کہ جس شخص نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے ؟

سر سید نے اس کے جواب میں لکھا کہ دیکھو دشمنی انسان کو ایسا اندھا کر دیتی ہے ۔مولوی صاحب اس اخبار "شعلہ طور" میں تاریخ الفنسٹن کے مضمون کو آپ نقل کر کے فرماتے ہیں کہ جس نے یہ ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے ؟ حالانکہ خود بھی اس عبارت کو لکھ چکے ہیں ۔اچھا تو مجھ میں اور ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا اور انھوں نے اردو سے۔

سر سید ہمیشہ دوسرے درجہ (سکنڈ کلاس) میں سفر کرنے کے بہت شوقین تھے ایک بار اُن سے چند خوش پوش حضرات سے گفتگو ہونے لگی۔ ان میں سے ایک سر سیّد کو نہ جانتے ہوئے ان کی بُرائی کرنے لگا۔ اور ان کی بیدینی الحاد اور کورانہ تقلید مغرب کے جھوٹے قصے دُہرانے لگا۔

سر سید چپکے بیٹھے سنتے رہے۔ مگر جب وہ صاحب ریل سے اُترنے لگے تو حسب قاعدہ اُن سے دریافت کیا کہ جناب کا اسم گرامی ؟ اُنھوں نے جواب دیا وہی ننگِ قوم جس کی شان میں اتنا کچھ ابھی کہا۔ یعنی سر سیّد۔ یہ سنتے ہی وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے ۔

سر سید نے ایک بار لاعلمی کو ایک نعمت عظمیٰ قرار دیتے ہوئے عجیب پُر لطف جملوں میں اسکا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

"بے علمی ایک عجیب صفت موصوف کی ہے۔ دل کو راحت میں، طبیعت کو طمانیت میں رکھنے والی جیسی بے علمی ہے ایسی کوئی چیز نہیں۔ جاہل جو کچھ جانتا ہے اس کو صحیح سمجھتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے وہ اس کو ٹھیک جانتا ہے۔ یہ ایک جھیل ہے جس میں کوئی لہر نہیں۔ کناروں تک پانی بھرا ہوا ہے۔ مگر ہلتا نہیں۔ نہ اس میں کوئی مچھلی ہے جو تیرے اور نہ کوئی مینڈک ہے کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر غوطہ لگائے۔ نہ دل میں کچھ کھٹکا ہے نہ کسی بات کے سوچنے کی حاجت۔"

سر سید مرحوم کو اُس زمانہ میں دہریہ اور نیچری کہا جاتا تھا۔ ان کی بے دینی کے قصے عام طور پر زبان زد تھے۔ چنانچہ اس طوفان کے تھپیڑوں سے نواب محسن الملک مرحوم اور مولانا نذیر احمد بھی بچ نہ سکے۔ ان کی حرکات و سکنات پر نظمیں لکھی گئیں جن کا اسلوب تضحیک آمیز ہوتا تھا اور جن کو اخباروں میں شائع کیا جاتا تھا۔

لیکن وہ اپنی قوم کی بہبودی پر ہر دم نظر رکھتے تھے اور کسی مخالف کی تذلیل سے کبھی پست ہمت نہ ہوتے تھے باوجود ان ہنگاموں کے وہ اپنی قوم کے متعلق ایک لکچر کے دوران میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

خدا کا شکر کرتا ہوں جو کہ میں اس پاک شخص کی ذریت میں ہوں جس کے کبہ مبارک جب آخری وقت ملتے تھے تو اُمی اُمی پکارتے تھے۔ اس طرح مجھ کو بھی اپنے اس فخر عالم دادا کا پوتا ہونے کا حق ہے جو اس وقت ادا کرونگا جبکہ مرنے سے کچھ پہلے میرے سانس میں گنجائش نہ ہو گی۔ اور اس وقت میں قومی قومی کہتا ہوا مروں گا۔

سرسید نے جس چیز پر روشنی ڈالی ہے اس کے ہر پہلو کو واضح کیا اور روزمرہ میں بڑی پتہ کی باتیں بتلائی ہیں۔ ہر محفل میں ان کی باتیں بڑے شوق سے سُنی جاتی تھیں۔

ایک وقت شبلی، مولوی ممتاز علی اور سرسید بیٹھے باتیں کر رہے تھے اثنائے گفتگو میں سرسید کا ایک کاغذ کھو گیا بہت تلاش کی گئی لیکن کہیں نہ ملا۔ جب سرسید کچھ پریشان ہوئے تو شبلی نے کسی طرح اس کاغذ کو پالیا اور سرسید کو ستانے اور تماشا دیکھنے کی خاطر اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

سرسید نے تاڑلیا کہ مولانا خوش طبعی کے لئے کاغذ دبائے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے ان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا: بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ جو چیز گم ہوجاتی ہے اُس کو شیطان اپنے ہاتھ کے تلے دباکر بیٹھ رہتا ہے۔ ذرا دیکھنا تو میرا وہ کاغذ تمہارے ہاتھ کے تلے تو نہیں۔ اس پر مولانا نے ہاتھ اُٹھالیا اور کاغذ نظر آنے پر خوب ہنسی ہوتی رہی۔

یوں تو سرسید نے کئی تقریروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن انگریزی زبان کی اشاعت، اور انگریزوں کو اہل کتاب مانتے ہوئے ان کی ہر چیز کی تقلید کرنے حتی کہ گردن مڑوڑی ہوئی مرغی کو بھی حلال کہنے کی وجہ سے لوگ انکو عیسائی سمجھنے لگے تھے کبھی کبھی وہ کوٹ پتلون بھی پہنتے تھے اور انگریزوں سے بے تکلف میل جول رکھتے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہوجاتے تھے اس لئے لوگ ان کو نیچری بھی کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن سے قسم قسم کے سوالات کئے جاتے اور استفسار کرنے والوں سے ان کا ناطقہ بند رہتا تھا۔

چنانچہ اکبرالہ آبادی مرحوم نے جو ان کے عزیز دوست تھے ان کے خلاف ہجو یہ نظمیں لکھیں لیکن سرسید کے انتقال سے پیشتر ان سے بہت زیادہ اُنس پیدا ہوگیا اس کے بعد انھوں نے سرسید کی یاد اس طرح کی ؎

عظمت کبھی محسوس نہ اپنی ہوئی اس کو باطن میں فرشتہ تھا وہ ظاہر میں بشر تھا

ذیل میں اسی طرح کا ایک دلچسپ مکالمہ پیش کیا جاتا ہے جو خدا کے وجود کے متعلق ایک پادری اور سرسید میں ہوا

سرسید سکنڈ کلاس (دوسرے درجہ) میں سفر کر رہے تھے ایک پادری صاحب کو کسی طرح خبر ہوگئی کہ سرسید

یہی ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے کہ مجھے ایک عرصہ سے ملنے کی آرزو تھی۔ اب میں آپ سے خدا کی باتیں کرنی چاہتا ہوں۔

سرسید نے کہا کہ میں نہیں سمجھا کہ کس کی باتیں ہیں؟ انھوں نے کہا خدا کی۔ سرسید نے کہا میری تو ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لئے میں ان کو نہیں جانتا۔ اس نے پوچھا، آپ خدا کو نہیں جانتے؟ سرسید نے کہا مجھ ہی پر کیا موقوف ہے جس شخص سے ملاقات نہ ہو کوئی نہیں جان سکتا۔ پھر ایک نام لے کر کہا آپ اس کو جانتے ہیں؟ پادری نے کہا نہیں۔ میں اس سے ملا تک نہیں۔ سرسید نے کہا پھر جس سے میں بھی نہیں ملا اور نہ اس کو کھانے پر مدعو کیا یا نہ خود اس کے ہاں کھانے گیا کیسے جان سکتا ہوں۔

پادری صاحب نے ایک انگریز دوست سے کہا یہ تو کافر ہے۔

سرسید نے نہ صرف علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈال کر اپنی قوم کی خدمت کی بلکہ اردو زبان کے ادب کو بھی اپنی تصانیف سے مالا مال کر دیا۔ ان کا درجہ بلحاظ مصلح اعظم بہت بلند ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک یا قوم کی جاہلیت اور پستی کا ایک دور ہوتا ہے۔ اس کی حالت میں یکایک انقلاب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر ماحول اور ان ہی قوتوں کا اثر پڑتا ہے جو راہ تکامل میں مائل بہ ترقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فی زمانہ دنیا میں چند قومیں ترقی کے اعلیٰ درجہ پر گامزن ہیں اور کچھ درمیانی منزلوں سے گذر رہی ہیں اور چند پستی کے قعر مذلت میں پڑی گہری نیند سو رہی ہیں۔

اسی طرح سرسید کو بھی زمانہ کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ ان کے چندہ پر خوب پھبتی اڑائی گئی اور اس طرح بیزاری کا اظہار کیا گیا۔

کالج کے لئے چندہ ہر وقت کا یہی دھندہ
یہ کیسی دردمندی ہو کہ لے کر نام چندہ کا گلا کاٹیں ہمارا اور پھر ہم سے گلا باقی

لیکن کسی مصلح کی زندگی میں قوم کی آنکھیں نہیں کھلتی ہیں مگر اس کے مرنے کے بعد اس کی پوجا کی جاتی ہے۔

اسحاق محمد خان متعلم سال چہارم

قانون بین الاقوام کے چند نکات

(الف) قانون بین الاقوام بزمانہ امن :-

قائم مقام امن کے زمانہ میں عام طور پر ہر مملکت دوسری مملکتوں میں، جن سے ان کے تعلقات ہوں، اپنے قائم مقام رکھتی ہے۔ اگر کسی مملکت کا قائم مقام کوئی ایسا شخص مقرر ہو جو اس دوسرے ملک میں پسند نہ کیا جاتا ہو تو یہ دوسرا ملک اس قائم مقام کو واپس کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو مقرر کیا جائے۔

غیر سلطنتوں کے قائم مقاموں کی دو قسمیں کی جاتی ہیں، یعنی (۱) تدبری قائم مقام اور (۲) قنصل۔ تدبری قائم مقام تین طرح کے ہوتے ہیں: (۱) سفراء جو اپنی حکومتوں اور ان کے معاملات کی نمائندگی کرتے ہیں؛ (۲) ایلچی اور وکلائے مختار جو غیر حکومتوں کے پاس بھیجے جاتے ہیں، (۳) وکلائے مصالح، جو سلطنتوں کے وزرائے خارجہ کے پاس روانہ کئے جاتے ہیں۔ یہ سب قائم مقام اپنی واپسی تک قطعاً مامون سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر دونوں مملکتوں کے درمیان جنگ بھی چھڑ جائے تو بھی یہ اپنے ملک تک پوری حفاظت سے بھیجے جائیں گے۔ عام طور پر ان کے خلاف کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جا سکتا، گو دیوانی معاملات میں عام طور پر سفیر کی جائداد بھی ہون

تصور کی جاتی ہے۔ نیز ان پر کسی قسم کا محصول بھی عائد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انھیں ملک کے اندرونی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت کی قطعی ممانعت ہے[1]۔

قنصل محض تجارتی عمیل ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اپنے ہم ملک باشندوں کو مختلف معاملات میں صلاح بھی دیتے ہیں۔ نیز ان کے سپرد غیر ملک میں اپنے ہم ملکوں کی فوتی پیدائش کے رجسٹر بھی رہتے ہیں۔ چند سال پیشتر تک یوروپی قنصلوں کو بعض مشرقی ممالک میں "ورائے ملکی اختیارات" حاصل تھے، لیکن ان اختیارات کا ۱۸۹۹ء میں جاپان میں ۱۹۲۳ء میں ترکی میں، اور ۱۹۳۰ء میں ایران میں خاتمہ ہوگیا، اور اب یہ صرف چین اور سیام میں تھوڑے بہت موجود ہیں قنصل مدبری قائم مقاموں کی طرح مامون نہیں سمجھے جاتے، چنانچہ ان پر دیوانی فوجداری دونوں طرح کے مقدمے چلائے جاتے ہیں، لیکن ان پر کوئی محصول عائد نہیں کیا جاتا اور نہ انھیں گرفتار ہونے نہیں دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی دوسرا پیشہ نہ کرتے ہوں۔

حق مداخلت

یہ حق اس اصول پر مبنی ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کی آزادی میں مخل ہونا جائز ہے۔ اسی اصول کے بموجب پچھلی جنگ عظیم میں جرمنی نے بلجیم میں اور انگریزوں اور ان کے حلیفوں نے یونان میں مداخلت کی بعض مملکتوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم دوسری مملکتوں کے معاملات میں بنی نوع انسان کے مفاد" کی خاطر مداخلت کرتے ہیں، لیکن اس طرز عمل کا اصل اصول اکثر خود اپنی ہی بھلائی ہوتا ہے نہ کہ بنی نوع انسان کا مفاد[2]۔ بعض مرتبہ جب کسی ملک میں خانہ جنگی ہوتی ہے تو طاقتور اقوام یا وہ قومیں جو اپنا اقتدار بڑھانا چاہتی ہیں، اس ملک میں مداخلت کرنے لگتی ہیں۔ اس کی بابت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اگر یہ مداخلت صرف ایک فریق کی دعوت کی وجہ سے ہے تو یہ قابل اعتراض ہے، اس لئے کہ اس سے گویا ملک کی اندرونی حکمت عملی میں مداخلت کی گئی، لیکن اگر فریقین کسی ملک کو مداخلت کی دعوت دیں، تو مداخلت نامناسب نہ ہوگی۔

---

[1] لیکن اس قاعدے کی پابندی صرف اسی وقت کی جاتی ہے جب ایک مملکت کا دوسری مملکت پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ حال میں جاپان نے چینی معاملات میں مسلسل مداخلتیں کی ہیں اور امن کے زمانہ میں بغیر کسی معقول سبب کے محض دباؤ ڈال کر عہدہ داروں تک کو بدلوا دیا ہے۔

[2] منجملہ دوسرے دعووں کے جو اٹلی نے حبشہ کے خلاف کئے، ایک یہ بھی تھا کہ حبشہ متمدن نہیں، اور اس کا فرض ہے کہ اسے متمدن بنائے۔ حقیقت میں اسی آدعا کی ایک شکل "سفید فاموں کی بوجھ" کا نظریہ ہے۔

سمندر پر حقوق اب یہ مسلمہ ہے کہ سمندر تمام اقوام کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ساتھ ہی اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ساحل سے تین میل تک کا سمندر ساحلی ملک کا ایک حصہ ہے اور ساحلی ملک اس میں دوسروں کے جہازوں کے آنے جانے کا جو انتظام چاہے کرسکتا ہے۔ ایسے دریاؤں، جھیلوں اور خلیجوں کے لئے، جو دو ممالک کے درمیان حائل ہوں، عام طور پر جداگانہ عہدنامے ہوتے ہیں۔[۲۵]

فضائی حقوق مفاہمہ پیرس ۱۹۱۹ء کے بموجب علاقہ مملکت اور علاقتی سمندر کے اوپر کی فضا مملکت کی ملک ہے اور ہر مملکت کو اس کی طیارہ رانی کے متعلق قواعد بنانے کا اختیار ہے۔

(ب) قانون بین الاقوام بزمانہ جنگ:-

(۱) فریقین جنگ

ایسے افعال جو جنگی تصور نہیں کئے جاتے، عوض، ضبطی اور پرامن ناکہ بندی ہیں۔

عوض، اس فعل کو کہتے ہیں جو معاندانہ افعال کے جواب میں کیا جائے، جیسے محصول درآمد برآمد کی زیادتی؛

"ضبطی"، اس فعل کو کہتے ہیں جس کے بموجب ایک مملکت کسی مخالف کے فعل کے بدلے میں دوسری مملکت کی املاک پر قبضہ کرے؛

"پرامن ناکہ بندی" کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مملکت جہازوں کو معاندانہ مملکت کے کسی خاص بندرگاہ جانے سے عملاً روک لے۔

ظاہر ہے کہ اگر فریق ثانی چاہے تو ان تینوں افعال کو جنگ کا بہانہ بنا سکتا ہے۔

---

[۲۵] مثلاً، درہ دانیال کے متعلق ۱۹۲۳ء میں بحیرہ اسود اور آبجکن کے دول اور برطانیہ فرانس اٹلی اور جاپان کے درمیان ایک "آبنائی مفاہمہ" کی رو سے قرار پایا تھا کہ (۱) امن کے زمانہ میں ہر ملک کے تجارتی جہاز اور ایسے جنگی جہاز جو بحیرہ اسود کے ساحلی دول میں سے قوی ترین کے جنگی جہازوں سے زیادہ نہ ہوں گے درہ دانیال میں سے ہو کر گذر سکتے ہیں (۲) جنگ کے زمانے میں غیر جنبہ دار جہازوں کی اس وقت تک مزاحمت نہ کی جائے گی جب تک ان میں ممنوعات جنگی نہ ہوں (۳) بعض جزائر اور درہ دانیال کے ساحلی علاقے غیر مسلح کر دیئے گئے۔ (۴) ایک ماموریہ آبنائے ان امور کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں ترکی کی تحریک پر مونترو میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں قرار پایا کہ تبدیلی حالات کی وجہ سے ترکی درہ دانیال کو مسلح کرسکتا ہے اور اس پر سے وہ تمام قیود ہٹا دی گئیں جو اس کے اقتدار اعلیٰ کو مسدود کرتی تھیں۔

اعلان جنگ

قواعد ہیگ ۱۹۰۷ء کے بموجب جنگ سے پہلے باضابطہ اعلان جنگ ضروری ہے[۵۴]۔ اعلان کے ساتھ ہی ساتھ فریقین کے شہریوں کے درمیان جملہ معاہدات کالعدم ہو جاتے ہیں اور قرضہ جات امن تک ملتوی ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی خاص شخص کو دشمن ملک میں ہو کر گذرنے کا اجارہ دینے کا بھی طریقہ رائج ہے[۵۵]۔ اعلان کے ساتھ ہی دشمن ملک کے ہر باشندے کے لئے ایک وقت مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر وہ اپنے وطن چلا جائے، گو یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن ملک کے شہریوں کو چند شرائط کے ماتحت ملک میں رہنے کی اجازت دیدی جائے اور انھیں خواہ نظر بند کر دیا جائے ورنہ آزاد رہنے دیا جائے۔

اگر کسی ملک میں خانہ جنگی ہو رہی ہو تو باغیوں کو باضابطہ جنگ کا فریق سمجھنا اقوام غیر کی صوابدید پر مبنی ہے، اگر جنگ کو باضابطہ تصور نہ کیا جائے تو پھر ناکہ بندی، ممنوعات جنگی وغیرہ کا اعلان ناجائز تصور کیا جائے گا۔

جنگ کے آغاز کی تعریف

جنگ عظیم سے پہلے یہ خیال جما جاتا تھا کہ دوران جنگ میں عام شہریوں کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی اور جنگ صرف سپاہیوں کے درمیان ہو گی۔ لیکن اس جنگ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور نہ اس کے بعد کوئی قواعد اس بارے میں بنائے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ قواعد کا عدم تعین اسباب ذیل کی وجہ سے ہے:۔

(۱) اب عورتیں جنگ میں باضابطہ حصہ لینے لگی ہیں؛ (۲) طیاروں نے جنگ کے طریقے میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور خطوط رسل و رسائل پر بمباری کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے؛ (۳) جنگی ضروریات کے لئے صنعت و حرفت کا خاتمہ لازمی تصور کیا جانے لگا ہے؛ (۴) یہ واقعہ ہے کہ بغیر شہریوں کی تمام رضامندی اور تائید کے آج کل کوئی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی فوجوں کے ساتھ جو غیر محارب لوگ رہتے ہیں، جیسے مذہبی رہنما، اطبا وغیرہ ان کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر وہ مسلح بھی

---

[۵۴] حال کے زمانے میں پہلے جاپان نے اور پھر اٹلی نے ایک نیا نظریہ قایم کیا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی مملکت کسی دوسری مملکت کو کافی متمدن تصور نہ کرے تو اس حالت میں بغیر اعلان کے جنگ شروع کی جا سکتی ہے، چنانچہ جاپان نے چین کے خلاف اعلان جنگ کئے بغیر منچوریہ پر قبضہ کر لیا اور اسی طرح اٹلی نے بغیر اعلان جنگ کے حبشہ سے جنگ چھیڑ دی اور دنیا منہ تکتی رہی۔ عین اس وقت جاپان اور چین کے درمیان شانگھائی اور پی پنگ پر خونریز جنگ ہو رہی ہے لیکن اعلان کا نام نہیں۔

[۵۵] ۱۹۱۵ء میں فون پاپن کو جو واشنگٹن کے جرمن سفارت خانہ کا معتمد تھا، انگریزوں نے ایسا ہی اجارہ دیا۔

ہوں، اور انھوں نے بیماروں اور مجروحوں کے بچاؤ کے لئے اسلحہ اٹھائے ہوں، تو انھیں قید نہیں کیا جاسکتا؛ گرفتار باغی یا سرشتہ بہم رسانی کے عہدہ داروں کو قید کیا جاسکتا ہے۔ فوجیوں کی وردی کی خاص علامتیں لازمی ہیں؛ اگر یہ علامتیں نہ ہوں یا ایسی ہوں کہ آسانی سے بھی علیحدہ کرکے فوجی معمولی حیثیت اختیار کرسکیں، جیسے بے قاعدہ سپاہی؛ تو انھیں گرفتار کرکے گولی سے مارا جاسکتا ہے۔

اگر ملک کا ملک خارجی حملے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو تو قواعد ہیگ کے بموجب شہریوں کی حیثیت جنگجوؤں کی سی ہوگی؛ بشرطیکہ وہ قوانین جنگ پر عمل کریں۔

تشدد جنگی کے حدود جنگ میں صرف اتنے تشدد کی ضرورت ہے جو حصول مقصد کے مناسب ہو۔ ۱۹۰۷ء کے قواعد ہیگ نے حسب ذیل کو ناجائز قرار دیا ہے:۔ (۱) زہر یا زہریلے ہتھیاروں کا استعمال؛ (۲) دغا کرکے قتل کرنا؛ (۳) جنھوں نے ہتھیار ڈال دئے ہوں اُن کا قتل؛ (۴) یہ اعلان کہ کسی کی جان نہیں بچائی جائیگی؛ (۵) بے ضرورت تکلیف دہی؛ (۶) علم تو قف جنگ کا بیجا استعمال؛ (۷) املاک کی بے ضرورت بربادی؛ (۸) کسی ملک کے باشندوں کو اسی ملک کے خلاف لڑنے پر مجبور کرنا۔ اسی طرح پھیلنے والی گولیوں کا استعمال، کنوؤں میں زہر ڈالنا اور متعدی امراض پھیلانا بھی عام اتفاق دول سے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی واشنگٹن والی کانفرنس میں برطانیہ کلاں، فرانس، اٹلی، جاپان اور ممالک متحدہ امریکہ نے باتفاق رائے یہ قرار دیا کہ آیندہ جنگوں میں یہ ممالک کسی قسم کی گیس استعمال نہ کریں گے، لیکن اس اعلان کی اس وقت تک توثیق نہیں ہوئی۔[۵]

محاصرے اور بمباری تاوقتیکہ کوئی شہر یا مکان قلعہ بند نہ ہو اس پر بمباری کرنا ناجائز ہے۔ بمباری سے شہریوں کو آگاہ کردیا جائے کہ بمباری ہونے والی ہے۔ ایسے مذہبی مقامات یا ایسے ایوانات جن کا تعلق طبی امداد، علوم و فنون سے ہو (بشرطیکہ وہ فوجی اغراض کے لئے استعمال نہ کئے جاتے ہوں) انھیں نابود نہ کرنا چاہئے۔[۵] ۱۹۲۳ء کے ایک بین الاقوامی فضائی ماموریہ نے قرار دیا کہ فضائی بمباری صرف فوجی عمارت

---

[۵] جنگ عظیم میں فریقین نے زہریلی گیسوں کا دل کھول کر استعمال کیا، اور اب تو ہر مملکت تقریباً یہ فیصلہ کئے ہوئے معلوم ہوتی ہے کہ آیندہ کسی جنگ میں وہ ان گیسوں کو استعمال بھی کریگی اور ان سے اپنے بچاؤ کا بھی انتظام کریگی۔ اٹلی نے حبشہ انھی گیسوں کے ذریعہ سے فتح کیا۔

[۵] حالت جنگ میں فریق ایسی باریکیوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ چنانچہ جنگ عظیم میں جرمنی نے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۰ پر)

پر کی جاسکتی ہے اور اگر وہ آبادی کے وسط میں واقع ہوں تو ان پر بھی بمباری نہیں کرنی چاہیے۔ ۱۹۰۷ء کے مفاہمۂ ہیگ سے قرار پایا کہ غیر قلعہ بند ساحلی مقامات کی بحری بمباری ناجائز ہے۔ آبدوز سرنگوں کی بابت مفاہمۂ ۱۹۰۹ء میں قرار پایا کہ آزاد خود بخود چھنے والی سرنگیں ناجائز ہیں، لیکن آزاد ہونے کے ایک گھنٹہ بعد بے کار ہو جائیں تو جائز ہیں۔ جنگ عظیم کے دوران میں فریقین نے نہایت وسیع رقبات میں آبدوز سرنگوں کا استعمال کیا اور ان کی زد سے غیر جنبہ دار دول کے جہاز بھی نہیں بچ سکتے۔

جنگی قیدی مفاہمۂ ہیگ ۱۹۰۷ء کے بموجب قیدی مختلف پلٹنوں اور رسالوں کے قیدی نہیں بلکہ حکومت کے قیدی ہوتے ہیں، لہذا معمولی شہری قیدیوں کی املاک محفوظ رہنی چاہیے۔ گو ان سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن یہ کام فوجی نہیں ہونا چاہیے، اور انھیں کام کا مناسب معاوضہ ملنا چاہیے جو ان کی حیثیت کی درستی میں صرف ہو سکے۔ اگر وہ فرار ہو جائیں تو ان کے فرار ہونے کی انھیں سزا نہیں ملنی چاہیے۔

جاسوس جاسوسوں میں وہ لوگ شمار نہیں ہوں گے جو علی الاعلان مراسلے لئے جا رہے ہوں، اور اگر کوئی واقعی جاسوس اپنی فوج تک پہونچ جائے اور پھر پکڑا جائے تو بھی جاسوس نہیں سمجھا جائے گا۔

زخمی اور بیمار ۱۹۰۶ء کے مفاہمۂ جنیوا سے انجمن صلیب احمر قائم ہوئی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ زخمی اور بیمار، خواہ اپنے ہوں یا دشمن کے، ان کے علاج معالجے میں کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اطبا اور جراح اگر پکڑے جائیں تو وہ آزاد تصور کئے جائیں گے گو انھیں کماندار کا حکم ماننا پڑے گا۔ اسپتالی جہازوں کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا بشرطیکہ ان سے فوجی کام نہ لیا جاتا ہو۔[۵]

دشمن کی املاک بری املاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ خانگی ملک، نیز ایسی املاک جو مذہب، حکمیات، فنون لطیفہ، خیرات و مبرات اور تعلیم کے لئے ہو، ضبط نہیں ہو سکتی اور صرف ایسی املاک ضبط ہونی چاہیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹) لوویں (بلجیم) کے جامعہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اور گو جرمنوں کا دعویٰ ہے کہ اس کے دشمنوں نے گرجاؤں سے فوجی کام لئے۔ مگر شمالی فرانس کے کتنے ہی ایسے گرجا ہیں جو توپوں کے گولوں سے ڈھائے گئے۔ اٹلی نے جنگ حبشہ میں متعدد مرتبہ صلیب احمر کے کمپونڈرا گرجاؤں اور اسپتالوں پر بمباری کی۔ حقیقت یہ ہے کہ فضائی بیڑوں کے آنے سے تمام صورت حال میں تبدیلی ہو گئی ہے۔

۵ جنگ عظیم میں متعدد مرتبہ اس قاعدے کی خلاف ورزی کی گئی۔

جو املاک خاتمہ ہو اور جو فوجی کاموں میں لائی گئی ہو۔ یہ بھی قاعدہ ہے کہ افراد کی حرکات کی پاداش میں پوری آبادی پر عام تعزیر کا بار نہیں ڈالا جا سکتا اور سامان رسد صرف اسی قدر مہیا کرنے کا حکم دیا جا سکتا ہے جو فوجی ضروریات کے لئے کافی ہو اور جو ملک کی پیداوار کے تناسب ہو۔ علاوہ فوجی ضروری اغراض کے ملک کے کسی حصے کو برباد نہیں کرنا چاہئے اس املاک کی بابت جو جہازوں پر ہو، دول میں اس وقت تک کوئی اتفاق رائے نہیں ہوا۔ برطانیہ کلاں کی رائے ہے کہ یہ املاک، خواہ بندرگاہوں میں ہی کیوں نہ ہو، ضبط کی جا سکتی ہے، گو دشمن کی خانگی غیر ممنوعہ املاک اس سے مستثنیٰ ہے۔ علاوہ ازیں نظریتہ ایسے، جن کا مقصد مذہبی یا حکیاتی یا خیراتی ہو، ضبطی سے مستثنیٰ ہیں، بشرطیکہ ان سے کسی قسم کا فوجی کام نہ لیا جاتا ہو۔

مفاہمۂ ہیگ نمبر (۱۱) کے بموجب کسی طرح کے خطوط، خواہ وہ غیر جنبہ دار جہاز پر ہوں یا دشمن کے جہاز پر، محفوظ ہوں گے اور جہاز کی ضبطی کی صورت میں یہ مرسل الیہ کے پاس روانہ کر دیئے جائیں گے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں خطوط تو روانہ کر دیئے جاتے تھے لیکن پارسل ضبط کرلئے جاتے تھے۔

"اعلان لندن ۱۹۰۹ء میں یہ طے ہوا تھا کہ کسی مملکت نے اپنا کوئی جہاز جنگ سے پہلے کسی غیر جنبہ دار مملکت کو منتقل کر دیا تو ایسی صورت میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نقلی صرف آنے والی جنگ کے خطرے سے بچنے کے لئے تھی تو یہ ناجائز ہوگی اور جہاز ضبط کیا جا سکے گا۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس اعلان کی توثیق نہیں ہوئی۔

خاتمہ جنگ

جنگ کا خاتمہ تین طریقوں میں سے ایک کے ذریعے سے ہو سکتا ہے:۔
(۱) التوا رجنگ؛ (۲) ایک فریق کا دوسرے فریق کو مغلوب کرنا یا ملک فتح ہو جانا؛ (۳) دو فریقی معاہدہ۔ صلح کے بعد تمام ایسے خانگی حقوق کا احیا ہو جاتا ہے جو جنگ کے زمانے میں فنا نہ ہو گئے ہوں۔ علی العموم صلحنامے کے حسب ذیل حصے ہوتے ہیں:۔

(۱) عام۔ جس میں خصومت کا خاتمہ، جنگی قیدیوں کی واپسی، ناجائز نقصانات کے متعلق بازپرس سے دست برداری اور عہد نامہ ماقبل کی متوفی یا احیا کا ذکر ہوتا ہے۔

(۲) خصوصی:۔ جس میں ہرجہ جنگ اور الحاق علاقہ جات کا اعلان ہوتا ہے۔

(۳) متفرق:۔ جس میں برخاستگی افواج، قلعہ جات کی مساری، نئی مملکتوں کا جنم اور اسی قسم کی دوسری دفعات

ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں بعض صلح ناموں میں خفیہ دفعات بھی ہوتی ہیں جو اس لئے خفیہ رکھی جاتی ہیں کہ ان کا اثر بعض دوسری مملکتوں پر پڑتا ہے اور آشکارا کرنے سے مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

---

(۲) غیر جنبہ دار

ظاہر ہے کہ فریقین جنگ قوانین و قواعد کے اس قدر پابند نہیں ہوں گے جتنی غیر جنبہ دار مملکتیں، چنانچہ قانون بین الاقوام میں غیر جنبہ دار مملکتوں کے متعلق جو قواعد ہیں وہ زیادہ معین ہیں۔ فی الجملہ غیر جنبہ دار مملکتوں کو فریق جنگ سے تعلقات رکھنے کا حق حاصل ہے گو اس بارے میں کوئی قطعی قاعدہ نہیں، لیکن اگر ایک جنگجو فریق اور ایک غیر جنبہ دار کے درمیان پہلے سے سامان جنگ مہیا کرنے کے متعلق کوئی معاہدہ ہو تو اغلب ہے کہ معاہدے کی تکمیل کو دوسرا متخارب فریق غایت ناپسندیدگی سے دیکھے، اور ممکن ہے کہ اس بہانے سے غیر جنبہ دار فریق سے جنگ چھیڑ دے۔ اسی اصول سے مدنظر معاہدہ ہیگ میں یہ طے ہوا تھا کہ جنگجو مملکتوں کو خانگی قرضے دیئے جاسکتے ہیں، لیکن برطانیہ، فرانس، روس اور جاپان نے انہی اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

غیر جنبہ دار مملکتوں کے شہریوں کو رضاکار بننا جائز ہے اور انھیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ فریق کو اسلحہ مہیا کریں، چنانچہ جنگ عظیم کی ابتدا میں ممالک متحدہ کے معتمد مملکت نے مجلس سینات کے روبرو اس حق کا اعلان کیا تھا۔

فریقین کو غیر جنبہ دار ملک یا سمندر کے فوجی استعمال کا کوئی حق نہیں، لیکن قواعد ہیگ کے مطابق اس میں مضائقہ نہیں کہ کوئی جنگجو فریق غیر جنبہ دار مملکت میں اگر جنگی جہاز گذرے، گو ان جہازوں کو غیر جنبہ دار سمندر میں عام طور پر ۲۴ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھیرنا چاہیے۔ اگر کسی فریق کا کوئی جنگی قیدی غیر جنبہ دار ملک میں پہونچ جائے تو وہ خود بخود آزاد ہوجائیگا۔ غیر جنبہ دار علاقے میں ہوکر فوج گذارنے کے متعلق کوئی خاص قاعدہ نہیں، لیکن جنگجو فریق کو ضرورت کے وقت یہ حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار ملک کو معاوضہ دے کر اس کی املاک اپنے قبضہ میں کرے یا اسے جنگی ضرورت پر برباد بھی کردے۔

ممنوعات جنگی — نظریۂ غیر جنبہ دار کو فریقین جنگ سے تجارت کرنے کا اختیار ہے، لیکن جنگجو فریق کو یہ حق حاصل ہے کہ ممنوعات جنگی پر قبضہ کرکے انھیں برباد کردے۔ ممنوعات جنگی اس اسباب کو کہتے ہیں جس کی

تجارت کوئی فریق جنگ غیر جنبہ داروں کے لئے بھی ممنوع قرار دے۔ یہ کسی غیر جنبہ دار ملک کا سامان ہوتا ہے جسے جنگی مدد کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے اور یہ بغیر حیلہ حوالہ کے ضبط کیا جا سکتا ہے۔ ممنوعات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک قطعی دوسرے مشروط۔ مشروط ممنوعات سے وہ اسباب مراد ہے جس سے کسی فریق کی جنگی مدد ہو سکتی ہو لیکن ان کی ضبطی صرف اس وقت ہو سکتی ہو۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ ان کا مقصد خاص طور پر فریق ثانی کو مدد دینا ہے۔ اس کے برعکس قطعی ممنوعات جنگی میں اسلحہ ہمیشہ شامل رہے ہیں، اور یہی حال اکثر مواقع پر گھوڑوں کا ہوتا ہے۔ روپیہ بھی کبھی کبھی قطعی ممنوعات میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ امر کہ آیا کوئی سامان قطعی ممنوعات میں شامل ہے یا نہیں، موقع محل پر مبنی ہوتا ہے۔

مشروط ممنوعات میں سامان خورونوش، جنگی پوششیں، سونا چاندی، ریل کا سامان، اشیا متعلق تار برقی اور ایسی ہی دوسری چیزیں شامل ہیں لیکن جنگ عظیم کے دوران کی انگریزی نظیریں ایسی موجود ہیں جن کی رو سے کوئی چیز، جس سے بالواسطہ بھی فریق ثانی کو جو بھی مدد ملے، ضبط کی جا سکتی ہے، چنانچہ اس معیار پر تقریباً ہر چیز آجاتی ہے۔[۹]

جس غیر جنبہ دار جہاز پر ممنوعات ہوں اُسے بھی ضبط کیا جا سکتا ہے اور، اگر بالآخر اسے چھوڑ دیا جائے۔ تو جو خرچہ اس کی گرفتاری میں ہوا ہو اُسے غیر جنبہ مملکت کو پورا کرنا ہوگا۔ نیز اگر کسی جہاز پر ممنوعات ہو تو اس کا اثر غیر ممنوع اشیا پر بھی پڑے گا اور وہ بھی ضبط کر لی جائینگی۔

ناکہ بندی ناکہ بندی سے مراد یہ ہے کہ کوئی فریق جنگ غیر جانبدار ممالک کے ساتھ دشمن کے کسی خاص بندرگاہ کی تجارت کو اس کے دہانے پر اُسے جہاز کھڑے کرکے اپنے گولوں کی زد میں لاکر مسدود کردے[۱۰]۔ ناکہ بندی

۹ ۱۹۰۹ء میں ممنوعات کے مسئلے پر مختلف دول کے مابین لندن میں مفصل بحث ہوئی۔ اور اس کے نتائج کو مشہور و معروف اعلان لندن ۱۹۰۹ء میں مدوّن کیا گیا۔ لیکن اس کی سرے سے توثیق ہی نہیں ہوئی، اور جو کچھ اس کا رہا سہا اثر تھا اس کا بھی جنگ عظیم کے دوران میں خاتمہ ہوگیا۔

۱۰ جنگ عظیم کے دوران میں صرف ایک ایک بندرگاہ کی ناکہ بندی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انگریزوں نے تمام جرمن ساحل کی ناکہ بندی کر دی، گو اس پر جنگ کے ابتدائی زمانے میں ممالک متحدہ امریکہ نے احتجاج کیا تھا۔ جرمنی نے بھی برطانیہ کلاں کے چاروں طرف بعد پھر فرانس اور اٹلی کے بھی چاروں طرف آبدوز سرنگیں بچھا کر بحیرہ شمالی، برطانیہ کے مغربی ساحل اور بحیرہ روم تک کی گویا ناکہ بندی کردی تھی لیکن دونوں صورتوں میں برطانیہ کلاں اور جرمنی وغیرہ کی طرف سے جو اعلانات ہوئے ان میں ناکہ بندی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

کے نتائج اسی وقت جائز تصور کئے جاتے ہیں جب ناکہ بندی کامل ہو اور ہر غیر جنبہ دار کے لئے ہو۔ یعنی اگر کسی غیر جنبہ دار فریق کو تجارت کی اجازت دیدی گئی تو پھر اسے ناکہ بندی نہ کہیں گے۔ لیکن اگر کوئی غیر جنبہ دار جنگی جہاز، یا ایسا جہاز جسے طوفان یا دوسری ناگزیر وجہ سے بندرگاہ میں جانا پڑا تو ناکہ بندی پر اثر نہ پڑے گا۔

عام طور پر ناکہ بندی کے بعد غیر جنبہ دار ممالک کو پندرہ روز کی اطلاع دی جاتی ہے؛ اس کے بعد جو غیر جنبہ دار جہاز بندرگاہ میں جانا چاہے اسے ضبط کیا جا سکتا ہے۔ ناکہ بندی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ناکہ بندی کرنے والا جہاز یا تو میں اختیاراً یا اضطراراً اٹھائی جائیں یا ناکہ بندی کرنے والی مملکت بندرگاہ پر قبضہ کرے۔

اگر غیر جنبہ دار جہازوں میں محض خانگی سامان ہو جو ممنوعات جنگی میں شامل نہ ہو تو اسے ضبط نہیں کیا جا سکتا؛ اسی طرح اگر دشمن کے جہاز میں غیر جنبہ دار ممالک کے شہریوں کا سامان ہو اور یہ سامان جنگی ضروریات کا نہ ہو تو اسے بھی چھوڑ دینا پڑے گا۔

کھلے سمندر میں جنگجو فریق کو حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار تجارتی جہازوں کا معائنہ کرے، اور اگر جہاز تمردی کریں تو انھیں ضبط کرے۔ اگر تجارتی جہاز کے ساتھ غیر جنبہ دار جنگی بدرقہ بھی ہے تو برطانوی رائے یہ ہے کہ پھر بھی جنگجو فریق تلاشی لے سکتا ہے، لیکن براعظمی رائے اس کے مخالف ہے، یعنی ایسے حالات میں محض جنگی جہاز کے کماندار کا یہ کہنا کہ کوئی قابل اعتراض شے تجارتی جہاز پر نہیں ہے کافی سمجھا جائے گا۔

غیر جنبہ دار بحری غنیمت اس طرح جو غیر جنبہ دار جہاز گرفتار ہوں گے انھیں یا تو فوراً چھوڑ دینا چاہئے ورنہ ان کا معاملہ حکم آخری کے لئے باضابطہ عدالت غنیمت میں پیش کرنا ہوگا۔ اگر کوئی غیر جنبہ دار جہاز محاذ جنگی میں گھس آئے یا ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ایک ہی فریق کی جنگی مدد ظاہر ہو تو اس جہاز پر حملہ کرنا جائز تصور کیا جائے گا۔ ”اعلان لندن“ کی رو سے (جس کی توثیق نہیں ہوئی) غیر جنبہ دار جہاز کو اس صورت میں نابود کیا جا سکے گا کہ اگر اسے گرفتار کرکے بندرگاہ میں لے جانے سے جنگ میں گرفتار کنندہ فریق جنگ کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

خاتمہ یہ سب بیان قانون بین الاقوام کا ہے۔ حال میں جاپانی اقدام منچوریہ اور اطالوی اقدام حبشہ کی وجہ سے قانون بین الاقوام کی وقعت کاغذی ناؤ کے برابر رہ گئی ہے۔ لیکن اسپین کی خانہ جنگی میں غیر جنبہ داروں کی طرف سے

جانب داریوں اور فریقین کی سخت ترین خونریزیوں کی وجہ سے، اور دوسرے اس عدیم المثال صورت حال کے باعث کہ یورپ کی بعض مملکتیں، جیسے جرمنی اور روس، باوجودیکہ بظاہر ان کے ایک دوسرے کے ساتھ امن و امان کے تعلقات ہیں، علی الاعلان ایک دوسرے کو برا بھلا کہتی جاتی ہیں اور ساتھ ہی ایک کے سفیر دوسرے کے ملک میں موجود ہیں اور تجارتی تعلقات بھی قایم ہیں، ان سب باتوں سے قانون بین الاقوام کا رہا سہا اثر بھی غائب ہوتا نظر آتا ہے۔

حقیقت میں جیسا قانون بین الاقوام کے ایک بڑے عالم، اوپن ہائم نے کہا ہے، یہ قانون صرف اسی وقت قایم رہ سکتا ہے جب مملکتوں کے درمیان توازن کی کیفیت ہو، اور کسی ایک مملکت کو دوسری مملکت پر غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہو۔ اس کے نزدیک بین الاقوامیت کا احساس اس وقت ممکن ہے جب عمومیت کا راج ہو۔ اول تو بین الاقوامی معاشرے ہی میں عمومیت کا خیال پنہاں ہے؛ دوسری مطلق العنانی ایک غیر ذمہ دارادارہ ہے جس کے ساتھ بین الاقوامی ذمہ داری کا احساس قایم نہیں رہ سکتا؛ تیسرے جنگ کے خطرے کا انسداد ایک محض اخلاقی مطمح نظر ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک ہر قوم سے قومی مملکت پوری طرح سے اس کی قدر نہ کرتی ہو اور مختلف مملکتیں تقریباً ایک ہی اخلاقی معیار تک نہ پہونچ جائیں۔ بظاہر دنیا پھر اسی تعر کی طرف واپس جارہی ہے جس سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ایک امی عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بچایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انسان کو حضرت علیؓ کا یہ سبق یاد کرنے میں دیر لگے گی کہ ؎

الناس من جہۃ التمثال اکفاء
ابوھم آدم والام حواء

ہارون خاں شروانی

اصطلاحات

آبدوز سرنگیں	Submarine mines
آبنائی موافقہ	Straits Agreement
اجازہ	License
املاک	Property
اعلان لندن	Declaration of London
ایلچی	Envoy
بحری غنیمت	Prize
بمباری	Bombardment
پرامن ناکہ بندی	Peaceful Blockade
تدبری قائم مقام	Diplomatic representative
جاسوس	Spy
جراح	Surgeon
جنگجو	Combatant
حکمیات	Sciences
حلیف	Ally
سفید فاموں کا بار	White Man's Burden.
سفیر	Ambassador
سررشتہ بہم رسانی	Commissariat Department
ضبطی	Forfeiture

Aeroplane	طیارہ
Aeronautics	طیارہ رانی
Prize Court	عدالت غنیمت
Territorial	علاقتی
Agent	عمیل
Retaliation	عوض
Neutral	غیر جنبہ دار
Absolute	قطعی
Consul	قنصل
Commander	کماندار
Open Sea	کھلا سمندر
Commission	ماموریہ
Conditional	مشروط
Convention	مفاہمہ
Contraband of War	ممنوعات جنگی
Agreement	موافقہ
Blockade	ناکہ بندی
Minister	وکیل مختار
Chargé d' affaires	وکیل مصالح
Extra-Territorial	ورائے ملکی
Airship	ہوائی جہاز

"اعتراف"

شاید میں جانتا ہوں کہ میرا وقت آ گیا ہے۔ مجھے فریب دینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے انجکشن، تمہاری دوائیں، مجھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتیں۔ بیکار اس میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ بلکہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں اسے غور سے سنو۔ یہ ایک راز ہے۔ میری زندگی کا راز۔ لیکن اب میں اسے راز نہیں رکھ سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے سارے واقعات کا اظہار نہ کر دیا تو مرنے کے بعد میری روح کو سکون نصیب نہ ہو گا۔

شاید تم اچھی طرح جانتے ہو۔" اس نے مجھے متوجہ پا کر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "فرید پور میں میرا کیا مرتبہ ہے۔ کہنے کو تو میں ایک معمولی زمیندار ہوں۔ لیکن سارے فرید پور پر میرا حکم چلتا ہے۔ یہاں کا ہر شخص مجھ سے محبت کرتا ہے مجھے توقیر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ میرے لئے جان دے دینا باعث فخر جانتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کا خیر خواہ ہوں۔ فرید پور والوں کی بھلائی ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی ہے۔ محبت۔ ایثار اور ہمدردی کے جذبات مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ میں ایماندار پابند مذہب۔ خدا ترس ہوں۔ فرید پور والوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ میں نے قربان کر دیا۔ لیکن کیا تمھیں حیرت نہ ہو گی اگر میں یہ کہوں کہ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی مجھ میں نہیں ہے۔ میری خیر خواہی محض دکھاوا تھی۔ میں جو کام کرتا تھا اپنی بھلائی کے لئے دوسروں

کی بھلائی سے مجھے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ایثار کرنا میں جانتا نہیں محبت و ہمدردی سے مجھے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ایمانداری کا کوئی کام میں نے آج تک نہیں کیا۔ اگر میں نے روپیہ پیسہ خرچ کیا تو محض اس لئے کہ مجھے ایک کی جگہ دس ملنے کی توقع تھی۔ میں بے ایمان، مکار، دغا باز، خود غرض سب ہی کچھ ہوں۔ میں ایک ڈاکو ہوں خطرناک۔ ظالم جس نے شریف بن کر لوٹا۔ میں نے زندگی بھر روپیہ کمانے کا، خود کو نیک نام رکھنے اور مشہور کرنے کا کوئی بھلا یا برا طریقہ نہ چھوڑا......

تم کو میری باتوں کا یقین نہیں آرہا ہے تم مجھے حیرت سے گھور رہے ہو..............سنو...... وحید کو تم جانتے ہونا۔ وہی جواب سے پچیس سال پہلے محض اس لئے فرید پور چھوڑ کر چلا گیا کہ اس نے نسیمہ کا وہ سب کچھ لوٹ لیا جو عورت کا واحد سرمایہ ہے جس پر اسے حقیقی معنوں میں فخر ہو سکتا ہے لیکن یقین مانو نسیمہ کو تباہ کرنے والا وحید نہیں بلکہ میں تھا۔ ٹھہرو سارا واقعہ تفصیل سے بیان کردوں گا۔ مجھے بیچ میں ٹوک کر وقت ضائع نہ کرو.........نسیمہ کا مکان میرے مکان سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ دونوں انتہا سے زیادہ شریف اور زمانے کی اونچ نیچ سے بالکل بے خبر تھیں۔ وہ غریب تھیں مگر ان کے دل غنی تھے۔ مکر و فریب ان کو آتا نہ تھا۔ صاف گوئی ان کی فطرت میں داخل تھی۔ ہر ایک کے متعلق وہ اچھا ہی خیال رکھتی تھیں۔ انھوں نے میری شرافت پر اعتبار کیا۔ میں اکثر وہاں جاتا۔ گھنٹوں سلیمہ سے باتیں کرتا رہتا۔ میری گفتگو بالعموم ایسی ہوتی تھی جس سے خلوص ہمدردی۔ ایثار کا اظہار ہوتا۔ اپنے نوکروں سے میں ان کے گھر کا سودا سلف منگوا دیا کرتا۔ ماں بیٹیوں کا ذریعہ آمدنی کشیدہ کاری تھا۔ جب وہ کوئی بیل تیار کرتیں تو میں اسے اصل سے زیادہ قیمت دے کر خرید لیتا۔ اس طرح میں نے ماں بیٹیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ان کی گردنیں میرے بار احسان سے جھک گئیں۔ اظہار تشکر کا ان کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا کہ جب میں جاؤں تو اپنے سارے کام چھوڑ کر مجھ سے باتیں کرتی رہے۔ مجھے خوش کرنے کی کوشش کیا کرے میں اسے کتابیں لیجا کر دیتا۔ ایسی کتابیں جو ان بیاہی لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا مردوں کے پڑھنے کی بھی نہ تھیں میں ان کتابوں کی بڑی تعریف کرتا اور وہ محض مجھے خوش کرنے کے لئے ان کو پڑھتی کبھی کبھار میں اسے کوئی نہ کوئی تحفہ بھی دیتا جسے وہ میرے خلوص کا نتیجہ سمجھ کر قبول کر لیتی.........مگر عورت عورت ہی ہے۔ وہ کتنی ہی شریف کیوں نہ ہو۔ کتنے ہی توی دل کی مالک کیوں نہ ہو۔ ایک مرتبہ اسے چھیڑ دو۔ پھر وہ اپنے آپ میں نہیں رہتی۔ وہ تمام بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ سماج کو ٹھکرا دیتی ہے۔ جذبات کا ایک طوفان اسے بہائے جاتا ہے اور وہ بے سدھ۔ بچاؤ کی کوئی کوشش کئے بغیر بہی چلی

جاتی ہے .... میں نے صنف نازک کی اس کمزوری سے فایدہ اُٹھایا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ عقد کروں گا۔ اسے اپنے دل کی ملکہ بناؤں گا۔ میں اس کے سامنے عجز مجسم بن گیا۔ وہ میرے فریب میں آگئی...... پھر میں نے اُس سے آنکھیں پھیرلیں۔ ایسی بے رخی برتی گویا کبھی واقف بھی نہ تھا۔ کسی طرح ان واقعات کا علم وحید کو ہوگیا لوگ وحید سے واقف نہیں ہیں۔ وہ ایسا شخص ہے جو ہر ایک کی تکلیف پر روتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ ہمدردی کرنا جس کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ جو دوسروں کے لئے زبردست سے زبردست قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے ....

وحید میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے لعنت ملامت کی۔ مجھ سے درخواست کی کہ میں نسیمہ سے عقد کروں جب میں راضی نہ ہوا تو مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نسیمہ کو تباہی سے نہ بچاؤں گا تو میرا راز فاش کردے گا میں نے اُس کے پیر پکڑلئے۔ آنسوؤں سے اس کے پیروں کو تر کردیا۔ میں نے اس سے منت و عاجزی سے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے مگر اس کی اتنی سخت سزا نہ ہونی چاہئے۔ میں شادی شدہ ہوں، دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ میں نے اس کو وہ جھوٹے سچّے اسباب بتائے جس کی وجہ سے دوسری شادی ناممکن تھی۔ اس کا دل پسیج گیا۔ اور اس ناکردہ گناہ نے میرا الزام اپنے سر لے لیا۔

تھوڑے دنوں بعد وہ یہاں سے چلے گئے۔ مجھے اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور میں نے نسیمہ کی امداد کرنے کے لئے اپنی بیوی کا سارا زیور اسے بھجوادیا۔ لیکن میں اس سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ زیور میں نے لیا ہے۔ اپنا وقار قایم رکھنے کو میں نے مشہور کردیا کہ وحید جاتے ہوئے میری بیوی کے زیور لے گیا ہے۔ دس سال بعد وحید فرید پور واپس لوٹا ....

فرید پور سے جانے کے بعد وحید نے نسیمہ سے شادی کرلی تھی۔ مگر میری بے رخی اور اپنی لاچاری کے احساس نے اسے بہت جلد موت سے ہم آغوش کردیا .... وحید واپس لوٹا تو وہ تنہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگ اسے اور نسیمہ کو بھول گئے ہوں گے۔ مگر ایسی باتیں بھلائی نہیں جاتیں۔ وحید لوگوں کی نظروں میں قابل نفرت انسان تھا۔ اس کی واپسی پر سب نے نفرت کا اظہار کیا۔ اسے سارے حالات معلوم ہوئے۔ مگر اس نے یقین نہیں کیا۔ اسے گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ میں احسان فراموش ہوں۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں نے پھر اسے فریب دیا۔ وہ میری باتوں میں آگیا۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ ہمیشہ کے لئے فرید پور کو الوداع کہہ دے .... میں تم کو یہ بتانا بھول گیا کہ وحید کی ایک چچا زاد بہن تھی۔ رشیدہ اس کا نام تھا۔ عمر میں وحید سے دو سال چھوٹی ہوگی۔ بچپن کی ساتھ کی کھیلی ہوئی وحید کو اس سے محبت تھی۔ انتہا محبت۔ اب جبکہ وہ آزاد ہوچکا تھا۔ محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر

ایک مرتبہ بھڑک اٹھیں۔ اس نے رشیدہ کو اپنا بنانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے والدین نے انکار کر دیا۔ انھوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی وحید جیسے بدنام شخص کے حوالہ کر دیں۔ وحید کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا مگر مجھے اتنی توفیق نہ ہوئی کہ حقیقی واقعات کا اظہار کرکے اس کی زندگی کے ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچا لوں۔ الٹی میں نے رشیدہ کے والدین کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وحید کو اور زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اس کو میری حرکتوں کا علم ہو گیا اس کے باوجود بھی وہ خاموش رہا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو اپنی بیگناہی ثابت کر سکتا تھا۔ اس کے پاس ایسے کاغذات موجود تھے جن کو بتا کر وہ مجھے لوگوں کے سامنے بے نقاب کر سکتا تھا .... وہ چلا گیا تنہا۔ مایوس و دل شکستہ اور جاتے ہوئے میرے گناہوں کا ثبوت میرے حوالہ کرتا گیا۔ اس کے بعد وہ ایک سال بھی زندہ نہ رہ سکا۔ لیکن میں اپنے گناہوں میں اضافہ کرنے کے لئے اب تک زندہ ہوں .... کاش وہ مجھے معاف کر سکتا ....

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا .... اب سے کئی سال پہلے جب شیخو پورہ کے پرانے مکانات تڑوا کر ان کی جگہ نئے مکانات بنوانے کی اسکیم پیش کی گئی تو میں نے بڑے شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت کی میں نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اگر نئے مکانات بن گئے تو کرایہ بڑھ جائے گا۔ غریب لوگ اس میں نہ رہ سکیں گے۔ ان کے لئے سر چھپانے کو جگہ نہ رہے گی۔ بات معقول تھی سب نے یقین کر لیا۔ مخالفت میں میرا ساتھ دیا اور وہ اسکیم یوں ہی رہ گئی حالانکہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ اسکیم غریبوں کے لئے فائدہ مند تھی مگر ڈر تھا کہ اگر پرانے مکانات توڑ دیئے گئے تو میں نئے مکانات نہ بنوا سکوں گا۔ میری آمدنی میں معتدبہ کمی ہو جائے گی۔ اپنے فایدے کے لیے میں نے اس کی پرواہ نہ کی کہ نئے مکانات کے بننے سے اس محلہ کی حالت سدھر جائے گی۔ صفائی اور روشنی کا انتظام ٹھیک ہو جائے گا وہ محلہ جو ہمیشہ بیماریوں کا آماجگاہ بنا رہتا ہے اس مصیبت سے نجات پا جائے گا۔ میں نے ہزاروں غریبوں کی صحت صفائی آرام سب کچھ قربان کر دیا .... چند سال پہلے کی بات ہے کہ ذریعہ پور میں ریل لانے کی تجویز ہوئی مجھے اس کا علم ہو گیا۔ اس اسکیم کو میں نے اپنے لئے آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہا۔ وہ زمین جس پر سے ریلوے لائن گذرنے والی تھی۔ بنجر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی مالک ایک بیوہ عورت تھی۔ میں نے ایک ایسے شخص کو جس سے ذریعہ پور والے بالکل ناواقف تھے اپنا نمائندہ بنا کر اس کے پاس بھیجا۔ اونے پونے وہ زمین اس سے خرید لی اور لاکھوں روپیہ کا فائدہ کمایا۔ یہ سچ ہے کہ جس وقت زمین میں نے بیوہ سے خریدی ہے اس سے اس کو کوئی آمدنی نہیں تھی۔ لیکن اگر میں اس سے

خرید نہ لیتا تو وہی رقم جو مجھے ملی اسے ملتی اور نسبتاً وہ اس کی مجھ سے زیادہ مستحق تھی۔

شاید میں اپنے کارنامے کہاں تک گناؤں۔ میں نے خیر خواہی۔ ہمدردی اور خلوص کے پردے میں فریب پورداوں کو خوب خوب بیوقوف بنایا اور لوٹا .... کاش وہ لوگ مجھے معاف کردیں .... اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا

اپنے اعتراف کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا وہ میرا دوست تھا۔ دلی دوست میں اس کی عزت کرتا تھا اسے ایک لائق پرستش ہستی تصور کرتا تھا۔ مگر اس کے صحیح حالات کا علم ہونے کے بعد میں اکثر سوچتا کہ مجھے اس کو کس نظر سے دیکھنا چاہئے کیا وہ ہمدردی کا مستحق ہے یا اس قابل کہ اس کا نام برائی کے ساتھ لیا جائے۔ ایک عرصہ تک میں اس دماغی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ انسان تھا عام انسانوں کی طرح غلطی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ اپنا فایدہ ہر ایک دیکھتا ہے۔ فریب پر دنیا چل رہی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ فریب کا مظہر ہے۔ مذہب۔ سیاست۔ معاشرت ہر ایک کا انحصار فریب پر ہے۔ وہ بڑے بڑے عمامہ والے۔ وہ لانبی لانبی عباؤں والے وہ ریش درازوالی مقدس ہستیاں وہ علمبرداران مذہب وہ منبروں پر کھڑے ہوکر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے والے مبلغین وہ بڑے بڑے سیاست داں جن کی دماغی کاوشیں سلطنتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں ذرا کوئی ان کی زندگی کے اوراق کا مطالعہ کر کے دیکھے، ان کی حقیقت کھل جائے گی ان کا تقدس۔ ان کا زہد و اتقا ان کی مذہبیت اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر آئے گی۔ ان کے تدبر کا بھانڈا پھوٹ جائیگا۔

میں اکثر اس کی قبر پر پھول چڑھا دیتا ہوں ...."

محمد یحییٰ صدیقی ام۔ اے (عثمانیہ)

ترجمہ۔ سی بیس



Mr. Md. SHAHABUDDIN, M. A. (Osman.)

Editor. Urdu Section.

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تعلقات دیسی ریاستوں سے

۱۷۵۷ء تا ۱۸۱۳ء

مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں جب دہلی کی مرکزی قوت برائے نام رہ گئی تھی تو ہندوستان کے وسیع ملک میں کئی ریاستیں ایسی پیدا ہوگئیں جو شہنشاہی قوت سے علانیہ انحراف تو نہیں کرسکیں لیکن حقیقتاً وہ بالکل آزاد اور خودمختار ہوگئیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاستوں کی اس قدر کثیر تعداد محض اس دور تنزل کی پیداوار ہے ان کا وجود قدیم زمانے سے تھا اور مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی رہا۔ مغلوں نے ایک زبردست شہنشاہی مملکت قایم کرنے کے بعد بھی اس نظام سیاسی کو تباہ نہیں کیا اس میں شک نہیں کہ اکبر نے راجپوت رئیسوں کو بھی اپنے شہنشاہی نظام سے وابستہ کردیا تھا تاہم ان رئیسوں کو اپنے علاقوں کے اندر بہت بڑی حد تک خودمختار و آزاد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں کمپنی کے بتدریج اقتدار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان ریاستوں کو بھی اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ دہلی کی مرکزی قوت اس قدر کمزور ہو چکی تھی، ہندوستان کے ہر علاقے میں ایک سیاسی ملت اپنی قوت و اقتدار کی جدوجہد میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوگئی۔ باہمی کشمکش اور تنازع البقا کا یہی دور تھا جب کمپنی نے ۲۳ رجون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کی لڑائی میں ایک شاندار فتح حاصل کی اور کلائیو نے کلکتہ پر قبضہ کرلیا لیکن جنگ پلاسی کی کامیابی ہی

کمپنی کے وجود اور استحکام کی تنہا ضامن نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ دکن میں میسور، حیدرآباد اور مرہٹوں کی ایسی قوتیں تھیں جن سے مقابلہ کرنا اور پھر ان کو مطیع کرنا کمپنی کے لئے آسان نہیں تھا مرہٹے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرکے مغلیہ سلطنت کے جانشین بننا چاہتے تھے۔ والی میسور کی فوجی قابلیت اور ملک گیری کا شوق نہ تو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو گوارا کرسکتا تھا اور نہ تاجروں کی سیادت کو تسلیم کرسکتا تھا اور نظام الملک اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان ہمسایوں پر اعتماد نہیں کرسکتے تھے اس باہمی رقابت اور بے اعتمادی نے ایک توازن پیدا کردیا جس سے کمپنی نے فایدہ اٹھایا واضح رہے کہ کمپنی ایک ایسی تجارتی جماعت تھی جو ابتدا میں محض اپنی تجارت کے تحفظ کی خاطر اقتدار حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے پاس اس قدر قوت نہیں تھی کہ وہ دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم کرنے میں کسی جارحانہ اصول کو پیش نظر رکھتی وہ ابتدا میں ہندوستان کی سیاست میں نہ تو نمایاں حصہ لے سکتی تھی اور نہ ان دیگر قوتوں کو حقیر سمجھ سکتی تھی جہاں کمپنی کو ایک طرف خود اپنے علاقے میں اپنی قوت کو مضبوط کرنا تھا وہیں وہ اپنے حدود کے باہر کی ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی تھیں۔ جو اسباب دوسری قوتوں کے لئے میدان عمل تیار کررہے تھے وہی کمپنی کے لئے بھی موجود تھے۔ لیکن ایک تجارتی جماعت کا اپنے اقتدار کی خاطر علی الاعلان ہندوستان کی طاقتور ریاستوں سے دست و گریبان ہوجانا اپنی طاقت کے غلط اندازے پر مبنی ہوتا۔ اس لئے کچھ تو عدم مداخلت کی پیروی کرکے اور کچھ دوسری ریاستوں کی حمایت و اعانت حاصل کرکے کمپنی نے اپنی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس دور کی ایک اہم خصوصیت جو بیک نظر معلوم ہوجاتی ہے یہی ہے کہ کمپنی دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے زیادہ خود اپنے ہی علاقے کے استحکام میں مصروف رہی۔ اور اپنی حدود سے متصل ریاستوں کے علاوہ دیگر ریاستوں سے تعلقات پیدا کرنے سے اجتناب کرتی رہی۔ لیکن سنہ ۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۱۳ء تک۔ جبکہ مجلس نظار عدم مداخلت کی حامی رہی بعض حکمران کمپنی کے، ایسے بھی گذرے جنھوں نے الگ تھلگ رہنے کی حکمت عملی کی علانیہ خلاف ورزی کی اور خصوصاً دکن کی سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا ان حکمرانوں کے خیال میں اگر کمپنی سیاست میں عملی حصہ نہ لیتی تو اندیشہ تھا کہ اس کی تجارت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن اس کے باوجود جب ہم سنہ ۱۸۱۳ء کے بعد کی حکمت کا مقابلہ کمپنی کے ابتدائی دور سے کرتے ہیں تو بڑا فرق نظر آتا ہے۔ سنہ ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر کی کامیابی کے بعد کمپنی کے لئے یہ آسان نہیں تھا کہ وہ اودھ کی ریاست کو اپنے علاقے میں ضم کرلیتی اسی طرح پہلی جنگ مرہٹہ کے بعد عہدنامہ سالبائی مورخہ

، ار مارچ ۱۷۸۲ء کی رو سے ان حالات کو حسب حال چھوڑ دیا گیا اور پھر میسور کی چاروں لڑائیوں کے بعد جب ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کو تسخیر کرلیا گیا تو اس وقت بھی کمپنی کی بہبودی اسی میں سمجھی گئی کہ اس علاقہ کو وہاں کے قدیم ہندو خاندان کے حوالے کردیا جائے۔ البتہ دوسری جنگ مرہٹہ میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا وہ نہ تو اصول عدم مداخلت کے مطابق تھا اور نہ مدافعانہ نوعیت رکھتا تھا۔

ولزلی کا دور در اصل ایک وقفہ ہے جس میں اس نے اپنے پیشروں کی حکمت عملی سے انحراف کیا اس نے جو حکمت عملی اختیار کی تھی اس کے سیاسی نتیجہ کو ایک مراسلہ کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جو اس نے مجلس نظار کے نام جولائی ۱۸۰۴ء میں روانہ کیا۔ اپنے حکام اعلی کے اندیشوں کو دور کرتے ہوئے اپنے کارناموں کے نتائج کو اس طرح بیان کیا ہے "حکومت برطانیہ اور ہندوستان کی خاص ریاستوں کے درمیان ایک عام رابطہ، اتحاد اب قایم ہو چکا ہے جو اس اصول پر ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر ہندوستانی ریاست کا ذاتی مفاد اس میں ہے کہ حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلق قایم رکھے اور ہر ریاست کو یہ ممانعت ہے کہ اپنی ناجائز توسیع کی خاطر دوسری ریاست کے حقوق و مقبوضات غصب کرے اور اجازت ہے کہ اپنی معینہ حدود کے اندر اپنے اختیارات کو بلا مداخلت غیرے کام میں لائے[۵]۔ اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ولزلی کا اصول عمل اپنے دور کی عام حکمت عملی سے کس قدر مختلف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ٹیپو سلطان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور حیدرآباد اور مرہٹہ سرداروں نے کمپنی کی حمایت کو تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن ولزلی کے جانشین کارنواس نے پہلا کام یہ کیا کہ مداخلت کے اصول سے دست کشی اختیار کرلی اور ولزلی کی تجاویز کو مکمل نہیں ہونے دیا۔

لارڈ منٹو اگرچہ عدم مداخلت کے اصول کا زیادہ قائل نہیں تھا جس کا ثبوت اس کی ایران۔ افغانستان اور لاہور کی سفارتوں سے ملتا ہے۔ تاہم اس کو حکام اعلی کے دباؤ کے تحت اسی حکمت عملی پر کاربند رہنا پڑا۔

تاریخ ہند کا یہ دور نہایت ہی دلچسپ ہے علاوہ اس کے ریاستوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی معاہدات جس کا حق اس کو چارلس دوم کے ایک منشور کے ذریعہ حاصل ہوا تھا زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ ٹراونکور۔ پوناور بار اور اسی قسم کی بعض ساحلی ریاستوں سے کمپنی کے جو ابتدائی معاہدات ہوئے ان کی نوعیت بالکل تاجرانہ اقرار

---

۵ سر الفرڈ لائل "ہندی مملکت برطانیہ کا عروج اور وسعت" مترجمہ عبدالسلام صاحب ام۔ اے (صفحہ ۲۸۹)

ناموں کی تھی یا پھر وہ ایسے معاہدات تھے جو سمندری ڈاکوؤں کے خلاف اور کمپنی کی تجارت کے تحفظ کے لئے ضروری تھے ان کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں۔

لیکن یہ حالات بہت عرصے تک قایم نہیں رہے اور کمپنی کو تھوڑے ہی دنوں بعد ہندوستان کی سیاسیات میں ایک نمایاں حصہ لینا پڑا۔ سیاسی نوعیت کا سب سے پہلا معاہدہ ۱۴ مئی ۱۷۵۹ء کو حیدرآباد سے ہوا۔ اس معاہدہ کے ذریعہ کمپنی نے ریاستوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ابتدا کی۔ دکن کے حالات ایسے تھے کہ کمپنی محض اپنے تحفظ اور مدافعت کی خاطر ان سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی لئے اس کو بعض ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قایم کرلینے پڑے۔ اور یہی تعلقات آیندہ چل کر عہد معاونت کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ یہ ایک مدافعانہ اصول تھا جو محض کمپنی کے علاقہ کی محافظت کے لئے قریبی ریاستوں کی حد تک اختیار کیا گیا۔ کمپنی کو اس ابتدائی دور میں ریاستوں سے جو معاہدات کی روشنی میں آیندہ کے سیاسی تعلقات کی توسیع عمل میں آئی۔ ان میں سب سے پہلا معاہدہ ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو اودھ کی ریاست سے ہوا جس کی رو سے بنگال میں کمپنی کے علاقے کا تعین کردیا گیا۔ دوسرا میثاق جولائی ۱۷۹۰ء کا ہے جس کی رو سے ٹیپو سلطان کے خلاف کمپنی پیشوا اور نظام میں ایک اتحاد ثلاثہ قایم ہوا اور جس کی وجہ سے بالآخر حیدرعلی کی سلطنت کا خاتمہ کردیا گیا۔ اس کے بعد حیدرآباد۔ ٹراونکور اور تنجور سے اور کئی معاہدات ہوئے۔ تیسرا اہم معاہدہ ۳۱ دسمبر ۱۸۰۲ء کا عہدنامہ بسین ہے جس نے یہ ظاہر کردیا کہ مرہٹہ برادری کی قوت کا مرکز ٹوٹ چکا ہے اور پیشوا اپنے بجائے کسی اور مرہٹہ سردار مرکزی قوت کے دعویدار ہوگئے ہیں اس کی وجہ سے مرہٹہ برادری کے طاقتور ارکان سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ کئی معاہدات کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چوتھا اہم معاہدہ ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کا میثاق لاہور ہے جس کی وجہ سے شیر پنجاب اور کمپنی کے درمیان سیاسی تعلق پیدا ہوگیا۔" یہ چار دستاویزات کلائیو کے ہندوستان میں کامیاب ہونے کے بعد سے لارڈ منٹو کے دور حکومت کے اختتام تک کے زمانے میں بہت ہی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں[1]۔ یہاں ہم ان واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے جو ان معاہدات سے متعلق ہیں۔

۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء میں میجر منرو نے بکسر کی لڑائی میں نواب وزیر اودھ کے خلاف ایک شاندار فتح حاصل کی۔ اگر کمپنی کی حکمت عملی اور فوجی قوت اجازت دیتی تو اس علاقہ کا اسی وقت الحاق عمل میں آتا جس پر شجاع الدولہ

---

[1] Lee-Warner. The native States of India, 1910, P. 62

حکومت کر رہا تھا لیکن وہ حالات جن میں کمپنی گھری ہوئی تھی اس کے مانع تھے۔ اس کی وجہ سے انگریز تاجروں کو ایک وسیع سرحدی علاقہ مل جاتا جس کو انھیں افغانستان کے درانیوں اور دکن کے مرہٹوں سے محفوظ رکھنا پڑتا[1]۔ علاوہ اس کے کمپنی کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قدر وسیع علاقے کی ذمہ داری لے سکے کمپنی اپنے سیاسی فوجی اور مالی حالات کے لحاظ سے اس علاقے سے دست بردار ہونے پر مجبور تھی۔ چنانچہ گورنر بنگال نے نواب کے مفتوحہ علاقوں کو واپس کر دینے میں یہی مصلحت سمجھی کہ اس طرح اس نے اپنے صوبہ اور باہر کی دنیا کے درمیان دوستانہ اتحاد کی ایک زبردست حد فاصل تیار کر لی ہے[2]۔ ۱۶ر اگست ۱۷۶۵ء کو شجاع الدولہ سے باہمی اتحاد (Mutual alliance) کا جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے اودھ پر کسی خارجی حملہ کے وقت اپنی فوجی امداد کا اقرار کیا گیا لیکن اس کے اخراجات کا بار اودھ پر عائد کیا گیا اس طرح کمپنی نے اپنے علاقے کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے اودھ کی فوجی اعانت کی ذمہ داری لے لی اور اسی حکمت عملی پر تقریباً نصف صدی تک عمل کیا گیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وارن ہیسٹنگز کے اس جملہ سے ہو سکتا ہے وہ کہتا ہے " نواب کے علاقوں کو کسی یورش سے بچانا دراصل ہماری مدافعت کرنا ہے[3]"۔ غرض کمپنی کا مفاد اسی میں تھا کہ بجائے اودھ کو اپنے علاقے میں شامل کر لینے کے اس کو نواب وزیر ہی کے قبضہ میں رہنے دے۔ لیکن وارن ہیسٹنگز کے زمانے تک کمپنی کی قوت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ اور گو وزیر اودھ اندرونی معاملات کی حد تک بالکل آزاد تھا تاہم اس کی قوت روز بروز گھٹتی جا رہی تھی اب اپنے ملک کی حفاظت کے لئے سوائے اس کے کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ کلیتاً کمپنی کی قوت پر بھروسہ کرتا۔ چنانچہ جنگ روہیلہ کے سلسلہ میں وارن ہیسٹنگز نے کونسل کو لکھا تھا کہ " اس کی سرحد کو مرہٹوں سے قریب تر لے آنے میں یہ فایدہ ہوگا کہ چونکہ اس میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے اس لئے لامحالہ وہ اور زیادہ ہمارا محتاج ہو جائے گا"۔ لیکن اب بھی اودھ کی اندرونی آزادی بحال رہی اور شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے اس کو حد فاصل سمجھا جاتا رہا۔ کارنوالس اور سر جان شور نے اودھ کے معاملات کی طرف توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ولزلی گورنر جنرل ہوا تو اودھ میں ابتری پھیلی

---

[1] K. M. Panikkar, Indian States and the Government of India 1932. P, 6, 7

[2] Lee-Warner, P. 64.

[3] Letter to col: Champion, Glieg's Life of Hastings vol i P, 443

ہوئی تھی اور وزیر اودھ کی فوج خود آمادہ بغاوت تھی۔ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کو ولزلی نے وزیر اودھ سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد خود ارل مارنگٹن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اودھ کے علاقہ میں کمپنی کا کامل اور بلا شرکت غیرے اقتدار قایم[۱] کر دیا جائے۔ اس کے تحکمانہ نامہ و پیام کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر اودھ نے تمام سرحدی صوبجات بشمول روہیلکھنڈ کمپنی کے حوالے کر دیے تاکہ اس کی آمدنی سے معاونین فوج کے اخراجات پورے کئے جائیں۔ الفرڈ لائل لکھتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اودھ کی سپردگی میں وہ اضلاع رکھے جائے جو مرہٹوں اور شمالی مغربی حملہ آوروں کے سامنے بے پناہ تھے۔ لارڈ ولزلی نے اس پیش کش کے ذریعہ بیرونی سرحد کے پورے منطقہ پر قبضہ پالیا اور اس کے بعد سے اودھ سب طرف سے انگریزی مملکت سے گھر گیا[۲]۔ جو علاقہ نواب سعادت علی خاں کے قبضہ میں باقی رہا اس کے متعلق انھوں نے وعدہ کیا کہ "وہ اپنے محفوظ علاقوں میں ایسا نظم و نسق رائج کریں گے جس کو خود ان ہی کے عہدہ دار چلائیں گے، جو ان کی رعایا کی مرفہ الحالی میں مدد معاون ہوگا اور باشندوں کی زندگی اور جایداد کی محافظت کا باعث ہوگا۔ اور ہز اکسیلنسی ہمیشہ متذکرہ آنریبل کمپنی کے افسروں کے مشورہ کے مطابق عمل کریں گے[۳]۔" یہاں یہ امر بالکل واضح ہے کہ کمپنی نے اودھ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کے اختیار کو بہت بڑی حد تک حاصل کر لیا چنانچہ ولزلی نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۰۱ء میں جو اس نے مجلس نظار کی خفیہ کمیٹی کے نام لکھا تھا۔ اس حق کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس معاہدہ کے ذریعہ اودھ کے اندرونی معاملات کے متعلق حاصل ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس معاہدہ کی وجہ سے گورنر جنرل کو نواب کے مقبوضہ ملک کے اندرونی انتظام میں مداخلت کرنے کا ایک صریحی حق حاصل ہو گیا ہے[۴]۔"

حیدرآباد سے معاہداتی تعلقات کی ابتدا ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ دوسری ریاستوں کی طرح یہاں بھی کمپنی کی قوت کے اضافہ اور استحکام کے ساتھ معاہدات کی نوعیت میں فرق آ گیا۔ مگر یہ واضح رہے کہ اودھ یا کرناٹک کی طرح حیدرآباد سے ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا جس سے اس کے اندرونی معاملات میں کمپنی کو مداخلت کا

---

[۱] Wellesly's Despatches. Edited by S. J. Owen P. 193

[۲] ہندی مملکت برطانیہ (ص ۲۰۲)

[۳] Aitchison, Treaties and Engagements.

[۴] Wellesly's Despatches. Edited by Sidney J. Owen P. 210

حق حاصل ہوتا۔ ۱۷۶۸ء میں والئی حیدرآباد سے ایک دوستانہ معاہدہ ہوا تھا۔ اس زمانہ میں جب مرہٹوں کی طرف سے خطرہ بڑھتا گیا تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کمپنی کی اعانت کی پوری پوری وضاحت کردی جائے۔ چنانچہ میرعالم سے گفت و شنید کے بعد لارڈ کارنوالس نے ایک تشریحی خط کے ذریعہ اطمینان دلایا کہ جو فوج نظام کے خرچ پر رکھی گئی ہو اس کو "نظام جب کبھی طلب کریں حاضر خدمت کردی جائے گی۔ بشرطیکہ ان کا استعمال ان قوتوں کے خلاف نہ ہو جن سے کمپنی کے دوستانہ تعلقات قایم ہو چکے ہیں"[1]۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ٹیپو سلطان کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی اور انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ اسی سے لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی قوت توڑنے کے لئے ۱۷۹۰ء میں نواب آصف جاہ پیشوا اور کمپنی کے درمیان ایک اتحاد ثلاثہ ہوا جس کی نوعیت دفاعی تھی۔ جب ۱۱ مارچ ۱۷۹۵ء کو بمقام کھرلہ مرہٹوں نے حیدرآباد کی فوجوں کو شکست دی تو اس وقت سرجان شور نے کسی قسم کی اعانت سے قطعی انکار کردیا مگر ولزلی کے نزدیک عدم مداخلت کا یہ اصول غیر مدبرانہ تھا جس کی وجہ سے حیدرآباد میں فرانسیسی عہدہ داروں کی قیادت میں پندرہ ہزار کی ایک زبردست منظم فوج تیار ہوگئی تھی۔ یہ صورت حال ولزلی کے نزدیک جو ٹیپو سے مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا کسی طرح برقرار نہیں رکھی جاسکتی تھی چنانچہ اس نے ۱۷۹۸ء میں نواب نظام علی خاں سے ایک معاہدہ کیا جس کی روسے نہ صرف حیدرآباد میں فرانسیسی اثر کا خاتمہ کردیا گیا بلکہ کمپنی کی حمایتی فوج بھی منتقل کردی گئی اور اس کی تعداد کو چھ پلٹنوں تک بڑھادیا گیا۔ اور یہ طے پایا کہ مرہٹوں اور نظام کے تنازعات کمپنی کی ثالثی میں طے پائیں گے۔ اس معاہدہ کا اہم نتیجہ بعد میں یہ نکلا کہ حیدرآباد کے خارجی اقتدار اعلیٰ پر تحدید عاید ہوگئی۔

چوتھی جنگ میسور کے بعد جب ٹیپو کا خاتمہ ہوگیا تو کمپنی کی سیاسیات کا مرکز پونا کی طرف منتقل ہوگیا۔ پیشوا اب تک کمپنی کی حمایت سے انکار کرتا رہا تھا لیکن اب جبکہ ہلکر نے پیشوا اور سندھیا کی متحدہ فوجوں کو شکست دے دی تو پیشوا نے مناسب جانا کہ انگریزوں کی حمایت و اعانت تسلیم کرے چنانچہ ۳۱ ڈسمبر ۱۸۰۲ء کو وہ مشہور عہدنامہ بسین مرتب ہوا جس کی روسے پیشوا نے کمپنی کی حمایت قبول کرلی اور حمایتی فوج کے اخراجات کے لئے اپنی ریاست کے بعض اضلاع کمپنی کے حوالے کئے۔ علاوہ اس کے یہ طے پایا کہ نظام اور گیکواڑ سے پیشوا کے تنازعات کا تصفیہ کمپنی

---

[1] H. G. Briggs. Nizam, His History and relations with the Birtish Government vol I. P252

ہی کریگی۔ پیشوا دوسری قوتوں سے بغیر برطانوی منظوری کے کسی قسم کے تعلقات قایم نہیں رکھے گا۔ اس طرح پیشوا کے تمام تعلقات خارجہ کمپنی کے ماتحت کر دیے گئے ظاہر ہے کہ مرہٹہ برادری کے دوسرے طاقتور اراکین کے نزدیک یہ معاہدہ قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا جو خود پیشوا کے اقتدار پر قبضہ کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ان ہی جھگڑوں سے گھبرا کر گیکواڑ بڑودھ نے بالآخر ایک معاہدہ کے ذریعہ ۱۶ر جون ۱۸۰۲ء کو کمپنی کی حمایت تسلیم کر لی لیکن کمپنی کو گوالیار اندور اور ناگپور کے بھونسلہ خاندان سے جنگ کے بعد ہی اپنی سیادت کو منوانا پڑا۔ چنانچہ ۳۰ر ڈسمبر ۱۸۰۳ء کو معاہدہ سرجی ارجن گاؤں کے ذریعہ سندھیا نے اور معاہدہ دیوگاؤں مورخہ ۱۷ر ڈسمبر ۱۸۰۳ء کے ذریعہ بھونسلہ نے کمپنی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سندھیا سے جو معاہدہ ہوا اس کی نوعیت عہد معاونت کی نہیں تھی ۲۴ر ڈسمبر ۱۸۰۵ء کو ہلکر نے بھی ایک حمایتی معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ اسی دوران میں اودر بھرت پور کے راجاؤں نے بھی کمپنی کی حمایت قبول کر لی۔ غرض اس طرح وسط ہند کی سیاسیات پر کمپنی نے اپنا قبضہ کر لیا۔

اس دور کے چوتھے اہم میثاق کا تعلق پنجاب کے معاملات سے ہے پنجاب میں رنجیت سنگھ نے زبردست قوت حاصل کر لی تھی اور ۱۷۹۹ء میں راجہ کا لقب بھی اختیار کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب فرانس۔ روس اور ایران میں اتحاد ہو گیا تو شمالی سرحد کی طرف سے لارڈ منٹو کو بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس نے سر چارلس مٹکاف کو پنجاب بہ حیثیت سفیر کے روانہ کیا اور بالآخر اس نے ۲۵ر اپریل ۱۸۰۹ء کو رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اس کی رو سے رنجیت کو ستلج کے شمال میں بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا اور اس نے ستلج کی جنوبی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرنے سے دست برداری اختیار کی۔ یہ معاہدہ مساویانہ شرائط پر طے پایا۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اودھ کی سرحدی اہمیت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہاں پر مختصراً لارڈ ولزلی کی اس فوجی حکمت عملی کا ذکر کر دینا ضروری ہے جو عہد معاونت کے تحت اختیار کی گئی ہم نے دیکھا ہے کہ اس دور میں ولزلی کا اصول عمل اس عام رجحان سے کس قدر مختلف تھا جو عدم مداخلت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی اختلاف نے ولزلی کو یہ باور کرنے پر مجبور کر دیا کہ انگریزی قوت کی فوقیت کو ممکنہ حد تک دیسی ریاستوں سے منوانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس کے اتمام کے لئے اُس نے عہد معاونت کا اصول اختیار کیا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ کمپنی اپنی قوت کا استحکام چاہتی تھی اور اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ حمایتی ریاستوں کی

فوجی حکمت عملی کی بھاگ اپنے ہاتھ میں رکھے۔ چنانچہ اس اصول کا منشا ریاستوں کو ان تمام ذرائع سے محروم کر دینا تھا۔ جن سے کمپنی کے تحفظ کے لئے خطرہ کا امکان ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا معاہدہ ۱۲ نومبر ۱۷۶۶ء کو حیدرآباد سے کیا گیا جس میں "معقول اور مناسب" امور کے تصفیہ کے لئے کمپنی کے ایک فوجی دستہ کی اعانت کا وعدہ کیا گیا۔ ۱۷۹۵ء میں ٹراونکور کو اس کا تابع بنا دیا گیا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور اور ۱۸۰۲ء میں بڑودہ اور پونا کو اس معاونت سے وابستہ کر دیا گیا۔ اس عہد معاونت کے تحت جو فوجی اعانت دی جاتی تھی اس کو ہندوستانی رئیسوں نے بادل نخواستہ قبول کیا۔ "اتحادین ان فوجوں کو اپنی آزادی کے حق میں ایک خطرہ سمجھتے تھے اور ان کی رعایا ایک ایسی قوت کا مسلسل دباؤ محسوس کرتی تھی جو حکومت کی بدعملی کے خلاف ان کے احتجاج کو فرو کرنے میں کام میں لائی جا سکتی تھی"۔[1]

سر تھامس منرو نے عہد معاونت اور اس کے نتائج کے متعلق ۱۲ اگست ۱۸۱۷ء کو ایک بصیرت افروز خط مارکوئیس ہسٹنگز کے نام لکھا تھا۔ اس میں اس نے جہاں انگریزی حکومت کے نقصان رساں اثرات پر صداقت شعارانہ اظہار خیال کیا ہے وہیں حمایتی فوج کی برائیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے "اس کا ایک فطری رجحان یہ ہوتا ہے کہ ہر ملک کی حکومت کی رائج الوقت کمزور اور سخت گیر حالت کو بحال رکھے۔ سماج کے اعلیٰ طبقوں سے باوقار جذبہ کا خاتمہ کر دے اور تمام باشندوں کو نہایت ہی ذلیل و محتاج بنا دے۔ ہندوستان میں حکومت کی بدنظمی کا علاج عموماً محل شاہی کے ایک خاموش انقلاب کی صورت میں نمودار ہوتا ہے یا پھر کسی خوفناک بغاوت یا بیرونی حملہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن برطانوی فوج کی موجودگی جو والی ملک کے تخت کو اس کے تمام اندرونی و بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی وہ ناکارہ اور کاہل بن جاتا ہے کیونکہ اس طرح اس کو اپنی محافظت کے لئے بھی اجنبیوں کا سہارا ڈھونڈنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ اس کو ظالم اور حریص بنا دیا جاتا ہے اس لئے کہ اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اپنی رعایا کی نفرت و حقارت سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جہاں کہیں یہ معاونتی نظام رائج کیا گیا..... بہت جلد آثار ملک میں دیہات کی تباہی اور آبادی کی تخفیف کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ پیشوا اور نظام کے علاقوں میں تو بہت پہلے ہی یہ آثار نمودار ہو چکے ہیں"۔[2]

---

[1] Lee-warner. P, 94

[2] A selection from Wellely's Despatches P, 795

غرض اس اصول عہد معاونت سے اس دور کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں ابھی کمپنی کی سیادت ایک حقیقت نہیں تھی۔ جنگوں کا بہت زیادہ امکان تھا اور ایک وسیع علاقہ ایسا تھا جو کمپنی کے حلقہ اثر سے خارج تھا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی ریاستوں پر کمپنی کو کوئی اعتماد نہیں تھا۔

ابتدائی دور میں کمپنی کے دیسی ریاستوں سے جو معاہدات ہوئے ان سے ہندوستان کی عام حالت کمپنی کی قوت اور حاکمان اعلیٰ کے نقطۂ نظر پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ کچھ تو اپنی غیر مستحکم حالت اور کچھ ارباب اقتدار کے دباؤ کی وجہ سے ملازمین کمپنی کو دیسی ریاستوں سے معاملت کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس دور کے تعلقات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ کمپنی کو اپنی مدافعت کے لئے بعض معاہدات کر لینے ضروری تھے جیسا کہ بعض ساحلی علاقوں کے معاہدات سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کمپنی کے لئے بعض معاملات میں حصہ لینا ناگزیر ہو گیا لیکن اس صورت میں بھی یہ کوشش کی گئی کہ ممکنہ حد تک ایسے تعلقات سے احتراز کیا جائے جن کی وجہ سے کمپنی کو غیر معمولی مشکلات اور ذمہ داری کا سامنا کرنا پڑتا۔ تیسرے یہ کہ کمپنی اس دور میں بین الاقوامی قانون کے تحت اپنے حلیفوں کو بالکل آزاد اور مقتدر قوتیں سمجھنے پر مجبور تھی ابتدائے انیسویں صدی تک بھی کمپنی ریاستوں کو مساوی الحیثیت اور آزاد تصور کرتی رہی۔ آسٹن کے نظریہ اقتدار اعلیٰ اور بین الاقوامی قانون کے لحاظ سے بھی ان ابتدائی معاہدات کی صحیح تاویل کی جاسکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس ابتدائی دور کے آخری زمانے میں کمپنی نے کافی قوت حاصل کر لی تھی لیکن جس منبع سے اسے اختیارات دیوانی حاصل ہوئے تھے اس نے اس کی حیثیت کو بالکل ایک معمولی صوبیداری میں تبدیل کر دیا تھا اس لئے ادھر حیدرآباد اور مرہٹوں سے اس کے تعلقات صرف مساویانہ بنیاد ہی پر قایم ہو سکتے تھے۔ کم از کم نظری اعتبار سے کمپنی اس پر مجبور تھی کہ دو ریاستوں کو مساوی الحیثیت آزاد اور مقتدر تصور کرے۔ معاہدوں کی شرایط اور ان کے الفاظ سے بھی دوطرفی اقرارناموں کی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے۔

۹ فروری ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ سے جو معاہدہ ہوا اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو مساوی قوتوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے۔ اگست ۱۷۵۶ء میں کلایو نے نواب وزیر سے "باہمی اتحاد دوستی" کا معاہدہ کیا تھا اور اس اصول کو پیش نظر رکھا تھا کہ کمپنی کی مدافعت کو وسعت نہ دی جائے خود کلایو مقررہ حدود سے آگے

بڑھنے کو "حریصانہ۔ احمقانہ اور متجاوزانہ منصوبہ" تصور کرتا تھا۔ معاہدات کی شرائط ایسی ہوتی تھیں جس سے فریق ثانی پر کسی قسم کی زیادتی کا اظہار نہ ہو۔ جنوری ۱۷۶۶ء میں کولہاپور سے جو معاہدہ سمندری ڈاکوؤں کے خلاف ہوا تھا۔ اس کی رو سے کمپنی نے اقرار کیا تھا کہ کولہاپور کے کسی باشندے کو وہ اپنے ہاں ملازم نہیں رکھے گی اور ریاست کے ایسے مفرورین کو جو اس کے علاقے میں پناہ گزیں ہوں ریاست کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ۱۷۹۰ء میں جو اتحاد ثلاثہ قایم ہوا تھا اس کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی معاہدہ کی رو سے یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ جنگ میں کامیابی یا کسی علاقے کی تسخیر کے بعد اس کی تقسیم میں حصہ داروں کی خواہشات اور سہولت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ ہر ایک رکن ثلاثہ کا ایک نمایندہ دوسرے ارکین کی فوج میں مقیم رہے گا اور اس کی خاص عزت کی جائے گی۔ اور اگر صلح ناگزیر ہو تو باہمی مشورہ سے کی جائے گی غرض اس کی نوعیت باہمی مساوی الحیثیت معاہدہ کی ہے۔

۱۲ اکٹوبر ۱۸۰۰ء میں نظام الملک سے کمپنی کا جو "دفاعی معاہدہ" ہوا اس کی ابتدائی سطور ہی میں اس کا ایک مقصد "ایک دوسرے کی حدود کی تکمیل اور باہمی محافظت کے علاوہ دونوں کے متعدد حلیفوں کی حمایت بھی قرار پایا۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ نواب سکندر جاہ کے زمانے تک گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری مراسلات میں "نیازمند" لکھا کرتا تھا اور نظام الملک اپنے لئے "مابدولت" کا لفظ استعمال کرتے تھے لیکن ۱۸۲۹ء میں مراسلت کے ان آداب کو ترک کر دیا گیا۔ گو ان الفاظ کی زیادہ اہمیت نہیں معلوم ہوتی لیکن اس سے اس کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے مقابل ابتدا میں کمپنی کی حالت کیا تھی اور بعد میں کیا ہوگئی۔ ریاستوں سے کمپنی کے ابتدائی تعلقات سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ نہ تو کمپنی کو ان پر سیادت حاصل ہوئی تھی اور نہ اس کا مقصد ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا تھا ولزلی کے دور میں بھی حمایتی ریاستوں کے مقابل کمپنی کے تفوق کا اظہار نہیں کیا گیا اور سندھیا اور حیدرآباد کی فوجوں پر تو عہد معاونت کے بعد بھی کوئی تحدید عائد نہیں کی گئی۔ معاہدات سے اس امر کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ ریاستوں کی اندرونی آزادی اور داخلی اقتدار اعلیٰ پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ معاہدات کی نوعیت میں فرق آ گیا اور جس طرح کمپنی کی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہوتی گئی اسی طرح ان کی اسپرٹ کو بھی نظرانداز کر دیا گیا کمپنی نے حلیفوں کے باہمی نزاعات کے تصفیہ کو اپنے ذمہ لے لیا

Aitchison, Treaties and Engagement vol: IX p. 67

ارجی حکمت عملی میں کمپنی کو سب سے زیادہ خطرہ فرانس کا تھا اس لئے ریاستوں سے معاہدہ کرتے وقت ان امور کا اص طور پر خیال رکھا گیا جن سے فرانسیسی اثر کی روک تھام ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود ریاستوں کی حیثیت "ماتحت لیفوں" کی نہیں ہوئی تھی۔ پیشوا کمزور تھا مگر کمپنی بھی اس قدر طاقتور نہیں تھی کہ اس کے اقتدار اعلیٰ پر قیود و بندیاں عائد کر سکتی۔ وزیراودھ کی مساوی حیثیت کو تو پہلا دور گزرنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک تسلیم کیا جاتا رہا در ۱۸۳۸ء کے معاہدہ میں بھی یہ طے پایا کہ "ہر فریق دوسرے سے مساویانہ خطابت رکھے گا"[1]

محمد شہاب الدین۔ ایم۔ اے (عثمانیہ)

---

[1] Lee-warner, P. 73.

حیدرآبادی نوجوان سے!

دیر سے لہرا رہی ہیں بجلیاں سوئے وطن — ہوشیار! اے خالقِ مستقبلِ ملکِ دکن
اب اگر سویا تو اُڑ جائیں گی غافل دھجیاں — گھات میں طوفان ہیں اور تاک میں ہیں آندھیاں
کارنامے لوحِ ہستی سے مٹائے جائینگے — دیکھ چُن چُن کر ترے آثار ڈھائے جائینگے
لہلہاتے کھیت پامالِ خزاں ہو جائینگے — تیرے کوہستان سب آتش فشاں ہو جائینگے
جاگ! ماضی کو نہ رُو، یہ شُبھ گھڑی ٹل جائیگی — سامنے آنکھوں کے کشتِ آرزو جل جائیگی
قافلے منزل پہ ہیں مصروفِ عیشِ جاوداں — تابکے گم گشتگی اے یوسفِ بے کارواں!
حیف ہے! اب تک ترا سازِ عمل خاموش ہے — اہلِ محفل ہیں پریشاں کچھ تجھے بھی ہوش ہے
برق کے مانند سیرت زندگی بر دوش ہو — زورِ طوفانوں کا ہو اور زلزلوں کا جوش ہو

اپنے ہی ہاتھوں سے یوں تذلیل ہستی تا بہ کے! اے بلندی کے مکیں! یہ وہم پستی تا بہ کے!
خود شناسی تیری سیرت میں جھلکتی کیوں نہیں تیرے ساغر سے مئے عرفاں چھلکتی کیوں نہیں؟
کیا بگاڑے گا جو دشمن درپئے آزار ہے اس کا رونا ہے کہ تو اپنی نظر میں خوار ہے
یہ تری محرومیوں کا راز ہے اے بے خبر! ہے ترے ہر اک عمل سے بے یقینی جلوہ گر
وار تیرے اس لئے دشمن کو تڑپاتے نہیں تجھ کو اپنی تیغ کے جوہر نظر آتے نہیں
رہبروں کی جستجو میں کس لئے حیراں ہے تو اے خودی نا آشنا خود رہبرِ دوراں ہے تو
اس تڑپ سے ہو شریکِ مردِ اہلِ کمال سب کی آنکھیں خیرہ کردے شوقِ خدمت کا جلال
الفت اخلاص ٹپکتی ہو تری گفتار سے حال کی رنگت بدل دے قوت کردار سے
ظلمتوں کو غرق کر دے کثرتِ انوار میں صبح مستقبل کے جلوے ہوں تری تلوار میں
درفشاں ہو جا: کہ ابرِ رحمت یزداں ہے تو ساحلوں کو توڑ موجِ بحرِ بے پایاں ہے تو
جھونک دے شعلوں میں فرسودہ نظامِ زندگی اے مسیحا! عام کر تازہ پیامِ زندگی
جاں نثاروں میں سرِ فہرست تیرا نام ہو سر کٹا دینا درِ آصف پہ تیرا کام ہو

فکر کر لے ابتدائے کار سے انجام کی
اے وطن پرور! قسم تجھ کو وطن کے نام کی

سکندر علی وجد (بی اے عثمانیہ)

پیچ - سی - نہیں

سروِ صحرا

بیامتی پیٹھ آج ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے جس کی عالی شان قطب شاہی مسجد کے بلند و خوبصورت مینار حیدرآباد سے حمایت ساگر جانے والی سڑک کی بائیں طرف اب بھی راستہ سے گزرنے والوں کو اپنے طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یہ مقام گولکنڈہ کے زندہ دل بادشاہوں کی بہترین تفریح گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سلطنت کے بادشاہوں اور امیروں نے قلعہ کے باہر دور دور تک اس قسم کے شبستان آباد کر رکھے تھے، اور جب کبھی درباری زندگی اور سیاسی اُلجھنوں سے فرصت ملتی تو قلعہ سے نکل کر ہر ایک اپنے اپنے گوشۂ عشرت میں دل بہلاتا تھا۔

ان شبستانوں کو آباد کرتے وقت دو باتوں کا ضرور خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہاں سے ان کی اُمیدوں کا آماجگاہ قلعہ گولکنڈہ نظر آتا رہے، اور دوسرے یہ کہ وہاں سب سے پہلے ایک شایان شان مسجد کی بنا ڈالی جائے۔ چنانچہ گولکنڈہ کے اطراف و اکناف میلوں تک جنگلوں میں جو خوشنما مسجدیں نظر آتی ہیں وہ قطب شاہیوں کے انہی عشرتکدوں کے باقی ماندہ آثار ہیں۔ ان کے قرب و جوار کے پُر تکلف محلات اور بارونق بازار تو صدیوں کی ویرانیوں اور سیاسی افراتفریوں کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئے۔ لیکن مسجدیں باقی رہ گئیں۔

رہے نام اللہ کا

(۲)

پیاماتی پیٹھ میں اب تک مشہور ہے کہ تانا شاہ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے یہاں آجاتا تھا اور ایک رات گذار کر دوسرے دن جمعہ کی نماز اس مسجد میں پڑھنے کے بعد سکار کھیلتے ہوئے قلعہ کو واپس ہو جاتا۔ بادشاہ کو ملکہ کا بڑا خیال تھا وہ حد درجہ نازک مزاج تھی جب کبھی جلال میں آجاتی تو پھر کسی سے نہ سنبھلتی اور قطب شاہی محل اس کی گرج دار آواز سے لرزنے لگتے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ تنک مزاج ہو گئی تھی۔ مغلوں کے پروپگنڈے نے تانا شاہ بادشاہ کو فاسق وفاجر مشہور کر رکھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ دوسرے بادشاہوں کی طرح اُس کے محل میں حرم کا وجود ہی نہ تھا البتہ ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا تھا کہ بادشاہ ایک غریب کسان کی بیکس لڑکی کو اپنے محل میں پناہ دینے پر مجبور ہو گیا تھا جس کا حسب ذیل قصہ اب تک پیاماتی پیٹھ میں زبان زد خاص وعام ہے

تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی بادشاہ سکار کے لئے نکلا تھا۔ ہرن کے تعاقب میں وہ اپنے ساتھیوں سے دور نکل چکا تھا کہ پیاماتی پیٹھ کے قریب اس کو ایک کسان کی جھونپڑی میں سے کسی کے آہستہ آہستہ رونے کی آواز سنائی دی، قریب پہنچکر اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی ایک بڈھے کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھی ہے، اور زار وقطار رو رہی ہے

بادشاہ پر بھی ایک زمانہ ایسا گذر چکا تھا جب وہ خود جنگل میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ اس پر اس حالت کا بڑا اثر ہوا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑا، اور قریب ہو کر دریافت کیا۔ غریب دہقان زادی بادشاہ کو اپنی جھونپڑی میں دیکھ کر دنگ ہو گئی۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے پہلے بھی بادشاہ کی سواری اپنے باپ کے کھیت کے قریب سے گذرتی ہوئی دیکھی تھی اور اس کے باپ نے کہا تھا کہ بادشاہ کی صورت کا نظر آجانا ہی برکت اور خوشی کا باعث ہے۔ اس خیال سے وہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنتے ہی ان کی طرف دوڑتی تھی تاکہ بادشاہ کا چہرہ نظر آجائے لیکن کبھی اس کو ایسا موقعہ نہ ملا تھا کہ اچھی طرح دیکھ سکتی۔

آج جو اُس نے اس قدر قریب سے بادشاہ کو دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور نہ معلوم کب تک یہ حالت جاری رہتی اگر بادشاہ بکمال شفقت اُس کے رونے کا سبب دریافت نہ کرتا۔ جب لڑکی کے ہوش وحواس درست ہوئے تو اُس نے سنبھل کر اپنے نیم برہنہ جسم کو اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں سے ڈھانپتے ہوئے عرض کیا:۔

میرا باپ ہمیشہ کہتا تھا کہ بادشاہ کی صورت نظر آجائے تو خوشی ہی خوشی ہے حالانکہ آج تو میرے سر پر غم کا

پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ یا تو آپ بادشاہ نہیں ہیں اور اگر میں واقعی بادشاہ سلامت کو دیکھ رہی ہوں تو پھر میرے بوڑھے باپ کو سانپ نے کیوں ڈسا اور اس نے اس قدر جلد کیوں آنکھیں بند کرلیں"۔

بادشاہ ابھی اس سے محو کلام ہی تھا کہ خدامان شاہی بھی پہنچ گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ فوراً کسی طبیب یا سانپ کا عمل جاننے والے کو بلایا جائے۔ اُس نے دہقان دوشیزہ کو تسلی دی اور اپنے چند ملازمین وہاں چھوڑ دیئے۔ چلتے ہوئے اُس نے لڑکی سے کہا:۔

"بادشاہ کی صورت نظر آجانے کے بارے میں تمہارا باپ جو کچھ کہتا تھا اُس کے آزمانے کا دراصل یہی وقت ہے"

(۳)

دوسرے روز صبح میں بادشاہ کو اطلاع ملی کہ کسان جانبر نہ ہوسکا۔ سانپ کاٹے ہوئے عرصہ گذرچکا تھا طبیبوں اور عاملوں نے رات تمام اس کی لاش کے ساتھ بیکار محنت کی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بدقسمت دہقان کی حرماں نصیب لڑکی کو سایۂ عاطفت میں لے لیا جائے۔

شام ہونے سے قبل دہقان زادی قلعہ گولکنڈہ میں پہنچا دی گئی جہاں اُس کو محل کی اصیلوں اور خادماؤں نے حمام کراکے خلعت فاخرہ میں ملبوس کیا اور دولت خانۂ عالی کے اس قطعہ میں فروکش کیا جو کسی زمانے میں بھاگمتی اور تارامتی کی قیام گاہ رہ چکا تھا۔ تاناشاہ نے تاکید کردی تھی کہ اُس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا جائے تاکہ وہ بہت جلد اپنے باپ کا غم بھول سکے۔

چند روز گذرنے کے بعد دریافت کرنے سے بادشاہ کو معلوم ہوا کہ غریب دہقان زادی اب بھی غم زدہ ہے اور اس کا اکثر وقت رونے میں گذرتا ہے۔ تاناشاہ اُس کی آزادانہ گفتگو اور بیباک حسن ملیح سے متاثر ہوچکا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ محل کی آسایش اور شاہانہ لباس اور زیورات پہن کر وہ اپنی قدیم زندگی کو بالکل بھول جائے گی لیکن شاید اس کو یاد نہ رہا کہ وہ خود گولکنڈہ جیسی سلطنت کا بادشاہ ہوجانے اور خداداد محل اور گگن محل جیسے فلک بوس محلات میں اقامت گزیں ہونے کے باوجود بعض اوقات تنہائی میں اپنے بچپن کے جھونپڑے اور دیہات کی آزادانہ زندگی کو یاد کرکے اکثر بے چین ہوجاتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس سروِ صحرا کو میرے حضور میں لایا جائے۔

دہقان زادی نے جب کئی روز کے بعد بادشاہ کی صورت دیکھی تو اُس کو پھر سے اُس گھڑی کا خیال آگیا

جب کہ وہ اپنی جھونپڑی میں اپنے باپ کی لاش لئے بیٹھی تھی۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ خادموں نے سمجھایا کہ تم اس وقت ظل اللہ کے حضور میں ہو اور یہ طریقہ آداب کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے خود بھی دلاسا دیا اور کہا۔

"تم اس قدر رنجیدہ کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

دوشیزہ نے جواب دیا:۔

"حضور مجھے اپنے پیارے باپ کا غم ہی کیا کم تھا جو اس قید خانے کی مصیبت نصیب ہوئی ہے۔"

بادشاہ نے متعجب ہوکر پوچھا:۔

تم قید خانے میں نہیں محل میں ہو۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہے۔ کھانے کو لذیذ غذائیں، پہننے کو رنگ برنگ کے بہترین لباس، اور آرائش کے لئے جواہرات کے گہنے! اس سے بڑھ کر تم کیا چاہتی ہو؟"

دہقان زادی نے عرض کیا:۔

"یہ سب میرے لئے بیکار ہیں۔ میں اس تنگ و تاریک قید خانے کی تنہائی سے بیزار ہوں۔ مجھے جنگل کے کھلے میدان، لہلہاتا ہوا سبزہ، بہتا ہوا صاف و شفاف پانی، طرارے بھرتی ہوئی ہوا، اور سب سے بڑھ کر آزادی چاہیے۔ خدا کے لئے مجھے آزاد کر دیجئے، میں اس قید کو ...."

بادشاہ خود بھی اپنے آپ کو مقید محسوس کرتا تھا اس کا دل بھی آزادی چاہتا تھا مگر وہ بادشاہت کی امانت کو سنبھالے ہوئے تھا، وہ مجبور تھا، ورنہ کبھی کا آزاد ہو جاتا۔ لڑکی کہے جارہی تھی مگر اب اس کا دماغ کسی اور خیال کسی اور فضا میں محو ہو گیا تھا۔ وہ گولکنڈہ میں نہیں تھا اس کو اپنے بچپن کی زندگی یاد آگئی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے چودہ سال اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ اس نے گولکنڈہ میں قدم رکھنے کے بعد آج سب سے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اس عظیم الشان سلطنت، ان پرتکلف محلات، اور اس شاہی طمطراق کے باوجود اس کو وہ آزادی نصیب نہیں ہے جس کے لئے یہ غریب دوشیزہ تڑپ رہی ہے۔ اطاعت گذار خادموں اور جان نثار امیروں کے جھگھٹے میں بھی وہ خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ خیالات کی دنیا میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

بادشاہ کے اس سکوت اور اس کی طبیعت کے اس تکدر کو دیکھ کر شاہی خدام سامنے سے ہٹ گئے اور دہقان زادی اپنی قیام گاہ میں پہنچا دی گئی۔

(۴)

ایک روز سر شام خود تاناشاہ پیامتی کے محل میں داخل ہوا۔ اس پر تکلف ماحول میں غریب کسان کی لڑکی اس کو ایک شاہزادی نظر آرہی تھی۔ اس نے اس سرو صحرا سے کہا:۔

"تم نے میری زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ میں بھی تمہاری طرح جنگل کی ہواؤں کا پروردہ ہوں مجھے بھی یہ عالیشان محلات تنگ و تاریک قید خانے نظر آتے ہیں۔ میں نے تم کو محض اس خیال سے یہاں لانے کا حکم دیا تھا کہ باپ کی وفات سے تم دنیا میں تنہا ہو گئی ہو، ممکن ہے یہاں تمہارا دل بہل جائے، لیکن تم اگر چاہتی ہو تو اب بھی آزاد ہو۔ مگر میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے نکلوگی تو کہاں جاؤ گی اور کس طرح دنیا میں زندگی بسر کرو گی"

لڑکی پر بادشاہ کی اس تلطف آمیز گفتگو کا بڑا اثر ہوا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اس نے سر نیچے کو جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ کہا:۔

اب میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے .... میری ماں بچپن میں مر چکی تھی میرے دونوں بھائی وبا میں چل بسے .... میں خود ہی اب یہ سوچتی ہوں کہ تنہا اپنے کھیت کا کام کس طرح چلاؤں گی؟ نہ معلوم میرے پیارے بیلوں کا کیا حشر ہوا ہے؟"

بادشاہ نے کہا:۔

"تم آزاد ہو۔ سوچ سمجھ کر کوئی تصفیہ کر لو اور جس وقت چاہو مجھے مطلع کر دینا کہ میں تمہیں صحیح و سالم تمہارے کھیت کی دنیا میں پہونچا دوں گا"

(۵)

پیامتی کا محل کئی سال سے ویران پڑا تھا۔ اب جو بادشاہ نے اس میں قدم رکھا پھر سے چہل پہل اور رونق پیدا ہو گئی۔ ملکہ بھی کئی روز سے اس سنسان محل میں بات چیت اور حرکت کی آوازیں سن رہی تھی مگر اس کو حقیقت حال کا علم نہ ہوا تھا۔ بادشاہ کا گذر ہوا تو سارے محل میں یہ خبر مشہور ہو گئی اور ملکہ کو بھی آخر کار چند ہی روز میں اصل واقعہ معلوم ہو گیا۔ وہ غصہ سے بیتاب ہو گئی اور عالم غیظ و غضب میں اپنی خادماؤں کو حکم دیا کہ پیامتی کے محل میں

بادشاہ نے حسین عورت کو لا رکھا ہے اس کو پکڑ لائیں۔ خادمائیں خوف زدہ تھیں۔ ان کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک طرف ملکہ کا بے پناہ غیظ و غضب، دوسری طرف بادشاہ کی خفگی۔ ملکہ آپے سے باہر ہوئی جارہی تھی۔ آخر ایک قدیم ملازمہ نے ہمت کرکے عرض کیا:۔

"میں واری جاؤں، حضور غصہ میں بے حال ہوئی جارہی ہیں۔ دشمنوں کی طبیعت خراب ہوجائے گی۔ یہ لونڈی کس دن کے لئے ہے۔ حکم ہو تو ایسی تدبیر کروں کہ نہ وہ بدبخت باقی رہے اور نہ بادشاہ کا دل اُس کی طرف مائل ہو اگر حضور ذرا صبر و تحمل سے کام لیں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی اور ہر بات ملکہ کی طبیعت کے موافق ہوجائے گی"

دوسری خادماؤں کی بھی ہمت بندھی، اُنھوں نے بھی طرح طرح کی باتیں بنانی شروع کیں۔ خدا خدا کرکے ملکہ کا غصہ تھما۔ اس کے بعد چند ہی روز میں وہ بڑھیا دہقان زادی کو زہر کھلانے کی ترکیبوں میں کامیاب ہوگئی۔

جب بادشاہ کو اس غریب لڑکی کی خراب حالت کا علم ہوا تو اُس نے فوراً اطبائے شاہی کو معالجہ کا حکم دیا اور بڑے بڑے انعام و اکرام کے وعدے کئے۔ وقت زیادہ نہیں گذرا تھا۔ غریب دوشیزہ کی جان بچ گئی۔ مگر وہ کئی دن تک فریش رہی۔ بادشاہ روز اس کی عیادت کو جاتا تھا اور اب اس نے اس کی حفاظت کے لئے اپنے خاص ملازمین متعین کردیے تھے۔

(۶)

کچھ عرصہ کے بعد تانا شاہ قلعہ سلطان نگر کے آثار دیکھنے کے لئے نکلا۔ یہ وہی قلعہ تھا جس کو سلطان محمد قطب شاہ نے موجودہ سرور نگر کے قریب حیدرآباد کی حفاظت کے لئے بنانا شروع کیا تھا، مگر اس کی بے وقت وفات نے اس کو نامکمل حالت میں چھوڑ دیا۔ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا خیال تھا کہ اس قلعہ کو مکمل کردیا جائے تاکہ حیدرآباد کے دونوں طرف دو مضبوط قلعے ہوں تو کوئی دشمن اس شہر میں قدم رکھنے کی جرات نہ کرسکے گا۔

بادشاہ نے ایک رات اور ایک دن سلطان نگر کا محل وقوع اور اس کی نامکمل فصیلوں اور برجوں کے معاینہ میں گذارا۔ وہ چاہتا تھا کہ اور دو روز قیام کرکے اس کی تعمیر کے جملہ مرحلوں کا تصفیہ کردے لیکن دوسری رات اس کو نیند نہ آئی، وہ بے چینی سی محسوس کررہا تھا۔ رات تمام وہ ٹہلتا رہا۔ صبح ہونے سے قبل نہ معلوم

کیا خیال آیا کہ اپنے خدم وحشم کو وہیں چھوڑ چند ملازمان خاص کو ساتھ لے کر گولکنڈہ کا رُخ کیا۔

نصف النہار سے قبل وہ اپنے محل میں پہنچ گیا اور سیدھا پیامتی کے محل کا رُخ کیا۔ وہاں اس کے ملازمین ایک کمرے میں مقید ملے جن سے معلوم ہوا کہ دہقان زادی کو ملکہ پکڑ لے گئی ہے۔ تانا شاہ نے یہ سنتے ہی بالاخانے پر چڑھ کر ملکہ کے محل کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہاں صحن میں ایک درخت کی پیڑ سے دہقان دوشیزہ کو باندھ دیا گیا تھا اور اس کے اطراف لکڑیوں کا انبار تھا جس کو ابھی ابھی آگ لگائی گئی تھی۔ غریب لڑکی چیخ رہی تھی مگر وہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہ تھا بلکہ اُلٹی اس کو گالیاں دی جا رہی تھیں اور بڑھیا کہہ رہی تھی کہ تیری سزا تو اس سے زیادہ سخت ہونی چاہئے تھی۔

بادشاہ نے بالاخانہ ہی سے آواز دی کہ خبردار جو لڑکی کو ضرر پہنچنے پائے۔ بادشاہ کی آواز سنتے ہی سب گھبرا گئے اور بے تحاشہ بھاگ نکلے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ کئی روز کے لئے قلعہ سے باہر گیا ہوا ہے اور وہ اس وقت واپس آئے گا جب لڑکی کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اس اثناء میں بادشاہ کے ملازمین خاص جو اس لڑکی کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور جنھیں بدقت تمام مقید کر کے ملکہ کے ملازمین لڑکی کو کشاں کشاں لے گئے تھے پہنچ گئے۔ انھیں خود تانا شاہ نے آزاد کیا تھا۔ ملکہ کے محل میں پہنچتے ہی انھوں نے دوڑ کر دوشیزہ کی رسیاں کھول دیں۔ لڑکی کے کپڑے جل رہے تھے۔ بدقت تمام آگ بجھائی گئی۔ تانا شاہ نے قریب آ کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ آگ کی دہشت سے حواس باختہ ہو چکی تھی بادشاہ کو دیکھتے ہی اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

(۷)

جب لڑکی کو ہوش آیا تو اس نے معلوم کیا کہ وہ گولکنڈہ کے عالیشان محل کی جگہ ایک کھلی بارہ دری کے میدان میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ حیران تھی۔ جنگل کی آزاد ہوائیں چل رہی تھیں اور دور دور تک سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ اس کو پریشان دیکھ کر ایک خادمہ نے آہستہ سے کہا:۔

"بادشاہ نے تم کو پیامتی سیٹھ کی شاہی بارہ دری میں منتقل کر دیا ہے اور وہ ابھی تمہاری عیادت کے لئے آنے والے ہیں۔"

جب کئی ہفتوں کی نگہداشت کے بعد لڑکی پوری طرح صحت مند ہو گئی تو اس کو غسل صحت کرایا گیا

اور اُس روز بادشاہ بھی اس غریب لڑکی کو صحت یابی کی مبارک باد دینے کے لئے بیامتی بیٹھ پہنچا۔ اثنائے گفتگو میں اُس نے اس سرو صحرا سے کہا :-

"تم آزاد کردی گئی ہو تمہارا کھیت یہاں سے بالکل قریب ہے اور تمہارے بیل بھی محفوظ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم کو ناحق دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اور یہ دونوں ایسی سخت اور مہلک تھیں کہ تمہاری جگہ اگر کوئی محلات کی پروردہ ہوتی تو ختم ہی ہو جاتی۔ تمہاری ہمت اور قوت برداشت قابل تعریف ہے"

دہقان دوشیزہ نے دست بستہ عرض کیا کہ:-

حضور نے دو مرتبہ میری جان بچائی ہے، اور دونوں وقت میری تیمارداری میں جو زحمت اُٹھائی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ میں عمر بھر کے لئے ظل اللہ کی لونڈی بنی رہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ حضور ہی کی خدمت گذاری میں میری بقیہ زندگی صرف ہو جائے۔ بشرطیکہ حضور بھی اس غریب کو اس قابل سمجھیں"

لڑکی کی شریفانہ گفتگو، اس کا میٹھا چہرہ، اُس کی پیاری آنکھیں، اس کا سرو جیسا بلند و بالا قد اور اس کی سادگی و پرکاری، بیامتی بیٹھ کے رومان آفرین ماحول میں حسن و لطافت کا اضافہ کر رہے تھے۔ بادشاہ کے دل میں عشق و محبت کی بجھی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھیں۔ وہ منتظر تھا کہ کوئی اُس کے تشنۂ مضراب ساز کو چھیڑ دے اِس سرو صحرا نے اس کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر دیا۔ اُس کے جذبات پر بجلی گری اُس نے کہا:-

تمہاری پریشانیوں کی وجہ سے مجھے تمہارے ساتھ ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تم نے اپنی ہمت اور کردار سے ثابت کر دیا کہ میرے لئے تم سے بہتر رفیق اور کوئی نہیں مل سکتا۔ میں اب تک دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا سمجھتا رہا ہوں ممکن ہے کہ تمہاری وجہ سے میرا یہ احساس تنہائی دور ہو جائے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میری اور تمہاری زندگی میں کئی باتیں مشترک ہیں تم نے بھی جنگل میں پرورش پائی اور میں نے بھی اپنی عمر کا ابتدائی زمانہ اُسی آزاد ماحول میں گذارا ہے تم بھی یکایک محل کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دی گئیں اور مجھے بھی اسی طرح یکایک یہ بھیس اختیار کرنا پڑا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدائے تعالٰی نے غیب سے تم کو بھیج کر ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ میری یہ مصنوعی زندگی حقیقت اور اصلیت کی جھلکوں سے محروم نہ رہے۔

(۸)

پیامتی پیٹھ کی شاہی بارہ دری کئی سال ویران رہنے کے بعد اس غریب دہقان زادی کی وجہ سے پھر آباد ہوگئی۔ حسن و عشق کی سرگرمیاں ہر خرابہ میں رونق پیدا کر دیتی ہیں۔ بادشاہ ہر جمعرات کو قلعہ سے آیا کرتا اور ایک رات اور ایک دن اس آزاد دنیا میں بے تکلف زندگی گذار کر بعد نماز جمعہ قلعہ کو واپس ہو جاتا جہاں پانچ چھ روز تک اس کو ایک مدبر بادشاہ کا بھیس اختیار کر کے قطب شاہوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے کاروبار انجام دینے پڑتے تھے۔

کئی سال تک غریب دہقان زادی اپنے محسن بادشاہ کے دل کو گرماتی رہی۔ اس کا فکر مند دل اس سروِ صحرا کی سادگی و پرکاری سے غنچہ کی طرح کھل جاتا۔ وہ جب تک اس کے ساتھ رہتا شاہی وقار و تمکنت کو بھولا ہوا رہتا۔ اس کے پیشرو تاجدار گولکنڈہ نے ملک کی سیاست میں جو پیچیدگیاں پیدا کر دی تھیں۔ ان کو سلجھانے میں چھ روز تک اس کے دل و دماغ پر جو گرانی چھائی رہتی وہ سب پیامتی پیٹھ میں داخل ہوتے ہی حرف غلط کی طرح محو ہو جاتی۔ لیکن بادشاہ کی قسمت میں عیش و آرام سے زیادہ رنج و غم کا حصہ تھا۔ قدرت کو منظور نہ تھا کہ اس سروِ صحرائی سے وہ زیادہ دن تک لطف اندوز ہو سکتا۔ زہر اور آگ کے حادثوں کی وجہ سے دہقان زادی کی صحت میں گھن لگ گیا تھا۔ اس کو اندرونی طور پر حرارت آتی رہتی تھی وہ روز بروز نحیف ہوتی گئی۔ آخر کار ایک وقت ایسا آیا کہ بادشاہ نے اس کی صحت کو خطرہ میں محسوس کیا شاہی طبیبوں نے اس کا بہت کچھ علاج کیا۔ لیکن اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ وہ بستر مرگ پر لیٹی ہوئی تھی وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب اپنے محسن بادشاہ سے جدائی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس نے اپنی خادمہ کو اشارہ کیا جس نے بادشاہ کے قدموں کے پاس پانچ کشتیاں لا کر رکھ دیں۔

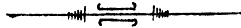
غریب دہقان زادی نے بھرائی ہوئی آواز میں بادشاہ سے عرض کیا:۔

"میں اپنی ہر چیز بادشاہ کے قدموں پر نثار کر چکی ہوں۔ یہ آخری امانت ہے جس کو پیش کر کے میں حضور سے اپنے اس قصور کی معافی چاہتی ہوں کہ اس کو اب تک چھپائے رکھا۔ یہ وہ جواہرات ہیں جو مجھے اس بارہ دری کے ایک مقفل کمرے میں محفوظ ملے تھے۔ یہ نما لباً پیامتی کی دولت ہے جس نے اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ سے چھپا کر ان کو یہاں محفوظ کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ مشہور ہیرے بھی ہیں جن کی وجہ سے مرحوم بادشاہ اور دغا باز میر جملہ کے آپس میں ناچاقی ہوگئی تھی۔"

(۹)

غریب دہقان زادی کی وفات کا تانا شاہ کو بے حد صدمہ ہوا۔ وہ پھر سے خود کو دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ہر جمعرات کی شام کو وہ حسب عادت پیامتی بیٹھ آتا اور اپنی اس رفیق زندگی کی یاد میں ایک رات اور ایک دن بسر کیا کرتا۔ گولکنڈہ کی سلطنت کی طرح اُس سروصحرا کے دیئے ہوئے ہیروں اور جواہرات کو بھی وہ ہمیشہ امانت سمجھتا رہا اور ان دونوں کو آخر وقت تک سنبھالے رکھا۔ اُس کی دیانت کا تقاضہ تھا کہ اُن کی حفاظت کے لئے مغلوں سے مردانہ وار مقابلہ کرتا۔ ورنہ وہ پہلے ہی روز اورنگ زیب سے صلح کرکے قطب شاہی سلطنت اور گولکنڈہ کے ہیرے اُس کے حوالہ کر دیتا۔ تانا شاہ کی نظر میں اِن دونوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔

سیّد محی الدین قادری زور



نعرۂ شباب

قرار بے قراریوں کا نام ہے شباب میں — سکونِ زیست پا رہا ہوں، عہدِ اضطراب میں
عمل کے جام میں شرابِ علم پی رہا ہوں میں — کہ زندگی کو زندگی بنا کے جی رہا ہوں میں
نظر کی جستجو ہوں میں دلوں کی آرزو ہوں میں — نویدِ زیست جس میں ہے وہ خواہشِ نمو ہوں میں
حیات کی بہار ہوں، شباب کی اُمنگ ہوں — میں غفلتوں کی فوج کے لئے پیامِ جنگ ہوں
وجودِ چرخ جس پہ منحصر ہے وہ زمین ہوں میں — مکان جس پہ ناز کر رہا ہو وہ مکین ہوں میں
مرا شباب، زندگی ہے کائنات کے لئے — عمل کا گیت ہوں میں مطربِ حیات کے لئے
مری حریمِ آرزو میں یاس کا گذر نہیں — بہارِ بے خزاں ہوں میں خزاں کا مجھ کو ڈر نہیں
میں یادگارِ بود ہوں میں کائناتِ ہست ہوں — شراب پی نہیں کبھی کہ بے پیے ہی مست ہوں
رکاوٹیں ہیں ہر قدم پہ پھر بھی چل رہا ہوں میں — کہ ظلمتوں میں شمعِ نور بن کے جل رہا ہوں میں

دکن پہ مجھ کو ناز ہے، دکن کے کام آؤں گا
کہ میں وطن پرست ہوں وطن کے کام آؤں گا

میکش

ہنسی

حیوانات کی زندگی کا انحصار صرف جبلی افعال ہی پر ہے۔ کسی حیوانی فرد کو ہم ان جبلی افعال سے آگے بڑھتے نہیں دیکھ سکتے۔ اور نہ وہ بڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں عقل نہیں پائی جاتی۔ حیوانات کی کسی نوع کو لیجئے تو آپ اس نوع کے افراد میں ہرگز اختلاف طبع محسوس نہیں کر سکتے۔ حیوانات میں سب سے زیادہ زیرک بندر خیال کیا جاتا ہے اور جو مسئلہ ارتقا کی رو سے انسان کا باپ ہے، اس کے نوع کے افراد میں بھی اختلاف طبع معلوم نہیں کیا جا سکتا اور سب بندروں کے طبائع یکساں پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف آپ انسانوں کی طبیعتوں کو دیکھیں تو یہ طبائع ایک دوسرے سے باوجود مشترک ہونے کے مختلف ہیں۔ جب ہم وید اور حکیم کے پاس جاتے ہیں تو وہ انسانی مزاج کی چار اقسام بتاتے ہیں۔ دموی، سوداوی، بلغمی اور صفراوی۔ اور اس لحاظ سے انسانی ذہانت و خوبی کا پتہ لگاتے ہیں اور ڈاکٹر سے دریافت کریں تو بے انتہا اقسام طبائع کا علم ہوتا ہے۔ اور ہر ایک انسان دوسرے سے مختلف نظر آنے لگتا ہے عضویاتی ماہر اس اختلاف طبع کو غدودوں کی حالت پر موقوف سمجھتا ہے۔ غرضکہ طبیعتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے خواہ اس اختلاف کی وجہ کچھ بھی ہو۔

اگر ہم ان مزاجوں کے کیفی پہلوؤں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک قسم ان مزاجوں کی ہے

جو ہمیشہ خوش رہا کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو غم آگین اثرات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اس تقسیم ابتدائی کے بعد ہو سکتا ہے کہ مزید اصطفاف کیا جا سکے۔ اس تفریق اولی کے لحاظ سے ہنسی ہی بنا تقسیم ٹھیری۔ کیونکہ اس کے ذریعہ ہی ان دو قسموں میں تمیز ہو سکتی ہے۔

ہنسی ہم کو بالعموم اس وقت آتی ہے جبکہ ہم بہت خوش ہوں یا جب ہمیں کوئی بات بھلی معلوم ہو۔ جب ہم کو خوشی ہوتی ہے تو ہمارا چہرہ بشاش ہو جاتا ہے اور بالآخر ہم ہنس دیتے ہیں۔ اگرچہ کہ ہم شروع ہی سے خوش ہوتے رہتے ہیں (Bussell) کا خیال درست ہے کہ "ہنسی ایک فعل کے اچھے تاثرات کا احساس ہے اور جس کا اظہار ایک خاص جگہ پر ہوتا ہے"۔ بعض مرتبہ ہم اپنے کسی دوست کا مذاق اڑاتے ہیں جبکہ اس میں کوئی بات انوکھی مل جائے۔ اس انوکھے پن یا ندرت کے باعث ہم میں ایک خوشی پیدا ہوتی ہے اور اس خوشی کا اظہار ہمارے قہقہہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

تعجب بھی ہماری ہنسی کا ایک ہیج بن سکتا ہے۔ جب ہم کو تعجب ہوتا ہے۔ تو ہنس پڑتے ہیں۔ اگر کوئی شخص غلط لفظ استعمال کرے تو ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔

خوشی اور تعجب میں تو ہم اکثر انسانوں کو ہنستے دیکھتے ہیں۔ مگر بعض اوقات انتہائی غم میں بھی ہنسی آجاتی ہے۔ ایک شخص جس کو اپنی بیوی سے بہت محبت ہے اگر وہ بیوی مرجائے تو وہ شخص دفورِ غم میں قہقہہ مار دیتا ہے اور اگر ہنسی، خوشی اور تعجب ہی کا مظہر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسے اندوہگیں موقع پر ہنس پڑے۔ بادی النظر سے اس واقع کی توجیح نہیں معلوم کی جا سکتی جب تک کہ ہم ہنسی کی ماہیت کی طرف رجوع نہ ہوں۔ نفسیات اس کی یوں توجیح کرتی ہے کہ ہنسی ایک "جذبی ردعمل" ہے اور جہاں کہیں ایک خاص جذبہ پیدا ہوگا۔ وہاں پر ایک خاص جذبی ردعمل کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ہیجات کا جب تک انسان جواب دے سکے زندہ رہ سکتا ہے۔ جیمس نے جذبہ کو یوں بیان کیا ہے کہ "جذبہ دراصل دو مخالف ہیجانات کا آپس میں تنازع ہے" اور جب تک تنازع باقی ہے۔ انسان پر جذبی کیفیت طاری رہتی ہے اور بالآخر جب کوئی جذبی ردعمل ہو جاتا ہے تو جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ کسی فلم کو دیکھتے ہوئے جب کوئی مزاحیہ حصہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم ہمہ تن گوش بن کر دیکھتے ہیں۔ اور اس لطف و محویت کے باعث ہمارے عضلات میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور جب وہ مذاق

ختم ہونے کو ہوتا ہے یا اپنے بہترین حصے کے ختم پر آجاتا ہے تو ہم ہنس دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں اس وقت خوشی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جب ہم ہنس دیتے ہیں تو اس جذبی ردعمل کے ذریعہ ہمارا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہم اس شخص کے فوراً غم میں ہنس پڑنے کی توجیح کرسکتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جس طرح خوشی ایک جذبہ ہے اسی طرح غم بھی ایک جذبہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ہنسی کے جذبی ردعمل سے ظاہر کیا جائے۔

معاشرتی لحاظ سے بھی ہنسی ایک جزو زندگی معلوم ہوتی ہے۔ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ انسانی زندگی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انسانی میل کا بڑا سبب ہمیں اس کی خوش مزاجی معلوم ہوتی ہے اگر انسان میں قنوطیت ہی کا فلسفہ رائج ہو جاتا تو نہ اس قدر معاشرت کی ترقی ہوتی نہ اتنا زبردست تمدن پیدا ہوتا۔ یہ محض خوشی اور خوش مزاجی ہی ہے جس کے بدولت انسان نے اس قدر ترقی کر لی ہے۔

معاشرت اس بات کی روادار نہیں ہوتی کہ ایک شخص جا و بیجا ہنسے۔ اس شخص کو یا تو بیوقوف خیال کیا جاتا ہے یا پست معاشرہ کا رہنے والا۔ ایک شخص جو آپ کے ہمراہی میں سفر کر رہا ہو اور آپ اس کے ظاہری لباس کو دیکھ کر اس سے ہمکلام ہوں تو وہ شخص آپ کی باتوں پر ہنس دیتا ہے۔ خواہ آپ شاہ جارج پنجم کے انتقال ہی کا کیوں نہ تذکرہ کر رہے ہوں۔ آپ متعجب ہوتے ہیں اور آپ اس کو بیوقوف خیال کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دیہات کا مقدم ہے۔ جو ان باتوں سے ناواقف ہے تو آپ ان تذکروں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی ہنسی درحقیقت ایک خوشامدانہ ہنسی ہوتی ہے۔ اسی طرح جیسا کہ گوئٹے کا خیال ہے کہ آدمی کے اخلاق کا واضح طور پر اظہار اگر ہوسکتا ہے تو صرف اس کی ہنسی سے۔ وہ اس طرح کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ کس بات پر ہنس دیتا ہے۔ ایک شخص غلیظ بات سن کر ہنس دے تو یقیناً وہ برے اخلاق کا آدمی ہوگا۔ اور کوئی لطیف اور عمدہ بات پر تبسم ہو تو اس کے اچھے اخلاق کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اسی طرح بے موقع ہنسنے سے بھی انسانی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شعراء جن کو بلند پایہ انسان کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ تبسم کو معروض بناتے ہیں۔ شاید ہی کوئی غزل ہوگی جس میں کسی نہ کسی پیرایہ میں معشوق کی ہنسی کو منظوم نہ کیا گیا ہو۔ کسی شاعر کو تو ہم نے معشوق کی ہنسی کو پھول کے کھلنے سے تشبیہ دیتے دیکھا، تو کسی کو التفات کے مترادف کہتے سنا۔ کوئی اس ہنسی میں معشوق کی معصومیت کا اظہار کرتا ہے اور بعض ہیں کہ اسے برق خیال کرتے ہیں جو ان کے دل کے آشیانہ پر گرتی ہے۔ لیکن جن کا معشوق شاہد بازاری ہو وہ ہنسی کو گنجینہ معنی خیال

کرتے ہیں۔ انڈر وڈ جانسن نے یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ ,,خوشبو گلاب ہے اور عورت تبسم سراسر،، غرضیکہ جتنے شعرا اتنے خیالات۔ یہ نازک بیانیاں جمالی خیالات کی آفریدہ ہیں۔ جمالیات میں ہنسی کو جو اہمیت ہے وہ بیان کرنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہر حساس دل تقریباً ان لطافتوں سے بخوبی واقف ہے۔

قنوطیت پسندوں کے نزدیک ہنسی غم کا سبب بتلائی جاتی ہے کیونکہ یہ بالعموم خوشی کا مظہر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ,,ہماری ہر خالص خوشی میں غم کی بھی آمیزش ہوتی ہے،، اور ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ایک شخص جتنا خوش ہوگا وہ اتنا ہی غم بھی دیکھے گا۔ اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ,,ہنسی میں بھی دل غمگین رہتا ہے۔ اور اس خوشی کا اختتام رنج پر ہوتا ہے،، رولینڈ ایمل بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے زیادہ ہنسنا بھی برا خیال کیا جاتا ہے۔

ہنسی جس قدر اچھا فعل ہے اسی قدر برا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ کوئی شخص جو ایک عمدہ نداق کر رہا ہو اور آپ ہنس دیں تو آپ کے اس فعل کو وہ بنظر استحسان دیکھے گا۔ لیکن کوئی شخص غصہ کی حالت میں ہو۔ اور آپ قہقہہ ماریں تو وہ بلاپس وپیش لڑنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ یا اگر اس کے کردار عمدہ ہیں تو وہ موقع سے ضرور بدلہ لیگا۔ جو ایک ناگوار فعل ہے۔ لہذا انسان کی شرافت و بزرگی اسی میں ہے کہ اس کا وہ باموقع استعمال کرے، اور عمدہ سے عمدہ اور بہتر سے بہتر نتیجہ پیدا کرے۔

محمد عبد الحمید عثمانی متعلم بی۔ اے

غزل

مجبورِ اختیار بھی۔ مختار بھی نہیں
ناچار اس طرح ہیں کہ ناچار بھی نہیں

تم سن کے کیا کروگے بس اب تم ہی کیا کہیں
وہ دردِ دل جو قابلِ اظہار بھی نہیں

سر پھوڑ لیں یہ اہلِ جنوں کے کہاں نصیب
سر زیرِ بارِ سایۂ دیوار بھی نہیں

آیا ہوں لے کے مرگِ محبت کی آرزو
اور آپ کی خوشی ہو تو دشوار بھی نہیں

میں کیا زباں سے تیری جفا کا گلہ کروں
کیسا گلہ کہ طاقتِ گفتار بھی نہیں

یوں دیکھتے ہیں دل کی طرف بزمِ ناز میں
ہے دل سے اور دل سے سروکار بھی نہیں

قسمت بُری ہی آپ کا شکوہ بھی کیا کریں
قابو میں کچھ دنوں سے دلِ زار بھی نہیں

کانٹے رہِ خرد میں جنوں سے سوا ہی
لذت بقدرِ یک خلشِ خار بھی نہیں

جو اپنی زندگی نہ ہو اخترؔ وہ موت کیا
وہ زندگی ہی کیا ہی جو دشوار بھی نہیں

محمد عبدالسلام اختر متعلم بی۔اے

ایک دوست

ڈائری لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ میرا ایک دلچسپ دوست آگیا۔ اس کے کردار میں کچھ اتنی گہرائی ہے کہ باوجود کوشش کے میں اس کی شخصیت کو حل نہ کر سکا۔ بعض لوگ اس کے کردار کو کمزوریوں کا مجموعہ بتاتے ہیں۔ مگر میں ان کمزوریوں کے پیچھے ایک ایسے دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہوں جس کی تخلیق میں قدرت نے ساری لچک ختم کردی ہو۔ ہاں تو وہ آیا اور دھڑام سے پلنگ پر گر پڑا۔ گرتے گرتے ٹوپی نکال کر میری طرف پھینکی اور جوتے سمیت بستر پر دراز ہوگیا۔ میں نے مسکراہٹ کے پردوں میں اس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کی تو وہ خود ہی ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح جو منزل پر پہنچ کر دم لینے کے بعد اپنے حالات سفر بیان کرتا ہو۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر کہنے لگا۔

"آج تو مر گیا اختر، شہر سے پیدل چلا آرہا ہوں"

کیا کہا، پیدل آرہے ہو، میں نے اس کی حالت پر ترس کھا کر کہا، خدانخواستہ، ایسی کیا افتاد پڑی جو تمھیں پیدل چلنا پڑا،

افتاد، نہیں یہ زندگی کے تجربات ہیں دوست!، اس نے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا،

ان تجربوں ہی میں تمھاری زندگی ختم ہوجائے گی، ہر قدم پر ٹھوکریں ہی کھاتے جاؤگے تو پھر چلوگے کس طرح،

خیر آپ بکواس مت کیجئے۔ ذرا سنئے تو آج میں نے زندگی کے کتنے عجیب لمحات گذارے ہیں۔"
میں نے کہا، "تو پھر کہئے۔"
"کالج سے نکل کر ہوسٹل کی طرف آ رہا تھا،" اس نے کہنا شروع کیا،
"دور سے میں نے دیکھا کہ میرا ایک دوست ہاتھ ہلا رہا ہے، میں نے جواب میں ہاتھ ہلا دیا، ایک پروفیسر کی موٹر وہاں سے گذر رہی تھی، وہ سمجھے کہ میں شہر چلنے اور موٹر رکنے کی درخواست کر رہا ہوں، موٹر میرے پاس آکر رکی، دروازہ کھلا اور کچھ سوچے بغیر میں اس میں جا بیٹھا۔ موٹر چل دی۔ راستہ میں انھوں نے پوچھا، کہاں اترو گے
میں نے کہا، عابد روڈ پر،
عابد روڈ پر موٹر رکی، میں نے شکریہ ادا کیا اور اتر پڑا۔ اب عابد روڈ کے چکر لگانے شروع کئے، اس لئے کہ جیب میں ایک پائی نہیں تھی، چائے نہیں پی تھی، جمائی پر جمائی آ رہی تھی، اور تو اور ایک سگریٹ جو بچا تھا اسے بھی ختم کر چکا تھا۔ اپنی حماقت اور پروفیسر صاحب کی ہمدردی پر غصہ آ رہا تھا کہ اتنے میں ایک دوست سیکل پر جاتا دکھائی دیا، جوں ہی اس نے میری طرف دیکھا میں نے بھی مسکراہٹ کے پردوں میں اپنی پریشان حالی کو چھپا کر اس کو سلام کیا۔ مگر دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس جانے والے کو روک کر خوب باتیں کرو اور باتیں کرتے کرتے اس کا رخ نظامیہ کی طرف پھیر دوں، مگر وہ ظالم تو چلا گیا۔
کہاں کھڑے ہو بھئی۔ پیچھے سے آواز آئی۔ مڑتے مڑتے میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ دیکھا تو ایک اجنبی مجھ سے معافی چاہتے ہوئے کہہ رہا تھا: "معاف کیجئے، مجھے اپنے ایک دوست کا دھوکا ہو گیا،" یہ کہہ کر وہ ہوٹل کی طرف مڑا۔ میرا جی کہہ رہا تھا کہ کہہ دوں، "میں بھی آپ کا دوست ہو سکتا ہوں جناب۔"
مگر وہ تو جا چکا تھا،
چائے نہ سہی سگریٹ ہی ہوتا تو جی بہلا لیتا، اتنے میں موٹر سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا، "ارے معاف کرنا،" میرا ایک دوست کہہ رہا تھا، دوست کیا کہوں وہ میرا ہم جماعت تھا، مگر اب کالج چھوڑ چکا تھا۔ اس نے اتر کر ہاتھ ملایا اور کہا۔ "بہت دنوں کے بعد ملے ہو، ذرا تفصیلی گفتگو ہو گی، میں ابھی آیا تم ذرا موٹر میں ٹھہرو،" یہ کہہ کر وہ تو میر حسن کی دوکان میں چلا گیا، اور میں موٹر کے گدے پر اس طرح جا بیٹھا جیسے کانٹوں پر بیٹھا ہوں۔ اتنے میں دو تین دوست پان

چپاتے اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے جاتے دکھائی دیئے، مگر میں نے بڑی رعونت سے ان کا سلام لیا، گویا وہ موٹر میری ہی تھی اور میں ان کی خوش حالی کو ہیچ سمجھتا ہوں اتنے میں ایک تھرتھراتا ہاتھ میرے سامنے آیا۔ ایک بڑھیا کہہ رہی تھی۔ میاں بھوکی ہوں کچھ دیجئے،

بڑھیا کے سفید بال، جھکی ہوئی کمر، جھریوں دار چہرہ، تھرتھراتا جسم، یہ سب کچھ ایسا تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر مجھ میں اور اُس میں کچھ تھوڑا سا ہی فرق تھا۔

پھر بڑھیا نے صدا دی ،،میاں کچھ پیسے دیجئے،،

پیسے ہوتے تو سگریٹ نہ خریدتا، چائے نہ پیتا، مگر اس غریب بڑھیا کو دیکھ کر میرے عادتوں کے دیو کو ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے اُس سے کہا،

بڑی بی، ذرا ٹھہرو ابھی دیتا ہوں، اتنے میں میرا دوست آگیا،

ارے بھئی، کچھ کھلے پیسے ہوں تو دو، اس بڑھیا کو دینا ہیں، میرے پاس نوٹ ہے، میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے تین پیسے میرے ہاتھ میں دیئے۔ بڑھیا کے ہاتھ تک میرا ہاتھ پہنچا ہی تھا کہ مجھے ایکدم خیال آیا کہ ان تین پیسوں میں سے کیوں نہ کچھ اپنے لئے رکھ لو۔ اس خیال کے ساتھ ہی بڑھیا کے ہاتھ میں صرف دو پیسے گرے اور ایک پیسہ میں نے اپنے ہاتھ میں چھپا لیا—— سگریٹ خریدنے کے لئے۔

کچھ کام تو نہیں ہے آپ کو، میرے دوست نے پوچھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ چلئے ذرا چارمینار تک ہو آئیں، اس نے موٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

راستہ بھر میں نے گفتگو میں ہر طرح اپنی امارت کے خود ساختہ وقار کو قایم رکھنے کی کوشش کی حالانکہ میری جیب میں صرف ایک پیسہ تھا جس سے میں بار بار کھیلتا جا رہا تھا اور میرے دوست کی جیب نوٹوں سے بھرے تھے جن کو وہ معمولی کاغذ کے پرزے سمجھ کر اڑا رہا تھا۔

وہاں وہ ایک گھنٹہ تک اپنی قوت خرید کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس ایک گھنٹہ میں مجھ غریب کی دنیا کتنی مرتبہ بس کر اجڑ چکی تھی۔ ہم پھر عابد روڈ کی طرف چلے۔ اپنی امارت کی شگفتگی قایم رکھنے کے لئے میں اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتا جا رہا تھا کہ اتنے میں موٹر نظامیہ کے سامنے رک گئی۔ میرا دل

دھڑکنے لگا۔ مجھے اس وقت کچھ تکلف سے کام لینا چاہئے تھا۔ مگر میں بھول گیا اور جھٹ موٹر سے اتر پڑا۔ وہ آگے تھا اور میں پیچھے۔ وہ سیدھا منیجر کے پاس پہنچا۔ گفتگو ہونے لگی۔ کل اس نے چائے پر اپنے دوستوں کو مدعو کیا تھا، اور اس عصرانہ کا انتظام وہ نظامیہ کے سپرد کر رہا تھا۔ اس کا کام ختم ہوگیا تو اس نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور میری یہ حالت تھی کہ زمین پیروں تلے سے نکلی جا رہی تھی۔ موٹر تک پہنچ کر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، معاف کرنا بڑا وقت خراب ہوا آپ کا، اور جیب میں ہاتھ ڈال کچھ نکالنے لگا ——— میں انکار کرنے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ دعوت کا رقعہ ہے "کل ضرور آنا" اس نے جاتے ہوئے کہا اور میں پھر اکیلا ہی رہ گیا۔

شام ہوگئی تھی، چائے کا وقت بھی ٹل گیا تھا ——— ایک صورت بھی ایسی نظر نہیں آئی کہ میں اپنی خود ساختہ امارت کا بھانڈا پھوڑ سکتا۔ غریب بڑھیا سے مارا ہوا ایک پیسہ جیب میں پڑا تھا، اسی کے سگریٹ خرید لئے اور گنگناتا پیدل یہاں تک آیا ہوں" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے اٹھتے کہنے لگا ؏

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

پھر مجھے نظامیہ چلنے کی دعوت دی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی گذشتہ بیچارگی کا خوب بدلہ نکالا۔ اور آخر میں اپنے کھاتے میں سب کچھ لکھ کر سگریٹ کے کش لگاتا ہوا وہ اٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ساری داستان بھول چکا ہے۔ اب وہ گا رہا تھا،

کاش یہی جبین ناز سجدوں سے سرفراز ہو

سید اشفاق حسین

محبّت کی کرشمہ سازیاں

(۱)

محمور چاند تارے

انوارِ حُسن کے جب دریا بہا رہے ہوں بادل کی چادروں پر موتی بکھار رہے ہوں

آہ شکستہ پا سے

بیتاب دل کے ذرّے کہتے ہیں چپکے چپکے

اے حاصلِ محبّت

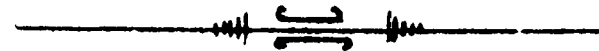
پیدا مری رگوں میں طوفاں ہزار کرنا رازِ وفا خدارا امت آشکار کرنا

(۲)

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے

صحرا کی نکہتوں میں کرتے ہیں گدگدی جب　　آتی ہے طائروں کو بیساختہ ہنسی جب
روحِ فسردگی سے
کہتے ہیں زخمِ پنہاں　　تو بھی ذرا ہو خنداں
ہلکا سا اک تبسم
پردوں میں چشمِ نم کے کرتی ہیں یوں ادائیں　　جیسے برستے بادل میں چاند کی شعاعیں

عبد الصمد ساز بی۔ اے ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ)



نقد و تبصرہ

سیر گولکنڈہ .. .. اشفاق حسین
مجلہ طیلسانیین .. .. ” ” ” ”
موجِ خیال .. .. ” ” ” ”
مبادی سیاسیات .. .. شہاب الدین

سیر گولکنڈہ

نوجوان ادیبوں میں سب سے زیادہ فائدہ اُردو ادب کو اگر کسی کی ذات سے پہنچا ہے تو وہ ڈاکٹر زور ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے لے کر ابھی تک، باوجود یار و اغیار کی بیجا مخالفتوں کے اُنھوں نے جس خلوص اور محنت سے اُردو کی خدمت کی ہے وہ ان کی مستقل مزاجی اور عزم مستحکم پر گواہ ہے۔ روح تنقید اور تنقیدی مقالات، فن تنقید پر اردو میں سب سے زیادہ مستند کتابیں ہیں۔ فن لسانیات کو تو اُردو میں کوئی جانتا ہی نہ تھا، ہندوستانی لسانیات اس فن کی پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی۔ اُردو کے اسالیب بیان اور فن انشا پردازی بھی اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر زور کا قلم دکھنی ادب کے شہ پاروں کو ادبی دنیا کے آگے پیش کرنے کے لئے وقف ہو گیا۔ ان "پاروں" کے مطالعہ نے ان کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیا جس میں حیدرآباد کا تابناک ماضی زمانہ کی دستبرد سے گولکنڈہ کے کھنڈروں میں دبا پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ان کھنڈروں کی سیر کی تو ان کی حب وطنی نے ہر قدم پر اپنے ملک کی گذشتہ عظمت کی داستانیں کو پڑا پایا۔ انھوں نے ان داستانوں کے بوسیدہ اوراق کو اپنے خلوص کا رنگ دے کر "سیر گولکنڈہ" میں زندہ کر دیا۔

پیوستہ سال انجمن طیلسانئین کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں ہمارے نوجوان ادیبوں اور انشا پردازوں کو متوجہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے ملک کی گذشتہ عظمت کی یادگاروں پر بھی قلم اٹھائیں۔ مگر ان نوجوانوں کی "وسیع النظری" نے اس محدود موضوع کو اپنے زور قلم کے قابل نہ سمجھا۔ اور یہ شرف ڈاکٹر صاحب ہی کے حصہ میں آیا کہ وہ گذشتہ نسلوں کی علو ہمتی، تدبر، محنت اور جانکاہی کی داستانیں سنا کر موجودہ نسلوں کو سبق دیں اور حب وطن کی ایک ایسی راہ دکھائیں جس پر چل کر ہی ہم منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

"سیر گولکنڈہ" میں کل سولہ افسانے ہیں۔ کتاب اقبال کی نظم گولکنڈہ سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد دس صفحوں کا ایک دیباچہ ہے جس میں قطب شاہیوں کی مجمل تاریخ درج ہے۔ سب سے پہلا افسانہ چچلم کی رقاصہ ہے۔ یہ قصہ قطب شاہیوں کے تیسرے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ہے۔ اس میں ابراہیم کے بیٹے شہزادہ محمد قلی اور چچلم کی رقاصہ بھاگ متی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اسی شہزادہ کی وارفتگی محبت نے حیدرآباد بسایا اور چارمینار اسی حسن و عشق کے داستان کی یادگار ہے۔ اس کے بعد کے تین افسانے محمد قطب شاہ کے عہد سے متعلق ہیں۔ اس میں قطب شاہیوں کی بلند ہمتی، قطب

قطب شاہی امرا اور اعیان دولت کی وفاداری اور جاں نثاری اور پھر شعر پرستی اور شاعر دوستی، سبھی کا ذکر آگیا ہے محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ سلطنت گولکنڈہ کے لئے بڑا سخت تھا۔ میر جملہ جیسا کوزنگ اور محسن کش شخص سلطنت پر چھایا ہوا تھا۔ کوہ نور بھی اسی دور میں اسی کے ہاتھوں قطب شاہی ملکیت سے مغلوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں شعر و شاعری کو سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ اسی دور سے متعلق اس کتاب میں چار افسانے ہیں۔ اور باقی سارے افسانے گولکنڈہ کے آخری تاجدار تانا شاہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ہی افسانوں میں ڈاکٹر زورؔ کے قلم نے بڑی فن کارانہ جنبشیں دکھائی ہیں۔ اس میں تانا شاہ کی قلندر صفتی اور اولعزمی، عفو اور درگذر اور پھر مغلوں کے حملہ کا ذکر ہے۔ عبدالرزاق لاری کی داستان شجاعت اور حبشی غلاموں کی جاں نثاری اور پھر اہل قلعہ کی چیخ و پکار میں تانا شاہ کا گولکنڈہ پر ایک آخری نظر ڈالتے ہوئے مغلوں کی قید میں چلا جانا یہ سب کچھ ایسا متاثر کن ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب قطب شاہیوں کی تہذیب و معاشرت اور گولکنڈہ کے گذشتہ عظمت کی ایسی سچی تصویر ہے کہ ہر وہ شخص جسے اپنے ملک کے ماضی سے محبت ہے اور جو اس کے حال کو سنوارنا چاہتا ہے، اسے سینہ سے لگائے رکھے گا۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ قیمت ۱۵ر

مجلہ طیلسانئین :- ناشر، مجلہ علمیہ طیلسانئین - بازار گھانسی، حیدرآباد۔

یہ مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے۔ اور اس کی عنان ادارت عثمانیہ کے مشہور طیلسانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب تک اس کے چار شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں طیلسانئین عثمانیہ کے تحقیقی مقالہ شائع ہوتے ہیں اور پھر انھیں علیحدہ کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا جاتا ہے۔ اب تک دو مقالے، اردو ادب بیسویں صدی میں، اور عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست، علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اکثر رسالوں نے مجلہ طیلسانئین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی زبان بڑی "سائنٹیفک" ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض کی نہیں بلکہ تعریف کی بات ہے۔ ہر زبان کی گراں مایگی اس کے افسانوں اور شعر و شاعری کی داستانوں پر نہیں بلکہ اس کے علمی اور حکمی ذخائر پر منحصر ہے۔ آج سے دس سال پہلے اردو میں کتنی کتابیں ایسی تھیں جن کے سہارے ہم اپنی زبان کی کم مائگی کے داغ کو چھپا سکتے تھے۔ افسانوں اور خیالی من گھڑت قصوں کی زبان تو ہمارے یہاں ابتدا ہی سے پرورش پاتی رہی ہے مگر حالی اور شبلی کی موت

کے بعد سنجیدہ اور علمی طرز تحریر کا بہاؤ ایک دم رک گیا تھا. سوائے ان دوچار بزرگوں کے جو حالی اور شبلی کے مقلدین میں سے تھے، نئی پود کا ہر انشا پرداز، افسانوی زبان کو رواج دینے پر قلم سنبھالتا نظر آرہا تھا. مقدمہ شعر و شاعری یا شعر العجم کی طرز کی کتابوں کی بجائے، شہاب کی سرگذشت، اور خیالستان جیسی کتابیں چھپ کر مقبول ہو رہی تھیں۔ یہ رجحان عام تھا ہر وہ لکھنے والا جو اپنی عبارت میں ذرا بھی رنگینی پیدا کر سکتا تھا ایک افسانہ کی کتاب ضرور چھاپ دیتا. نیاز کے اسلوب کی تقلید میں نوجوان گمراہ ہوتے جا رہے تھے. اس وقت طیلسانیین عثمانیہ کی ایک مستعد جماعت ایسی اٹھ کھڑی ہوئی، جس نے دار الترجمہ کے مقلوب سکوں کے چلن کو عام کر دیا۔ زبان علمی اور حکمی ہوتی گئی۔ نئے نئے موضوعوں پر کتابیں لکھی گئیں۔ ملک نے بھی ہمارے طیلسانیین کے کام کو استحسان کی نظروں سے دیکھا، دوسری جامعات نے ان کی کتابوں کو اپنے یہاں کورس میں رکھ کر ان کی خدمات کا اچھا صلہ دیا. مجلہ طیلسانیین کا بھی یہی مطمح نظر ہے کہ زبان کے علمی اور حکمی ذخائر میں اضافہ کیا جائے. اسی مقصد کو لیکر وہ نکلا ہے اور امید ہے کہ وہ آخیر تک اس طرز کو نباہتا رہے گا.

ایک چیز جو مجلہ طیلسانیین میں کھٹکتی ہے وہ اس کی تنقیدیں ہیں۔ تنقیدوں کا معیار اور کچھ بلند ہونا چاہئے. سوائے ایک پروفیسر سروری کی تنقید کے، ابھی تک کوئی تنقید معیاری اس میں نہیں چھپی. کتابت و طباعت پر بھی زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

موجِ خیال ۔ مصنفہ امجد صاحب (عثمانیہ)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں جناب مصنف نے اردو شاعری کے تمام موضوعات کو شاعرانہ انداز میں سپرد قلم کیا ہے خیالات کے ساتھ زبان بھی رنگین ہے، اور ہر موضوع پر جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں اپنے ہی جذبات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، عورت، فرقت کی رات اور صبح وصل کے ساتھ رود موسیٰ اور ہمالیہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے مگر انداز وہی شاعرانہ ہے. رود موسیٰ میں مصنف نے اپنی حب الوطنی کو آشکار کیا ہے۔

امجد صاحب نے لکھا ہے کہ ۳۲ صفحہ کی یہ کتاب انھوں نے ایک رات میں لکھی ہے. اس ایک رات کی محنت کے نتیجہ کو دیکھتے ہوئے ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر امجد صاحب اپنی کچھ اور راتیں بھی نذر کریں تو اردو ادب ان کے خیالات و احساسات سے زیادہ اچھی طرح مستفید ہو سکے گا۔

کتاب کو مادر جامعہ کے نام سے معنون کیا ہے. ملنے کا پتہ اور قیمت درج نہیں ہے ۔

مبادیٔ سیاسیات

جلد اوّل (مملکت)

مولفہ ہارون خاں صاحب شیروانی ایم۔ اے (آکسن) صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن
ضخامت ۱۹۶۔ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت مناسب۔ قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ غلام دستگیر بک ڈپو۔ جامعہ عثمانیہ

زیر نظر کتاب میں بقول مولف "زیادہ تر سیاسیات کے موضوع مملکت کی کیفیات بیان کی گئی ہیں"۔ نظریہ مملکت باوجود ایک مجرد و تخیل ہونے کے علم سیاسیات کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ مملکت افراد معاشرہ کی سیاسی کیفیت کا علمی اور حکمیاتی نام ہے۔ اور سیاسیات میں جس مخصوص عمرانی ادارہ سے بحث کی جاتی ہے وہ مملکت ہی ہے۔ شاید معاشرہ انسانی کا یہی وہ ادارہ ہے جسے سب سے بڑے، با اثر، مستقل اور منظم ادارے کا لقب دیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی وقت سے قائم ہے جس وقت سے "تاریخ کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور نظریہ سیاسی اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ خود مملکت۔ واضح رہے کہ مملکت کی تعریف ہر سیاسی مفکر نے جدا جدا طریقوں سے کی ہے۔ بقول شیروانی صاحب "بعض کا خیال ہے کہ جب تک کوئی مجموعۂ افراد تمدن کی ایک مخصوص حد تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک اُس کے افعال دائرہ سیاسیات میں نہیں آسکتے اور اُن سے کوئی سیاسی استدلال نہیں کیا جا سکتا"۔ اس میں شک کہ معاشرۂ انسانی کی حالت ایک عضویہ کی ہے جو محرکات زمانہ سے نمو پاتا اور نشو و نما حاصل کرتا جاتا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ کسی مجموعۂ افراد کا سیاسی ارتقاء معاشری ارتقا کے ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے" تاہم علم سیاسیات کے بنیادی اصولوں کو مفید بنانے اور ہیئتہائے سیاسی کی مختلف کیفیتوں کو سمجھنے کے لئے یہ تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ ہر مجموعۂ افراد اور ہر گروہ انسانی میں سیاسی حس موجود ہے شاید اسی لئے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ملت انسانی سیاسی اعتبار سے منظم ہے خواہ اس پر تہذیب و تمدن کے اثرات کتنے ہی کم کیوں نہ پڑے ہوں۔ موجودہ دور میں معاشرہ کی سیاسی تنظیم کی پابندی کرنے پر ہر شخص مجبور ہے، خواہ وہ اس کو پسند کرتا ہو، یا نہ کرتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی معاشری ادارہ بلحاظ اپنی رکنیت کے نہ تو اتنا ہمہ گیر ہے اور نہ اس میں اس قدر عالمگیریت موجود ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے، مختلف ممالک کے نظامہائے سیاسی میں تغیر و تبدل ہوا، کئی سیاسی و معاشی تحریکات نے ذہن انسانی کی رفتار کو متاثر کیا مگر ــــ سوائے چند سیاسی مفکرین کی مخالفت کے جن کے خیال میں مملکت "ہماری کمزوریوں سے پیدا ہوئی"۔ اس لئے وہ

"اپنی بہترین حالت میں بھی ایک ناگزیر برائی" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ——— اقتدار مملکت کا دائرہ انسانی افعال کی حد تک وسیع سے وسیع تر ہی ہوتا جارہا ہے خصوصاً موجودہ دور میں مملکت کو آمری حکومتوں کے تحت جو جواز کلی (Omni competence) حاصل ہوگیا ہے اس سے اس خیال کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف بھی مملکت کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے متاثر ہیں۔

بیسویں صدی میں سیاسیات کو قوموں اور ملکوں کی عملی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے وہ ظاہر ہے نہ صرف بین الاقوامی تعلقات بلکہ عالمگیر معاشی تحریکات جیسے حق ملکیت کے اصول، آزاد و مامون تجارت، خانگی مملوکات کی نگرانی، کاشتکاروں و زمینداروں کے تعلقات، قوانین کارخانہ جات، حقوق مزدوران، اشتراکیت، اشتمالیت، بولشویت، فاشیت، انفرادیت اور سرمایہ داری کو بھی سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے، سیاسیات کی اس اہمیت کے مدنظر فاضل پروفیسر صاحب کی کتاب اُردو داں طبقہ کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ اس سے اُردو جاننے والوں کو "پیچ در پیچ سیاسی حالات کے سمجھنے میں آسانی" ہو اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے (ترجموں کو چھوڑ کر) جو سیاسیات جیسے علمی موضوع پر علمی انداز بیان میں لکھی گئی ہے۔

کتاب کے گیارہ ابواب ہیں جن میں سیاسیات کی تعریف دیگر ادارات سے اس کے تعلق، مملکت اور اس کے ہم جنس ادارات، تخیل مملکت کے آغاز و ارتقاء، مملکت کی آبادی اور رقبہ، خواہش تعامل، اقتدار اعلیٰ، قانون، حقوق و آزادی، حکومت کے دائرہ عمل اور اس کے معمولی فرائض اور مملکت کے مطمح نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مؤلف نے مضامین کی ترتیب کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ اپنے مطالب کو واضح کرنے میں نہ صرف تسلسل کو قایم رکھا گیا ہے بلکہ باوجود علمی اصطلاحات کے اُن کے عام فہم بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور طرز استدلال کو مثالوں کے ذریعہ تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں کتاب کی ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو علم سیاسیات پر مغربی مصنفین کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی۔ فاضل پروفیسر صاحب نے سیاسی اصول و نظریات کی وضاحت اور تائید میں مشرقی مفکرین سے بھی استناد اور استفادہ کیا ہے جو بیحد مفید ہے۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ مشرقی مفکرین نے نہ تو علم سیاست پر باقاعدہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور نہ ان کی تحریرات میں ایسی خصوصیات موجود ہیں جن سے سیاسی استدلال کیا جا سکے۔ وہ یا تو مذہب اور رواج کے تسلیم شدہ سیاسی نظام کو بجنسہ قبول کر لیتے تھے یا پھر

اُن کے سیاسی مباحث صرف فرمانرواکی شخصی خوبیوں یا برائیوں پر آکر ختم ہوجاتے تھے۔ شروانی صاحب نے مشرقی مفکرین، خصوصاً کوتلیا (جو چانکیا اور وشنو گپتا کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے) ابن خلدون اور امام غزالی، کے سیاسی تفکرات کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس سے یہ بجا طور پر نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نظری سیاسیات کے بعض بنیادی مسائل میں، ان مشرقی علمار نے مغربی مفکرین کی رہنمائی ہے۔

"خواہش تعامل" والے باب میں عناصر مملکت کے سلسلہ میں زبان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے مختلف ممالک کی لسانی کیفیات کا جایزہ لینے کے بعد مؤلف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "سیاسی اتحاد کے لئے لسانی اتحاد لازمی نہیں ہے اور لسانی اتحاد کے باوجود ایک ہی زبان بولنے والوں کا متعدد آزاد مملکتوں میں منقسم ہونا ممکن ہے"۔ یہ نظریہ ہندوستان کے اُن "ادیب لیڈروں" کے قابل توجہ ہے جو "سیاسی اتحاد کے لئے لسانی اتحاد" کی خاطر اردو ہندی۔ ہندوستانی اور بنیادی ہندوستانی (Basic Hindustani) کے پیچھے سرگرداں ہیں۔

باب ششم میں مملکت کے اقتدار اعلیٰ، اس کی نوعیت اور خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ مسئلہ اقتدار اعلیٰ اُن پیچیدہ مسائل میں سے ہے جو فلسفۂ سیاسی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں نظریۂ اقتدار اعلیٰ پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے اس کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ قابل مؤلف نے اس مفروضہ کے تحت اس سے بحث کی ہے کہ قارئین "مبادی سیاسیات" بہت بڑی حد تک مسائل و تنقیدات اقتدار اعلیٰ سے پہلے ہی سے آگاہ ہیں، چنانچہ بودین، ہوبز، آسٹن اور مئین وغیرہ نے اقتدار اعلیٰ کی جو تشریح و توضیح کی ہے وہ اس سے پوری طرح ذہن نشین نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ "قانونی" اقتدار اعلیٰ کی کیا اہمیت ہے اور "قانونی" و "سیاسی" اقتدار اعلیٰ میں کیا امتیاز و فرق ہے۔ تکثیری نظریہ سازوں میں ڈیوگی اور پروفیسر لاسکی کے ساتھ گیرکے میٹ لینڈ، کریب اور فجیس کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو نامناسب نہ تھا۔

پروفیسر صاحب نے اقتدار اعلیٰ کے عملی پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مملکت اپنے احکام کیسے صادر کرتی ہے، وہ کونسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے باشندگان ملک کو اس کی خواہشات کا علم ہوجاتا ہے اور وہ کس قسم کی مشین ہے جو لوگوں کو اُس کے ماننے پر مجبور کرتی ہے"۔ پھر ایسے تمام ادارات کو جن کے ذریعہ مملکت کی خواہشات کا علم ہوتا ہے، پروفیسر صاحب نے "ہئیت حاکمیہ" (Gubernatorium) کا لقب

دیا ہے۔ یہی گویا مملکت کی "حقیقی نفس ناطقہ"، یا بہ الفاظ دیگر باعمل ہیئت سیاسیہ ہے لیکن اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ جب واقعی اقتدار اعلیٰ "ہیئت حاکمیہ" ہی سے وابستہ ہے تو پھر قوانین دستوری (جن کے ذریعہ ہیئت حاکمیہ کا تعین کیا جاتا ہے) اور مشیت عامہ میں کیا فرق ہے اور ہیئت حاکمیہ کا تعلق سیاسی و قانونی اقتدار اعلیٰ سے کس قسم کا ہے ہیئت حاکمیہ کے تخیل پر جو بقول موصوف "حقیقت واقعات پر مبنی ہے" اگر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی تو بہتر تھا۔

اشتمالیت کے اصول بہت اچھی طرح سمجھائے گئے ہیں لیکن اشتراکیت کے سلسلہ میں کارل مارکس نے تاریخ کی جو معاشی تاویل کی ہے اس پر روشنی نہیں ڈالی گئی اور نہ اس کی پیش گوئیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

آخر میں مملکت کے مطمح نظر کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے اس کا بلند ترین مقصد بین الاقوامیت کا حصول قرار دیا ہے اور اس کے لئے ان کے نزدیک سب سے اہم چیز تنظیم اور عدل و مساوات کی تعلیم ہے۔ لیکن اس بلند مقصد کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کے لئے صرف عدل و مساوات کی تعلیم کافی ہے یا پورے معاشرے کے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ معاشرہ کی یہ غیر منظم کیفیت، یہ ناانصافیاں اور عدم مساوات، مقتدر اور سرمایہ دار طبقہ کے استحصال کا نتیجہ ہیں؟ کیا ملکوں، قوموں اور طبقوں کی آپس کی لڑائیوں کا حقیقی سبب معاشی نہیں ہے؟ اور اگر یہ صحیح ہے تو جب تک معاشی بے اطمینان کو دور نہیں کیا جائے گا اس وقت تک نہ تو عدل و مساوات کی تعلیم مفید ثابت ہوگی اور نہ بین الاقوامیت جیسا بلند مقصد حاصل ہو سکے گا۔

قابل مؤلف نے سیاسیات کے اصول و مبادیات سمجھانے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے اگر اس میں کسی قدر تفصیل روا رکھی جاتی تو کتاب کے افادہ میں اور اضافہ ہو جاتا۔ علاوہ ازیں کتاب میں زبان کی بھی بعض غلطیاں نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۵ پر ذخیرہ کا لفظ انسانوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ صفحہ ۳۸ پر ہندوستان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی "خود دار مملکتوں کی صف میں بیٹھنے کی آرزو کا اظہار" کر رہا ہے۔ صف میں بیٹھنا کوئی محاورہ نہیں ہے صف میں کھڑا ہونا کہتے ہیں۔ صفحہ ۹۲ پر (Bed Room) کے لئے "پلنگ کمرہ" استعمال کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس سے کہیں زیادہ اچھا لفظ خوابگاہ موجود ہے۔ نیز کتابت کی غلطیاں بھی جابجا پائی جاتی ہیں امید ہے کہ دوسری اشاعت میں ان کو قایم رکھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

پروفیسر صاحب نے انگریزی کتابوں کے ناموں کے ترجمے کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جو

اصول انھوں نے پیش نظر رکھا ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ حوالے کے لئے جن کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں اُن کا ترجمہ اس وقت تک نہیں ہونا چاہئے جب تک خود کتاب کا ترجمہ نہ ہو جائے۔ حوالے یا تو سند کے طور پر دیئے جاتے ہیں یا اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قارئین کتاب میں سے کوئی صاحب کسی مخصوص مسئلہ پر مزید معلومات فراہم کرنا چاہیں تو اس میں سہولت ہو۔ پروفیسر صاحب نے اُردو داں طبقہ کی سہولت کے خیال سے انگریزی (اور بعض فرانسیسی و جرمن بھی) کتابوں کے نام تو اُردو میں لکھ دیئے ہیں لیکن خود یہ کتابیں اُردو میں موجود نہیں ہیں۔ جو ترجمے کئے گئے ہیں وہ بھی زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ مثلاً میرز کی کتاب (Modern Turkey) کا ترجمہ "ترکیہ حالیہ" کیا گیا ہے حالانکہ "جدید ترکی" اس سے کہیں زیادہ موزوں اور عام فہم ہے۔ پھر ان ترجموں میں بھی یکسانیت قائم نہیں رکھی گئی ہے مثلاً ڈائسی کی کتاب (Introduction to the law of the constitutions) کا ترجمہ کہیں تو "تمہید قانون دستوری" کیا ہے اور کہیں "تقریب قانون دستوری"۔ اسی طرح لینن کی کتاب (Proletarian Revolution) کا ترجمہ صفحہ ۵۴۱ پر "انقلاب طبقۂ اسفل" کے نام سے کیا گیا ہے اور پھر (Proletarium) کے لئے جو اصطلاح وضع کی گئی ہے وہ "ارزلیہ" ہے ایک جگہ تو پروفیسر صاحب نے کمال ہی کر دیا ہے (Statesman's year book) کا ترجمہ "سالنامۂ مدبرین" کیا ہے۔ "سالنامہ مدبرین" سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اُردو میں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں تمام مدبرین کا تذکرہ ہو۔ حالانکہ یہ ایک اخبار (States man) (Statesmen نہیں) کا سالنامہ ہے۔

کتاب کے آخر میں علمی اصطلاحات کی ایک طویل فہرست بھی دی گئی ہے جو بیحد مفید ہے۔ اگر اس کو انگریزی حروف کے لحاظ سے بھی مرتب کیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

مجموعی لحاظ سے کتاب کا مطالعہ نہ صرف مفید بلکہ اُردو داں طبقہ کے لئے ضروری ہے۔ اس سے انھیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ علمی مطالب کے اظہار کی اردو زبان میں کس قدر گنجایش موجود ہے۔

(ش۔ب)

طالباتِ جامعہ

موسم کی نیرنگیاں .. .. جہاں بانو بیگم بی۔اے (عثمانیہ)
وہمی .. .. سعدیہ بیگم بی۔اے (عثمانیہ)
تشنگانِ دیدار .. .. .. شہربانو نقوی متعلمہ ایف۔اے (زنانہ کالج)
پھول بیچنے والی لڑکی .. .. رضیہ بیگم
محبت یا مجبوری .. .. رابعہ بیگم
اردو ادب کے مرکز .. .. لطیف النسا بیگم بی۔اے (عثمانیہ)
صالحہ .. .. خورشید سلطانہ

موسم کی نیرنگیاں

ہزاروں آفتوں پر بھی بڑی دلچسپ ہے دُنیا
جو لوگ آتے ہیں اس میں وہ تو مر کر ہی نکلتے ہیں

+ دیکھنے میں تو یہ ایک بہت ہی سیدھا سادہ سا عنوان ہے۔ پہلی نگاہ میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس پر کیا کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ لیکن جب لکھنے کا ارادہ کیا تو خیالات کے اوسان خطا ہیں تخیل کے ہوش پران ہیں۔ لکھنے کو تو ایک دفتر ہے لیکن وقت کا مسئلہ دقت طلب ہے۔ علاوہ اس کے خیالات کی جو ردانی ہے اس میں تسلسل نہیں۔ بے ربطی و بے عنوانی سی ہے یہ بھی شاید اس موسمی کیفیت کا ہی اثر ہے کہ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں۔ اور قلم کا قدم ہے۔ اہردی کی چال اختیار کئے ہوئے ہے +

دنیا ...... ایک انقلابات کی بستی ہے۔ جس طرح جہاں کی کسی چیز کو ثبات و قیام نہیں۔ اسی طرح موسم بھی طوطا چشمی پر ہر آن مایل ہے۔ کبھی کچھ ہے تو کبھی کچھ۔ یہ بوڑھا فلک بیٹھے بیٹھے نت نئی کروٹیں بدلتا ہے۔ اس کے ہر پہلو میں ایک دنیائے انقلاب مضمر ہے۔ اپنی بلندیوں پر اس قدر اتراتا ہے کہ زمین کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی جاتی ہیں۔

انسان کی طبیعت سے وقت اور موسم کا لگاؤ ایک فطری چیز ہے۔

دامن ہمالے کے دو آبہ ہیں۔ ان سر سبز شاداب وادیوں کے لہلہاتے ہوئے پیچ وخم میں بسنے والی ہستیوں کا مقابلہ صحرائے عرب کی ریتیلی خشک سرزمین پر رہنے والے بدویوں سے کیجئے۔ تو موسمی کرشموں کا اندازہ ہو جائیگا۔ ریگستانی علاقہ کا باشندہ اپنی جبلی خشک مزاجی و انقباض طبع سے مجبور ہے۔ اس کی طبیعت میں شعریت کا فقدان ایک لازمی امر ہے اس کا سینہ حسیات وجذبات بھرے قلب سے عاری ہے۔ اس کی آنکھیں سطحی اشیاء کے دیکھنے کی عادی ہیں۔ اس کے دماغ میں ایک جمود ہے۔ غرض یہ کہ کسی کیفیت سے متاثر ہو جانے والا دل اس کے پہلو کو کبھی اپنی تڑپ سے مضطرب نہیں کر سکتا۔ قدرت کی رنگینیوں اور ان شاداب وادیوں سے مستفید ہونے والی ہستیوں کو لیجئے جن کی نگاہیں دور دور کی خبر لاتی ہیں۔ جن کی دلی چھینیاں انہیں کسی آن چین سے رہنے نہیں دیتیں جن کے دل سامان اضطراب سے معمور ہیں۔ نیچر کی ہر ادا ان کے لئے جولانیوں کا دفتر کھول دیتی ہے۔ انہیں کی زندگی زندہ دلی سے موسوم کی جا سکتی ہے۔ ایک اُبلتا ہوا جوش وخروش اُن کے دلوں میں موجزن ہے۔ خیالات کا ایک چشمہ ہے کہ پھوٹ بہنے پر آمادہ ہے۔ کسی کی بیجا نکتہ چینی پر، کسی کے ناجائز حملہ پر جلد متاثر ہونے والا قلب ان کی زندگی کی معراج ہے

غریب ہندوستان، دیکھنے میں ایک خوبصورت خطہ ہے۔ لیکن اس کا ہر موسم نئے نئے شگوفے کھلاتا ہوا رونما ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ دراز نہ بھولنے والی اور بمشکل گذرنے والی گرمی ہے۔ جس نے ہر فرد بشر کے چھکے چھڑا دیئے۔ مارچ کا مہینہ غضب الٰہی بن کر نازل ہوتا ہے۔ اور انسان کے اعصاب اندر ہی اندر جھلس کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی قوت قلب مردہ ہو جاتی ہے۔ اس کے حسیات میں غیر معمولی انجماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔ نہ خس کی ٹٹیاں اس کا مداوا کر سکتی ہیں۔ نہ برقی پنکھے اس درد کا درمان ہو سکتے ہیں۔ جولانیوں کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ ان سب پر اوس پڑ جاتی ہے۔ غرض یہ ایام مصائب کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق بڑی مشکل سے طے ہوتے ہیں۔ فرہاد کی قسمت میں ایک ہی وقت جوئے شیر کا لانا تھا۔ اور ہمارے لئے یہ مصرعہ میر ہر سال حسب حال ہے۔

بڑی منتوں آرزوں کے بعد آسمان نے تیور بدلے گھٹا اُمنڈ اُمنڈ کر آئی۔ اور برس گئی۔ گرمی کی گرمئ بازار سرد ہو چلی۔ اُمیدوں کا چمن جو کھلا رہا تھا اس میں کونپلیں پھوٹیں طبیعت کی کلی جو مرجھا گئی تھی اس میں از سرنو جان آئی۔ اور جی چاہا کہ کچھ کام کریں ۔۔۔۔۔۔ ایسے موقع پر انگلستان اور ہندوستان کا خوب مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کی موسمی کیفیتوں کا ہی اثر ہے کہ لوگ کیسے پھرتیلے مستعد اور پابند ہوتے ہیں۔ ان کے لئے سچ پوچھئے تو مرنے کی بھی فرصت نہیں اور ہمارے جینے

کے لالے پڑے ہیں۔ وہاں کی آبادی کی کثرت۔ چہل پہل۔ دوا دوش۔ رونق۔ وقت کی قدر۔ جدت پسندی کا جذبہ
غرض یہی اور ایسے دیگر کیفیات وابستہ ہیں اس فضائے بسیط کے درخشاں موسم سے۔ یورپ میں درخشانی کہاں
لیکن اس سورج سے محروم رہنے والے ملک میں بھی طبائع اس قدر بیچین اور کام کرنے کے لئے مستعد ہیں کہ عقل
دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کی ہر صبح ایک اُمیدوں کا دفتر لئے ہوئے رونق فگن ہوتی ہے۔ وہاں کا بدترین سے
بدترین موسم بھی ان کے کاروبار میں ہارج ہو نہیں سکتا۔ دن اور رات کے دیوتا ان کے سرکار میں ہاتھ باندھے
حاضر رہتے ہیں۔ غذا ایسی جو ہم ہندوستانیوں سے بیماری میں بھی بمشکل چلے۔ لیکن وہاں کے بلانوش اسی پر
اپنی صحت و تندرستی کا رکارڈ توڑ رہے ہیں۔ وہ قوم اپنی تندرستی اور قوت قایم رکھنے کے لئے ہزاروں پیترے
بدلتی ہے۔ آب و ہوا کی تاثیر سے جو اُمنگ اور جودت پیدا ہوتی ہے۔ طبیعت شگفتہ ہو کر لہریں لینے لگتی ہیں
اس کے لئے ہندوستان کی بارش کا ہی موسم ہے۔ برسات سے زمین میں جان پڑتی ہے۔ انگلستان کے ہر
فرد بشر میں ایک طوفانی کیفیت۔ ایک مجنونانہ سرعت و دلچسپی ——— وہاں کی چندروزہ سکونت کے بعد پریوں
کی فرضی قصہ کہانیوں سے انسان کی روزمرہ زندگی چنداں مختلف نہیں معلوم ہوتی۔ نقالی اور جدت کا ان کے ہر
پہلو سے اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے جمود اور اضمحلال کی زندگی وہاں سے آنے کے بعد ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوتی ہے
ہم وقت کو ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے گھورتے رہنے کے ایسے عادی ہیں کہ وقت بھی ہماری اس حالت کو دیکھ کر
کف افسوس ملتا ہوا گذر جاتا ہے۔ لیکن شاید ہم موسمی تھپیڑوں سے، بچاؤ کی کوئی صورت نہیں پاتے +

باہر نکل کر دنیائے رنگ و بو سے دوچار ہونے والوں کی صحت سے، چار دیواری کی ان مقید و پابند
ہستیوں کا اندازہ لگایئے جن کے چہرے کی زردی کو خزاں زدہ پتہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جن کے اعضا
نکمے ہو گئے ہیں۔ جن کی صحت بیٹھے رہنے اور ٹھہرے پانی کی سی یکساں زندگی بسر کرنے سے ڈانواڈول ہو رہی
ہے۔ جن کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ خزاں ہو یا بہار۔ بارش کا دلاویز سماں ہو یا چلچلاتی ہوئی دھوپ
وہ ہیں اور ان کے در و دیوار ——— چاندنی رات نظر فریب منظر بھی ان کے لئے کوئی سامان کشش نہیں رکھتا
جبکہ تمام عالم پر ایک کیف و سرور طاری ہوتا ہے۔ اپنے اپنے گوشۂ عافیت میں منہ پیٹے ہوئے پڑے نظر آتے
ہیں۔ چاندنی ایک مصور کے خواب کی طرح ان کی سوئی ہوئی قسمتوں پر مسکراتی ہوئی گذر جاتی ہے +

کاش ——— دنیا سمجھ سکتی ——— ابدی نغموں کا بیش بہا ترنم ——— ہوا کی ان وحشیانہ چیخوں میں ——— بارش کی ان موسلا دھار سرگوشیوں میں ——— درختوں کے پتوں کی تالیوں میں دور افتادہ ساحل کے سمندر سے ٹکرانے والی آوازوں میں ——— روح پرور ہوا کے سکوت میں زندگی کائنات کا ایک لامتناہی قہقہہ ہے ——— بعض اوقات ساری کائنات زندگی کے اس عقدۂ لاینحل پر غور کرتی ہوئی ساکت وصامت ہو جاتی ہے۔ تعجب کرنے لگتی ہے۔ سطح زمین پر پہاڑ چیں بر جبیں ہو جاتے ہیں۔ سمندر کی گہرائیوں میں موجوں کے تھپیڑے اس پر سر دھنتے ہیں ———،

جہاں بانو بیگم بی۔ اے (عثمانیہ)

وجہی

وجہی اُردو کا ایک قدیم ادیب اور بلند پایہ شاعر ہے۔ اس شاعر کے حالات معلوم کرنے سے پہلے اس زمانہ کے حالات جان لینا ضروری ہیں جس میں وجہی آسمان شہرت پر پہونچا۔ یہ تاریخ دکن کا وہ زمانہ ہے جو دکنی ادب کا سنہری دور کہلایا جا سکتا ہے۔ وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ابراہیم قلی قطب شاہ کے زمانے میں درباری شاعر کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ قطب شاہی حکمراں اُردو ادب کے دلدادہ اور سرپرست تھے ان کو علم و فن کا خاص شوق تھا۔ ابراہیم قلی کا بیٹا محمد قلی جس کے عشق کی داستان وجہی نے "قطب مشتری" میں منظوم کی ہے نہ صرف ادب کا محسن اور سرپرست تھا بلکہ خود اُردو فارسی اور تلنگی کا ادیب اور شاعر تھا۔ اس کے دربار میں شاعروں عالموں اور ادیبوں کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ملا غواصی بھی محمد قلی کے دربار کا شاعر تھا لیکن وجہی کو ملک الشعرا کا رتبہ حاصل تھا محمد قلی کے بعد اس کا بھتیجا اور داما سلطان محمد بادشاہ ہوا اور اس کے عہد میں بھی وجہی دربار کا شاعر تھا۔ اگرچہ اس کے عہد کی علوم کی ترقی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ خود سلطان محمد عالم و فاضل تھا اور اُس نے کئی کتابوں پر اپنے دست خاص سے حاشیہ قلمبند کئے تھے جو اب تک موجود ہیں۔ چوتھی پشت میں یعنی عبداللہ قلی

کے عہد میں بھی وجہی درباری شاعر تھا اور جب اس کو لڑکا پیدا ہوا تو وجہی نے بہ حیثیت درباری شاعر تاریخ پیدایش "آفتاب از آفتاب آمد پدید" نکالی لیکن اس بادشاہ کے عہد میں ملا غواصی کو ملک الشعرا کا درجہ حاصل ہوا اور چونکہ وجہی بہت معمر ہوچکا تھا اس لئے شاید بادشاہ اس کو دربار کے زمرۂ شعراء سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا چنانچہ اسی بادشاہ کی فرمایش پر وجہی نے ۱۰۴۵ھ میں ایک کتاب لکھی جو نثر میں ہے اور جس کا نام "سب رس" ہے۔

وجہی کی زندگی اور ادبی ترقی

وجہی ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور ابتدا ہی سے اس کی شاعری مقبول ہوئی۔ اس کی شاعری کے قبل بھی دکن میں ادب اردو کو ترقی ہو چکی تھی اور کئی شعرا تھے مثلاً احمد مصنف "یوسف زلیخا" ملا خیالی اور فیروز وغیرہ۔ یہ سب گولکنڈہ میں گذر چکے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی شعرا بیجاپور، احمد نگر اور بیدر میں تھے جو وجہی سے قبل اور اس کے زمانے میں موجود تھے۔ وجہی کو ہمیشہ اپنی شاعری پر ناز رہا وہ کسی کو اپنے برابر کا شاعر نہ سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کے حالات معلوم کرنے میں اس کی کتابوں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ وجہی کا نام غالباً وجیہہ الدین تھا۔ وجہی اور وجیہی دونوں تخلص اختیار کئے ہیں نظم میں "قطب مشتری" اور نثر میں "سب رس" کے علاوہ اس نے غزلیات قصیدے اور رباعیات وغیرہ لکھی ہیں جو زیادہ تر تلف ہوگئیں اور چند نمونے اب بھی باقی ہیں اس کی نظم قطب مشتری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۸ھ کے بہت قبل شروع ہوئی تھی کیونکہ اس کے دیباچہ میں ابراہیم قلی کو بادشاہ وقت اور محمد قلی کو شہزادہ بتایا گیا ہے۔ ابراہیم قلی کی حکومت کا زمانہ ۹۵۷ھ تا ۹۸۹ھ ہے لیکن یہ کتاب بہت زمانے کے بعد محمد قلی قطب شاہ کی بادشاہت کے زمانہ میں یعنی ۱۰۱۸ھ میں ختم ہوئی۔

"سب رس" عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں یعنی قطب مشتری کے ستائیس[۲۷] سال بعد ۱۰۴۵ھ میں لکھی گئی اس بادشاہ کے عہد میں ملا غواصی کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی اور ملک الشعرا کا رتبہ غواصی ہی کو حاصل تھا۔ عبداللہ قطب شاہ نے ضعیف وجہی کو غالباً شاعری کے میدان سے الگ کرنے کے لئے اس سے فرمایش کی کہ ایک کتاب نثر میں لکھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کتاب ("سب رس") وجہی نے دربار سے علیحدگی کی تقریب میں لکھی ہو۔

"سب رس" کا اسلوب نہایت پاکیزہ ہے اور عبارت مسجع اور مقفیٰ ہے۔ اس میں حسن و دل کی داستان عشق کو بیان کیا ہے۔ یہ قصہ دراصل ایران کے شاعر محمد یحییٰ سیبک فتاحی نیشاپوری کا ہے جس کو سب سے پہلے اس نے

"دستور عشاق" کے نام سے نظم میں لکھا۔ اس نظم کے علاوہ اس نے یہی قصہ نثر میں "شبستان خیال" کے نام سے لکھا۔ لیکن ان دونوں قصوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ وجہی کی "سب رس" معلوم ہوتا ہے کہ "شبستان خیال" کو دیکھ کر لکھی گئی ہے کیونکہ اس میں اور "دستور عشاق" میں وہی فرق ہے جو "شبستان خیال" اور "دستور عشاق" میں ہے۔ "سب رس" کا قصہ شبستان خیال کے عین مطابق ہے۔ وجہی نے اپنی تصانیف میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کتاب کی اصل اس کو کہاں سے ملی۔ اور یہ بہت تعجب کی بات ہے۔ فتاحی کے اس قصے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور انگریزی، جرمن، ترکی اور عربی زبانوں میں کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

حال ہی میں انجمن ترقی اردو نے "سب رس" کو شائع کر کے زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ کتاب کے شروع میں مولوی عبدالحق صاحب کا ایک نہایت مفید و جامع مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے موضوع اصل اسلوب اور زبان پر اور وجہی کی زندگی اور اس کے زمانے پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مقدمہ میں کتاب کے قصے کا خلاصہ بھی ہے جس سے اس طویل قصہ کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ غرض یہ مقدمہ ہر لحاظ سے مفید چیز ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی ہے جس میں متروک شدہ اور مشکل الفاظ کے معنی دیئے گئے ہیں جس سے کتاب کا مطالعہ بہت آسان ہو گیا ہے۔ غرض انجمن ترقی اردو کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سعدیہ بیگم بی۔ اے (عثمانیہ)

تشنگانِ دیدار

انیس عالی خاندان اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والدین کو ایک عرصہ دراز تک اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ماں نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں بہتیری دعائیں اور مرادیں مانگیں، جن کا نتیجہ انیس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے والدین کے زیر سایہ کافی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اس کے باپ سہیل کی عمر پچپن سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس نے انیس کے بالغ ہوتے ہی اس کے لئے بر ڈھونڈنے شروع کئے۔ مال و زر کی کچھ کمی نہ تھی دنیاوی منفعت حاصل کرنے کے لئے متعدد لڑکوں نے اس کی خواستگاری کی۔ باپ نے اپنی لڑکی سے ایک روز کہا کہ "بیٹی اب تمہیں دوسرے گھر کی تیاری کرنی چاہئے، ہمارا زمانہ آخر ہے ہمیں اپنے چہرہ پر سہرے کے پھول کھلتے ہوئے بھی تو دکھلا دو۔" انیس تھی بڑی تیز فہم سمجھ گئی کہ کسی لڑکے پر نگاہ ہے اس طرح مجھے پھانسنا چاہتے ہیں۔ اس نے دبے لہجہ میں کہہ دیا کہ نہیں ابّا ہم ابھی شادی نہیں کریں گے، کیا ہم ابھی سے آپ پر بوجھ ہو گئے ہیں"

سہیل کی ڈیوڑھی سے متصل اس کا ایک رشتہ دار محسن رہتا تھا جو بڑا مالدار زمیندار تھا اس نے فہم و فراست سے زمینات کا اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔ دونوں میں باہمی خصومت تھی کچھ خاندانی منافقت تھی جو بڑھتے بڑھتے دشمنی تک پہونچ گئی محسن کا اکلوتا لڑکا شہریار بچپن ہی سے سہیل کے گھر آتا جاتا تھا اس کا باپ لاکھ اس کو منع کرتا لیکن وہ ایک

مانتا تھا۔ عہد طفولیت ہی سے انیس اور شہریار میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ سن بلوغ کو پہونچتے پہونچتے اس دوستی نے دوسرا رنگ اختیار کیا، جب انیس جوان ہوگئی تو محسن نے اس کو شہریار کی صحبت میں رہنے سے قطعی منع کردیا۔ شہریار کو اس کی خبر ہوئی۔ روز کی ملاقاتیں اور عشق و عاشقی کی باتیں ختم ہوگئیں۔ اب بڑی مشکل سے آٹھ دس روز میں ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہوجاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یک لخت حکم امتناع مل گیا اب تو اس کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ رات بھر اپنی ماہ رخ کے خیال میں چاند کو تکتا اور اس طرح صبح کردیتا وہ محسوس کرتا تھا کہ خاندانی بیر نے اس پر یہ ستم توڑے ہیں تین مہینے گذر گئے۔ ایک دوسرے کی صورت کو ترس گئے۔ انیس بھی مغموم، حزیں اور پژمردہ رہا کرتی تھی۔ اس دوستی اور باہمی الفت کا حال انیس کے باغ کے بوڑھے مالی جمیل کو اچھی طرح معلوم تھا۔ جمیل نے انیس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ جب انیس اپنے محبوب کی یاد میں صحن چمن میں دیوانی سی پھرتی تو جمیل ہی اس پژمردہ خاطر کی طبیعت کو بہلاتا

چودھویں رات تھی۔ خانہ باغ میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی، انیس حوض اور فوارے کے قریب مرمریں بینچ پر شہریار کی یاد میں بےچین بیٹھی ہوئی تھی کبھی چاند سے مخاطب ہوتی تھی کہ اے چودھویں کے چمکتے ہوئے بدر جا میرے ماہ منیر سے کہنا کہ تیری انیس صحن گلشن میں تیری منتظر ہے۔ دفعتہً اس نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنی؛ عالم سکوت میں کسی کے قدموں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ شہریار کہہ رہا تھا "ہاں اے میری ماہ پارہ پھر چاند سے مخاطب ہوکر اپنا پیام دینا۔ اے میری حور یہ کان تری خوش آیند آواز کے بھوکے ہیں انھیں سیر کر"

انیس پریشان ہوگئی اس نے پوچھا "تم کون ہو۔ یہ آواز تو کچھ مانوس سی معلوم ہوتی ہے۔ شاید میں نے کہیں سنی ہے۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ تمھیں اپنی جان کا خوف نہیں؟ محل کی دیواریں اتنی بلند ہیں، تم اس پر کس طرح چڑھ گئے۔

"شہریار"۔۔ محبت کے پروں سے پرواز کی، طائر محبت ہوں اس سے کہیں اونچی دیواریں بھی حائل نہیں ہوسکتیں۔ محبت ہی زندگی ہے اور محبت ہی موت ہے ؎

محبت لے کے آئے تھے محبت لے کے جاتے ہیں
ہم اس دنیا سے اپنے ساتھ جنت لے کے جاتے ہیں

"انیس"۔ لیکن تمھیں کوئی دیکھ لیتا تو تمہاری جان پر بن آتی۔ اب مجھے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ تمہارے

دل میں میری سچی محبت بھری ہے۔ محبت کا پلہ تمہارے طرف ہی بھاری ہے دونوں مریض فرقت آپس میں مل گئے خوب گلے شکوے ہوئے۔

"شہریار" عنقریب میں پریم نگر جا رہا ہوں۔ وہاں ہماری زمینات کا تصفیہ ہونا ہے۔ اگر زندہ لوٹوں گا تو پھر کسی حیلے مل لوں گا۔

"انیس" (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "شہریار خط ضرور لکھنا تاکہ مجھے تمہاری خیریت سے آگاہی ہوتی رہے۔

نصف شب گذر چکی تھی، طائران محبت کی جدائی کا عجب دردناک منظر تھا شہریار دس قدم آگے بڑھتا تو انیس اس سے دوڑ کر مل جاتی تھی کبھی انیس واپس ہونے لگتی تو شہریار دوڑ کر اپنی محبوبہ سے مل جاتا تھا۔

رات گذر گئی۔ صبح ہوئی۔ انیس کے حق میں یہ صبح، صبح محشر کا حکم رکھتی تھی۔ انیس کو رباب (اس کی ماں) نے مطلع کر دیا کہ کل تمہارا نکاح ایک لڑکے سے ہوجائیگا سہیل نے پیام منظور کر لیا ہے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ انیس کے چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ سر پھوڑا اپنے کمرے سے باہر آگئی اور سیدھی جمیل مالی کے یہاں پہونچی۔ مالی نے گذشتہ شب انیس اور شہریار کو جھاڑیوں میں چھپ کر دیکھ لیا تھا۔ انیس نے تمام واقعات بیان کئے اور اپنے دل کا مدعا اس پرانے بوڑھے مالی سے کہہ دیا۔ جمیل نے کہا "بیٹی کچھ فکر نہ کرو میں جو کہتا جاتا ہوں اس پر عمل کرنا پھر دیکھو دلی مراد حاصل ہوتی ہے کہ نہیں۔ عین شادی کے موقع پر حجلۂ عروسی سے کچھ فاصلے پر میں ٹھیرا رہوں گا تم کسی حیلے کمرے سے نکل کر مجھ تک پہونچ جاؤ اس کے بعد میں دیکھ لوں گا" انیس نے ایسا ہی کیا دلہن کے پہناوے میں عین شادی کے موقع پر الحاق عروسی سے فرار ہو کر جمیل کے ساتھ ایک خاص مقام پر روپوش ہو گئی۔ رباب اور سہیل نے کمرۂ عروسی میں داخل ہو کر جب اس کو غائب پایا تو مہمانوں میں شرمندگی کے مارے خوف سے منادی کرادی کہ دلہن کی طبیعت یکایک بگڑ گئی ہے"

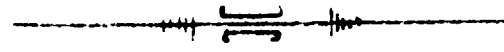
شادی تو ملتوی کر دی گئی لیکن انیس کے نہ ملنے پر سہیل نے دولہا والوں کی اشک شوئی کے لئے یہ ترکیب سوچی کہ ایک فرضی جنازہ اس کی محلسرا سے نکالا جائے اور سب کو مطلع کر دیا جائے کہ دلہن کا انتقال ہو گیا۔

شہریار نے پریم نگر سے قاصد کے ہاتھ محبت نامہ انیس کے یہاں روانہ کیا۔ سوئے اتفاق سے قاصد عین اس وقت شہر میں داخل ہوا جبکہ انیس کا فرضی جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ قاصد الٹے پیر تیز تیز پریم نگر پہونچا اور شہریار سے اس ماجرے کی کیفیت سنا دی۔ شہریار دیہاتی حکیم سے زہر خرید کر بہت جلد انیس کی فرضی قبر پر پہونچا جمیل جانتا تھا کہ شہریار

ضرور اس دھوکے میں کہ انیس کا انتقال ہوگیا ہے اس کی قبر پر جائے گا اور اپنا کام تمام کرے گا۔ اسی خیال سے وہ روانہ ہوا اور حسن اتفاق سے وہ اس وقت فرضی قبر پر پہونچ گیا جبکہ شہریار زہر کا جام ہاتھ میں لئے قبر پر بین کر رہا تھا۔ جمیل نے شہریار کے ہاتھ سے جام لے کر زمین پر دے مارا اور کہا "انیس زندہ ہے میرے ساتھ چلو بتلاتا ہوں"

شہریار انیس کے پاس پہونچا۔ دونوں تشنگان دیدار ایک دوسرے سے مل گئے۔ جمیل نے ایک روز سہیل کو انیس کی حیات اور شہریار کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حال سنا دیا۔ اپنی پیاری لڑکی سے ملنے کی خوشی میں وہ اپنے وفادار مالی کے ساتھ انیس کے دروازے پر پہونچا۔ سہیل نے شہریار اور انیس کی خطائیں معاف کردیں۔ اور بڑی دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ سہیل نے اپنی پوری جائداد کا مالک انیس اور شہریار کو بنا دیا اور اس طرح یہ دونوں اپنی زندگی چین و آرام سے گذارنے لگے۔

شہر بانو نقوی متعلمہ الیف۔ اے (زنانہ کالج)



پھول بیچنے والی لڑکی

جب موسم بہار کا آفتاب بلند آسمان پر چمکنے لگتا خوش نوا طائر بہار کے نئے گیت گاتے تتلیاں رقص کرنے لگتیں ہر طرف رنگینی اور حسن کی فراوانی ہوتی تو اُس کا چھوٹا سا چمن بھی خوش رنگ پھولوں سے بھر جاتا۔ ہر شام وہ خوشی خوشی انھیں اکٹھا کرتی اور اپنے چھوٹے سفید کتے کے ساتھ بازار کی طرف چلی جاتی وہاں وہ پکار پکار کر اپنے پھول فروخت کرتی۔ اس کی شیریں آواز جس میں بچپن کی سادگی اور دل آویزی ابھی تک موجود تھی راہگیروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتی اور بہت جلد اس کے سارے پھول بک جاتے۔ اور وہ اسی طرح ہنستی کھیلتی واپس ہوجاتی۔ دن بھر وہ اپنے بوڑھے اندھے دادا کے ساتھ باغ میں کام کرتی رہتی رات کو وہ اُسے پریوں اور بھوتوں کے قصے سناتا اور وہ اُسے سنتے ہی سنتے سو جاتی۔

دنیا، زندگی، موت، وہ ان سب سے ناواقف تھی۔ کئی بہاریں اسی طرح گزر گئیں۔ اب اُس نے پکار پکار کر پھول بیچنا چھوڑ دیا۔ اس کی آواز میں وہ شیرینی باقی نہ رہی تھی نہ اُس کے چہرے اور خط و خال میں کوئی ایسی بات تھی جو راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی۔ وہ ہر ایک گلی میں جاتی دکانوں کے سامنے سڑکوں پر پھرتی رہتی لیکن کوئی شوق سے اس کے پھولوں کو نہ خریدتا کیونکہ ہر بہار میں وہ یکساں پھول لاتی تھی اس کے باغیچہ کا کوئی پھول نیا اور زیادہ حسین نہ ہوتا۔

اب اُس کا بوڑھا دادا زیادہ ضعیف ہوگیا تھا وہ عموماً بیمار رہنے لگا تھا۔ وہ بڑی محنت سے اس کی تیمارداری کرتی کیونکہ اسے اپنے دادا سے بہت پیار تھا۔ اُس کے باغ کے پھول مرجھانے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا حسن زائل ہو رہا تھا۔ کوئی ان کا خبرگیراں نہ تھا۔ پودے سوکھ رہے تھے۔

اب اُس نے گلی گلی پھر کر پھول فروخت کرنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ ہر روز اب بھی اپنے پژمردہ پھول بازار میں لاتی بڑی سڑک کے نکڑ پر خاموش کھڑی ہوجاتی اُس کا کتا ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا اب دنیا میں یہی اُس کا تنہا دوست تھا۔ کیونکہ اُس کا بوڑھا دادا مرچکا تھا۔ وہ گھنٹوں ساکت اور خاموش کھڑی رہتی اُس کے چہرے کا رنگ آفتاب کی تمازت سے سیاہ پڑگیا تھا اس کے نرم و ملایم چھوٹے چھوٹے ہاتھ سخت اور بدنما ہوگئے تھے اس کے پیر کانٹوں اور سنگریزوں سے زخمی تھے۔ اس کے سیاہ بالوں میں سرخی کی جھلک پیدا ہوچلی تھی چھوٹی لڑکی وقت سے پہلے معمر ہوگئی تھی لیکن اس کی آنکھیں ...... بھوری اور بڑی بڑی عمیق آنکھیں۔ ان میں بیک وقت بچپن اور آغاز جوانی کی معصومیت پنہاں تھی۔ وہ کھڑے کھڑے تھک جاتی اس کا چھوٹا کتا پیروں میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا۔ لیکن اُس کے پھولوں کا کوئی خریدار نہ پیدا ہوتا۔

کبھی کبھی کوئی دیہاتی نوجوان اُدھر سے گزرتا تو اپنی نئی دُلہن کے لئے کچھ پھول خرید لیتا۔ کیونکہ وہ انھیں یہاں تھوڑے دام دے کر حاصل کرسکتا تھا۔ جب رات کی تاریکیاں بڑھنے لگتیں۔ راہگیروں کی آمد کم ہوجاتی تو وہ اپنے پھول سڑک پر پھینک دیتی اور اپنے ہی پیروں سے انھیں روندکر تاریکی میں غائب ہوجاتی۔ دنیا، زندگی، موت، وہ اب ان سب سے واقف تھی۔

اُس کے باغ کے پھول مرجھا چکے تھے۔ سوکھے ہوئے درختوں کی ڈالیوں پر کوئی کلی نہ تھی۔ بہار کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ پہاڑوں پر وادیوں میں کھیتوں میں۔ باغوں کے اندر ہر جگہ گزشتہ موسم بہار کی رنگینیاں ازسرنو بیدار ہو رہی تھیں لیکن غریب الن کا باغ بہار کا رہین منت نہ تھا۔ آسمان پر بھورے، کاسنی، گلابی اور نیلے ابر کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے ہوا بوجھل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ چھوٹی الن اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی

تھی۔ اب وہ پھول بیچنے نہ جائے گی۔ اُس کے چمن میں ایک کلی بھی نہ تھی اور اُس نے کئی روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ بیحد کمزور ہوگئی تھی۔ اُس کے کپڑے تار تار تھے۔ اُس کا غریب کتا اُس کے سامنے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ پیارا جانور، شاید وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ "جولی۔ جولی" اُس نے اپنا کمزور ہاتھ اُس کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ کتے نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اپنی مالکہ کی طرف پیار کی نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بمشکل کھڑا ہو کر اپنی دُم ہلا رہا تھا "آہ اس کے پیر کیسے کانپ رہے ہیں"، لڑکی نے اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیا وہ سسکیاں بھر رہی تھی "میرا عزیز جولی" وہ اُسے چومتی رہی اور پیار کرتی رہی۔ جانور کی آنکھیں چمکنے لگیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے غذا مل گئی تھی۔ وہ اُس کی گود سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا اور وہ خوش اور مسرور معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر کی جھلک تھی۔

بارش زور شور سے ہو رہی تھی۔ آفتاب غروب ہو گیا تھا یا سیاہ بادلوں نے اپنا لبادہ اُڑھا کر اسے نظروں سے بالکل غائب کر دیا تھا۔ پرندے تاریکی اور بارش سے سہم کر جھاڑوں میں جا چھپے تھے۔ بارش ہر لحظہ بڑھ رہی تھی لیکن ننھا جولی تیزی سے بازار کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ وہ بار بار گرتا کیونکہ اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن وہ اس طرح گر گر کر اُٹھتا اور بھاگتا جا رہا تھا۔ آخر کار وہ بازار میں پہونچ گیا۔ سڑک پر کوئی آواز نہ تھی کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر دم لینے کے لئے رکا۔ پھر چپکے چپکے ایک نان بائی کی دوکان پر پہونچ گیا۔ اُس کی دوکان بھی خالی تھی وہاں کوئی گاہک نہ تھا اور مالک دوکان بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کتا خاموشی اور احتیاط سے دوکان پر چڑھ گیا اور قبل اس کے کہ نان بائی اُسے دیکھے وہ ایک روٹی لے کر فرار ہو چکا تھا۔

دو دن کی مسلسل بارش کے بعد میری صبح جب آفتاب پھر طلوع ہوا تو آسمان بالکل صاف تھا اس نے اپنا سیاہ لبادہ اُتار کر پھر خوبصورت نیلگوں لباس پہن لیا تھا۔ خوش نوا طائر اپنے پروں سے رات کی بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے درختوں کی اونچی ٹہنیوں پر آ بیٹھے تھے مغنی بہار نے آج ایک بالکل نیا راگ چھیڑا تھا ساری فضا بہار کے اچھوتے اور شیریں نغموں سے معمور تھی۔ گلاب کے نوخیز غنچوں نے جو تمام رات سہمے ہوئے پتوں اور شاخوں میں چھپے ۔ بے تھے سبز پتوں کے درمیان سے جھانک کر دیکھا۔ صبا جو دیر سے جھاڑیوں میں چھپی کھڑی تھی انھیں

جھانکتا دیکھ پہلے تو ایک ادائے ناز سے آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور پھر شرارت سے انھیں چھیڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ دوشیزہ کلیاں صبا کی اس شوخی سے برہم ہوگئیں ان کے چہرے سُرخ ہوگئے۔ مگر پھر نہ جانے کیا سوچیں کہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں تتلیاں بھی اپنا رنگ برنگی لباس پہن کر ایک رقص پیہم کے لئے آموجود ہوئیں۔ تتلیاں اور پھول، رنگینی اور حسن جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار تھی۔ ہر ٹہنی پر رنگینی جھول رہی تھی۔ مالنیں آج ایک مغرورانہ انداز میں اپنے باغوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کسی بہار میں ان کے باغوں میں ایسے پھول نہ کھلے تھے۔ لیکن وہ غریب پھول بیچنے والی لڑکی ان تمام رنگینیوں اور لطافتوں سے بے خبر پھولوں کی ایک کیاری میں غافل سو رہی تھی۔ اس کا باغ پھولوں سے یکسر خالی تھا۔ ہاں صرف ایک کیاری میں چند مرجھائے ہوئے پھول شاید اس چھوٹی مالن کا ماتم کرنے کے لئے پیدا ہوگئے تھے۔ فطرت کے اس وسیع خزانہ میں شاید ایک غریب لڑکی کے لئے اتنا ہی حصہ مخصوص تھا۔ اس کا جسم پانی اور سردی سے اکڑ کر سخت ہوگیا تھا۔ اس کا وفادار کتا بھی اس کے پیروں میں مردہ پڑا تھا اور اُس کے سامنے وہ روٹی پڑی ہوئی تھی جسے وہ اپنی مالکہ کے لئے چُرا کر لایا تھا اور پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے اس کی شکل بالکل اسفنج کے ایک ٹکڑے کی سی ہوگئی تھی ——— آہ یہ روٹی۔

رضیہ بیگم

محبت یا مجبوری؟

رات کے ۱۲ بجے تھے گلیوں اور بازاروں میں تاریکی مسلط تھی، سڑکیں تقریباً سنسان اور خاموش ہو چکی تھیں۔ خوابیدہ شہر کے اوپر بغیر چاند کے آسمان اپنی سیکڑوں ہزاروں جھلملاتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بڑی دلچسپی اور انہماک سے نیچے کا منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ مکانوں کی بند چھتوں پر سے کبھی کبھار کسی شب بیدار پرندے کی اُڑتی ہوئی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ دنیا اپنے تمام شور و ہنگامے کو بھول کر ایک مرتبہ پھر آغوشِ خواب میں سکون کی متلاشی تھی۔ موت کا سا سنجیدہ سکوت آہستہ آہستہ فضاؤں پر طاری ہو رہا تھا جبکہ "امتیاز منزل" کی بڑی خواب گاہ میں آسیہ نے ایک مرتبہ پھر بے چینی سے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنی ناتوان اور زردی مائل پیشانی کا پسینہ خشک کرتے ہوئے ایک کتاب کا ورق اُلٹا جسے وہ پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک فضول سی ناول تھی اور آسیہ اُسے غیر دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی کمزور کلائی جس پر نیلی نیلی رگیں اُبھری ہوئی تھیں اس طرح کانپ رہی تھی گویا وہ کتاب کے وزن کو بھی نہیں سنبھال سکتی۔ وہ صفحہ پر صفحہ تیزی سے پڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن اگر اُس سے ناول کے ہیرو یا ہیروین کا نام تک پوچھا جاتا تو شاید وہ نہ بتا سکتی۔ پسینہ کے ننھے ننھے قطرے اُس کی پیشانی پر بار بار نمودار ہو ہو جاتے تھے۔ عمیق آنکھوں کے پپوٹے گلابی اور بھاری ہو رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت اعصابی تکلیف میں مبتلا ہے۔

باہر سڑک پر سے گزرنے والے ایک بے فکرے نوجوان کی آواز نے سکوت و خاموشی کے اس طلسم کو ایک دفعہ ہی درہم برہم کر دیا۔ وہ اپنی بھدی آواز میں ایک عامیانہ غزل گاتا ہوا دور نکل گیا۔

گھڑی نے ایک بجایا آسیہ چاہتی تھی کہ اٹھ کر لیمپ کو دھیما کر دے اور سو رہے اگر وہ سو سکے۔ عین اس وقت مقابل کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان (جو کسی طرح بھی اپنی صحت کے لحاظ سے نوجوان نہ کہا جا سکتا تھا) کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک بنڈل لئے ہوئے تھا اور کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی اس کی آنکھوں اور پیشانی کے خطوط میں کچھ اس طرح کا پوشیدہ تبسم پیدا ہوا جو ایک کامیاب ایکٹر کے چہرے پر صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ کسی معمولی اور سہل پارٹ کی تیاری کرتا ہوتا ہے۔ یہ نوجوان آسیہ کا شوہر تھا۔ اور اُسے دیکھ کر آسیہ غیر اختیاری طور پر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "شوہر کا احترام" یہ وہ خوفناک الفاظ تھے جو اُس کے کانوں نے اب تک سُنے تھے اور یہی وہ تنہا چیز تھی جس پر اُس نے سیکڑوں مرتبہ اپنی ماں کو عمل پیرا دیکھا تھا۔ اُس کی پنڈلیاں اُس کے کمزور جسم کے نیچے کانپیں نوجوان آگے بڑھا اور نہایت ہی نرم لہجہ میں مسکرا کر کہا "تم ابھی تک جاگ رہی ہو آسیہ!"

"جی ہاں۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی" آسیہ نے جواب دیا اور پھر یہ سوچنے کے لئے رُک گئی کہ آیا اس کا جملہ ٹھیک تھا یا غلط۔

آسیہ مولوی ممتاز علی کی لڑکی تھی۔ مولوی صاحب شہر کے امیروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی جائداد مکانات کی صورت میں شہر کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس جائداد کو دور اندیشی سے کام لے کر انھوں نے اپنی زندگی ہی میں مساوی مساوی اپنے دونوں لڑکوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک لڑکی آسیہ کے "فرض" سے بھی وہ سبکدوش ہو چکے تھے دوسری بچی سلمیٰ ابھی چھوٹی تھی تاہم امید تھی کہ اُس کا بیاہ بھی "اچھی جگہ" طے پا جائے گا۔

آسیہ نے اپنے گھر پر وہی تعلیم پائی تھی جو عموماً "شریف لڑکیوں" کو دی جاتی ہے۔ اُردو لکھنا پڑھنا معمولی فارسی قرآن مجید اور مسئلے مسائل کی چند کتابیں۔ یہ تھا جو اُس نے درس کے طور پر پڑھا تھا۔ اس کے بڑے بھائی احمد نے اسے تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھائی تھی "احمد تو اس کے پیچھے دیوانہ ہے" اُس کی والدہ اپنی ملنے والیوں میں اکثر کہا کرتیں "تمھیں نہیں معلوم بہن اُسے اُس سے کتنی محبت ہے اور کتنی محبت سے وقت نکال کر پڑھاتا ہے" اب یہ دوسری بات تھی کہ احمد اپنی بہن کو سبق پڑھاتے وقت کم از کم چار پانچ مرتبہ ضرور "کُند ذہن" کہنے کا عادی تھا اور یہ بات بالکل فطری

اور لازمی تھی کہ اُسے پڑھاتے پڑھاتے غصہ آجائے ۔۔ اب اتنا بھی نہ کرے گا کیا "بیگم ممتاز علی بڑے غرور سے کہا کرتیں۔ آخر مرد بچہ ہے ۔"

آسیہ کا شوہر ممتاز بھی ایک خوشحال خاندان کا نور نظر تھا۔ اُس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور ضعیف ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ تھوڑی بہت جائداد وغیرہ بھی جو کچھ تھی سب امتیاز ہی کے نام کی تھی تعلیم سے فارغ ہو کر اُس نے کوئی خاص کام نہیں اختیار کیا تھا "اس کو ضرورت بھی کیا ہے "اس کی ماں اپنی ہم چشموں میں کہا کرتیں "اللہ کے فضل سے جو کچھ ہے اُسی کا ہے اطمینان سے بیٹھ کر کھائے بلکہ دو چار کو اور کھلائے "

آسیہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک ذہین طباع اور بیحد حساس لڑکی تھی گو یہ درست ہے کہ اس کی تعلیم بالکل معمولی قسم کی ہوئی تھی تاہم اُس کے بڑھے ہوئے شوق مطالعہ نے اُسے ایک خاص بلندی خیال بخش دی تھی۔ اُس کے خیالات اور تخیلات میں ایسی بیباکی اور آزادی پیدا ہوگئی تھی جس کا اس کی متعدد ملنے والیوں میں فقدان تھا اس کی قوتِ حس روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ زندگی کے خوبصورت اور شاندار افسانے جو اُس نے کتابوں میں پڑھے تھے اُس کے دل سے کسی طرح بھلائے نہ بھولتے تھے۔ وہ ہر وقت ایک خوشگوار زندگی کے تصور میں کھوئی رہتی لیکن جب کبھی اُس کی نظر غیر اختیارانہ خود اپنی موجودہ زندگی پر پڑتی تو اُس کی سنسان یکسانیت اور یک رنگی اُسے بیچین و مضطرب کردیتی۔ وہ اپنی روح میں اس شخص کا سا اضمحلال محسوس کرتی جو موسم گرما میں ایک دلچسپ کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو اور ایک باغ کی رنگین اور تروتازگی کا منظر اس کے پیش نظر ہو کہ یکایک اس کی نظر کھڑکی سے باہر اپنے سوکھے ہوئے باغیچہ پر جا پڑے۔ یا پھر اس کی کیفیت اس بچہ سے مشابہ ہوتی جو کہ ایک رنگین تتلی کے تعاقب میں سرگرداں ہو اور دفعتاً اپنے ہاتھ میں ایک سیاہ اور خوفناک بھونرے کو محسوس کرے۔ زندگی جس کے متعلق اس نے متعدد جگہ پڑھا تھا کہ موسم بہار کے پھولوں کی طرح خوبصورت ہے اس کے لئے موسم خزاں کی جھڑی ہوئی زرد پتیوں سے زیادہ غیر دلچسپ اور غیر اہم تھی۔ وہ اسے محسوس کرتی اور افسردہ خاطر ہو جاتی۔ پھر اگر احساس محرومی کسی وقت تیز ہو جاتا تو اُس کی سنجیدہ اور گہری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں۔ آہ کیا واقعی زندگی کے مشہور عالم نازک خیال معمار نے اسے اسی طرح تعمیر کیا تھا؟ کیا اس حیرت کدہ عالم میں تمنائے محبت و مسرت ایک بے معنی تمنا ہے ؟

امتیاز عموماً رات گئے گھر آنے کا عادی تھا دن کو بھی وہ زیادہ تر اپنے دوست احباب کی صحبت میں باہر ہی رہتا۔

اُس کے اس انداز کے متعلق اُس کی والدہ پڑوسن سے کہا کرتیں کہ بوا جوانی کا زمانہ بے فکری ہے۔ اب کھیل کود اور ہنسی مذاق میں دل نہ بہلائے تو اور کیا کرے۔" اور ان کا یہ خیال درست بھی تھا۔ مگر آسیہ کے ہنسی مذاق اور کھیل کود کا زمانہ گزر چکا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اصلی معنوں میں اس کے لیے یہ دور کبھی آیا ہی نہیں۔

نوجوان شوہر نے جب اُس کے جاگتے رہنے پر اس کا شکریہ ادا کیا تو اُسے ایک موہوم سی مسّرت کا احساس ہوا۔ امتیاز نے اُسے محسوس کیا اور ریاکاری برتتے ہوئے مسکرا کر کہا "میں تو سمجھا تھا کہ تم سو گئی ہوگی کیونکہ مجھے آج معمول سے کسی قدر زیادہ دیر ہوگئی"۔ آخر کا فقرہ بہت ملائم آواز میں کہا گیا تھا جس پر آسیہ کا بیتاب محبت دل مضطرب ہو گیا اور وہ محبت کئے جانے کے مغرور کن تصور سے مسحور ہو گئی۔ ابھی ابھی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ "باغیانہ خیالات" سے اس کا دماغ پُر تھا مگر اب امتیاز کی موجودگی میں جب اُس نے ان خیالات پر نظر ڈالنا چاہی تو وہ خود بخود شرما سی گئی۔ ایک ہلکی سی سُرخی اس کے کانوں کے پاس سے پھیل کر اُس کے رخساروں پر چمک اٹھی۔

"کیا تم بتا سکتی ہو آسیہ میں اس وقت تمہارے لئے کیا لایا ہوں؟" اس کے شوہر نے دفعتاً سوال کیا اور قریب بیٹھ کر مغرورانہ اُس بنڈل کو کھولنے لگا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ "میں کیسے بتا سکتی ہوں" مسکرا کر آسیہ نے کہا اور بے چینی سے بنڈل کی طرف دیکھنے لگی۔ بنڈل کے اندر ایک ساری تھی ایک نہایت ہی نفیس خوبصورت اور قیمتی ساری اور اسی کے ساتھ کا بہترین خوش وضع بلاوز۔ مسرت سے آسیہ کا زرد چہرہ چمک اٹھا اس کے خشک لبوں پر تازگی پیدا ہو گئی۔ ساری کا رنگ کسی قدر گہرا تھا جسے آسیہ بہت زیادہ پسند نہ کرتی تھی مگر اُس نے اپنا یہ خیال ظاہر کرنے کی جرات نہ کی وہ اچھی جانتی تھی کہ اُس کے "ان داتا" کو یہی رنگ بہت پسند ہے۔"

"شکریہ" آسیہ نے مسکرا کر ساری کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اور عقلمند تعلیم یافتہ شوہر نے اس زرین موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اُس نے فوراً ہی کہا "نہیں آسیہ شکریہ تو اجنبیت کو ظاہر کرنے والا لفظ ہے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ ساری تم پسند کرو گی اس لئے لیتا آیا۔ اور تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں" آسیہ کے دل میں ایک پوشیدہ احساس مسرت آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا جبکہ نوجوان نے اس کی رومان پسند روح کا خیال نہ کرتے ہوئے ایک انگڑائی لی اور یہ ظاہر کیا کہ اُسے سخت نیند آ رہی ہے اور واقعہ بھی در اصل یہی تھا۔

اس کے ۱۵ منٹ بعد ہی امتیاز کے تیز اور بھاری تنفس کی آواز مسہری کے پردوں کے اندر سے آ رہی تھی وہ

بےخبر سو رہا تھا جبکہ آسیہ آنکھیں کھولے بیخواب پڑی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ ساری اور بلاوز کا خوشنما تصور اُس کی نگاہوں کے سامنے سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں نہ تھی جن کو ریشمی کپڑوں کی نرمی اور جھلکتے ہوئے زیورات کی نزاکت سے بہلایا جا سکتا ہے۔ یہ قیمتی ہر ایا اسے وہ نہ دے سکتے جس کی تلاش اس کی روح کو بیگانۂ سکون کئے ہوئے تھی۔ وہ متلاشی تھی محبت کی ایک نرم و ملایم نگاہ کی جبکہ اُسے ساری سے خوش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ چاہتی تھی احساس رفاقت کی ہلکی سی گرمی کو جبکہ اُسے مہذب الفاظ اور طرز گفتگو کی شائستگی سے لاجواب کر دیا گیا۔ وہ متمنی تھی یگانگت کی رازدارانہ گفتگو کی جبکہ مصنوعی تبسم اور بناوٹی مسکراہٹ سے اس کی ہر تمنا کو خاک میں ملا دیا گیا۔ پھر وہی "باغیانہ خیالات" اُس کے دل میں جاگزیں ہو رہے تھے۔ آج صبح سے وہ شدید درد میں مبتلا تھی۔ اور یہ بات اس کی نگاہیں صاف بتلا رہی تھیں اس کی پیشانی کا پسینہ کہہ رہا تھا کہ وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے کنپٹی کی اُبھری ہوئی نیلی رگیں بتلا رہی تھی کہ اس کے دماغ کی ایک ایک رگ بُری طرح کھنچ رہی ہے مگر اتیانہ ــــــ "وہ آیا ـــــ اُس نے دیکھا ــــــ وہ سو گیا ــــــ" اس کے دل میں ایک آگ سی لگی محسوس ہو رہی تھی وہ تمام ان باتوں کو سوچ رہی تھی جو خود اُسے ناقابل عمل نظر آ رہی تھیں۔ آہ اے طاقتور ہستی جو اپنے کو اس قدر کمزور سمجھنے کی عادی ہو گئی ہے۔ خواہش انتقام اس کے مضطرب سینے میں بیتاب تھی اور خواہش محبت کے بعد یہی وہ تنہا خواہش ہے جسے عورت اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ خواہش متعدد پردوں میں پوشیدہ رہتی ہے اور اکثر زندگیاں گزر جاتی ہیں اور خود خواہش کرنے والا اپنی اس خواہش کی اصلیت اور اہمیت سے ناواقف رہتا ہے لیکن ہر چیز کے لمحے ہوتے ہیں ایسے لمحے جو انسان کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتے ہیں اور پھر آزاد نہیں کرتے محبت کے لمحے غمگین ہونے کے باوجود اپنے اندر خدا کی برکت کا سا سکون رکھتے ہیں پیغمبروں کی ہدایات و تعلیمات کی طرح مطمئن کن اور پاک ہوتے ہیں۔ انتقام کے لمحے عموماً کامیاب ہوتے ہیں مگر خطرناک ــــــ ان لمحوں کی زندگی میں طوفان کا سا جوش و خروش ہوتا ہے بعض وقت وہ انسان کو ایک پُرجوش سمندر کے مانند بنا دیتے ہیں جو ہر چیز کو تباہ و تاراج کر دیتا ہے۔ ہر شے کو بہائے جاتا ہے اور مٹا دیتا ہے سوائے اپنے وجود کے۔

یہی لمحے بعض وقت آدمی کو خس و خاشاک کے اس انبار کے مانند بنا دیتے ہیں جو جل رہا ہو اپنے وجود کو خود اپنی ہی آگ میں جلا رہا ہو تاہم ہر اس چیز کو جو اُس کی لپیٹ میں آجائے جلانے کی بھی قدرت رکھتا ہو وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا

جبکہ آسیہ نے ایک آزادانہ مسکراہٹ سے حقارت کی ایک نظر امتیاز پر ڈالی حیف ہے ان سوتے ہوئے انسانوں پر جو ان لمحوں کی ہستی سے بے خبر ہیں اور ان کے خطرناک وجود سے ڈرتے نہیں۔

مہینوں گزر گئے مگر آسیہ اپنے جذبۂ انتقام میں طوفانی جھلک نہ پیدا کر سکی۔ اُس کے لحۂ انتقام کی نوعیت جداگانہ تھی وہ ایک شعلہ بن چکی تھی لیکن جس چیز کو وہ جلانا چاہتی تھی وہ اس کی دسترس سے باہر تھی۔ وہ خود اپنے ہی شعلہ میں جلی جا رہی تھی اور بس۔

عین اس وقت جبکہ وہ تبسم برلب اور محبت برجبیں امتیاز کا استقبال کرتی ہو تو اس کے دل میں ایک ناقابل برداشت جذبۂ نفرت و حقارت پوشیدہ ہوتا اس کا دل کراہیت اور غصہ کے شدید احساس سے لبریز ہوتا جبکہ وہ امتیاز کے فریبانہ جملوں کا مسکرا مسکرا کر نہایت ہی نرمی سے جواب دے رہی ہوتی۔

دنیا کی اسٹیج پر وہ زندگی کا ایکٹ نہایت ہی خوبی سے ادا کر رہی تھی۔ وہ ایک پارٹ کھیل رہی تھی جس کی نزاکت اور اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ اور کون حساب لگا سکتا ہے ان عورتوں کا جو اس قسم کا پارٹ کرنے پر مجبور ہیں؟ وہ بھی مجبور تھی۔ زندگی کی ان سانسوں کے لئے جس میں مسرت کی کوئی جھلک باقی نہ تھی وہ اپنے آپ کو امتیاز سے علیحدہ نہ کر سکتی تھی۔

کیا اچھا ہوتا اگر ہر شخص اپنی موت پر نہ سہی کم از کم اپنی زندگی پر قادر ہوتا، اس نے اس رات سوچا —— لیکن دوسرے دن اس نے اپنی خوشدامن صاحبہ کو ایک عورت سے یہ کہتے سنا کہ "یہ بچی بھی میرے امتیاز سے بہت محبت کرتی ہے"، تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، وہ ایک لمحہ کے لئے ساکت ہوگئی اور اس عجیب و غریب اظہار خیال پر غور کرنے لگی۔ محبت یا مجبوری؟ یہ دو الفاظ ایک افسانہ کے عنوان کی طرح اس کے پیش نظر ہوگئے۔

رابعہ بیگم

اُردو ادب کے مرکز

سب سے پہلا مرکز جہاں زبان اُردو نے ارتقا حاصل کیا پنجاب ہے۔ جہاں تقریباً دو سو سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن اس اثنا میں یہ زبان پنجاب اور اس کے گرد و نواح سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جب مسلمانوں نے پہلے پہل پنجاب میں قدم رکھا تھا تو اُس زمانہ میں پنجاب سے لیکر اودھ تک ایک ہی زبان بولی جاتی تھی رفتہ رفتہ پنجاب میں مسلمانوں کے اثر نے ایک اور زبان بنائی۔ چونکہ حکومت اور تقریباً تمدن بھی اس خطہ ملک کا جدا ہو چکا تھا اس لئے گنگا جمنا کے دوآبے والے زبان کے اس ارتقا سے ناآشنا رہے۔ مسعود سعد سلمان اسی زمانے کے اُردو شاعر ہیں جن کا کلام اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔

دوسرا مرکز دلّی رہا۔ جب محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو پنجاب کے سارے اہل علم و ادب دلّی پہنچ کر چلے آئے اور اب اس زبان نے ایک نئی فضا دیکھی۔

ہندوں اور مسلمانوں کا ربط ضبط بڑھا۔ دہلی کے مفتوح باشندے برج بھاشا بولتے تھے اور لنو وارد فارسی یا وہ ہندوستانی جو پنجاب میں بنی تھی۔ جیسا کہ مفتوح اقوام کا خاصہ ہے یہ بھی اپنے فاتح کی زبان سیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ جو ہندو سرکار اور دربار میں رسوخ چاہتے تھے وہ کوشش سے فارسی سیکھتے۔ بولتے چالتے بلکہ لکھتے پڑھتے بھی اسی

زبان میں تھے۔ راجہ ٹوڈرمل نے تو اکبر کے زمانے میں یہ بھی حکم دے رکھا تھا کہ سرکاری ملازمتوں کے لئے ہندوؤں کے لئے فارسی کا اور مسلمانوں کے لئے برج بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب کوئی نئی اور خصوصاً حاکم کی زبان سیکھتا ہے تو اپنی زبان میں اس کے الفاظ شوق اور فخر سے استعمال کرنے لگتا ہے (جیسے آجکل مسلمانوں کا حال ہے) لیکن دوسرے کی زبان بہت احتیاط سے بولتا ہے تاکہ کہیں اس کے اپنے محاورے اور اسلوب کے داخل ہو جانے سے وہ زبان دانی کی سند سے محروم نہ رہ جائے۔ الغرض دلی میں یہ زبان جو ایک مخلوط زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی پھولنے پھلنے لگی۔ لیکن فارسی کے اثرات اس پر ہمیشہ غالب رہے کیونکہ آئے دن فارسی داں شمال سے آتے رہتے تھے۔ یہ حال عہد محمد شاہ تک جاری رہا احمد شاہ درانی کے حملے کے بعد کچھ فارسی گو رہ پڑے نادر شاہ کی یادگار کچھ باقی رہ گئے۔ پھر نئے شعرا کا ورود جیسے۔ اسیر طالب۔ کلیم عرفی وغیرہ وغیرہ اور یہی وجہ تھی کہ جس نے شمالی ہند میں زبان اردو کو ہمیشہ فارسی سے متاثر رکھا۔ وہاں کے شعرا تقریباً سب کے سب فارسی گو تھے اور انھیں اپنی فارسی دانی پر ناز بھی تھا۔ اردو کے استعمال کرنے والے یا تو شاعر تھے جو کبھی تفنن طبع کے لئے اردو میں کلام موزوں کر لیتے ہندی شاعری گویا تبدیل ذائقہ تھی کہ جب فارسی سے جی اکتائے تو ایک دو شعر اس نئی زبان میں کہہ لئے زیادہ وہ لوگ تھے جنھیں ہندوؤں سے ربط ضبط رکھنے کا شوق تھا تیسرے روزمرہ کی ضرورتیں اس کی محرک تھیں۔ چوتھے مبلغین اور صوفیائے کرام کا گروہ تھا جو صلح کل ہونے کے علاوہ ہر قوم تک اپنا فیض پہنچانا چاہتا ہے۔ اور چونکہ ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ ان کے آستانے پر حاضر ہوتے ہیں اور وہ بلا لحاظ مذہب ملت سب کو فیض پہونچاتے ہیں یہی وجہ تھی کہ صوفیائے کرام نے اردو کے بنانے میں خاص حصہ لیا۔ اردو میں سب سے قدیم اقوال انہیں بزرگوں کے ہیں جو کتب سیر اور تذکروں میں پائے جاتے ہیں یا ان کے مریدوں یا معتقدین نے انہیں نہایت احتیاط سے سینہ بہ سینہ محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہونچایا۔ چنانچہ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اردو یا ہندی میں گفتگو کی اگرچہ کوئی قول موجود نہیں، شیخ فرید الدین گنج شکر کی چند ہندی نظمیں ملتی ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا نے بھی ہندی راگ کی بہت سرپرستی کی ہے جس نے خسرو شیریں مقال کو ہندی شاعری کا چسکا لگایا۔ آپ سماع کے بڑے شائق تھے اور آپ کے مرید حضرت امیر خسرو مرشد کی خاطر ہندی کلام موزوں کیا کرتے تھے چنانچہ آپ کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔[۵]

موری نینوں سے نیناں ملائے سکھی من موہ لیو مورا شام ہری
مورے من میں لبو مورا شام کنہیا میں کا ہے پھروں نگری نگری

حضرت شیخ حمید الدین ناگوری اور حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے بھی بعض اقوال ہندی میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) **گجرات اور دکن** - پنجاب کی آئی ہوئی زبان دہلی میں سو سال سے بھی کم نہ رہ سکی ہو گی کہ گجرات اور دکن پہونچی۔ علاء الدین خلجی اور ملک کافور کی ترکتازے دکن اور گجرات دونوں میں اردو داں افراد چھوڑے۔ پھر گجرات میں علاء الدین کے صوبہ داروں کی وجہ سے اور دکن میں پہلے محمد تغلق کی مہربانی اور پھر علاء الدین حسن گنگو کے طفیل یہ زبان رواج پانے لگی اور ہر دو مقامات پر اس نے بہت عروج پایا اور بہت سی تصنیفات اس زبان میں لکھی گئیں۔

دکن کے صوفیائے کرام کے بہت سے قدیم ملفوظات بیاضوں میں محفوظ ہیں۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ۔ حضرت گیسو دراز وغیرہ دکن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گجرات میں سید شاہ ہاشم حضرت قطب عالم شیخ بہاؤ الدین باجن۔ شیخ خوب محمد چشتی۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی نے اول اول اس زبان میں اقوال اور تصانیف چھوڑیں گجرات پر راجستانی علاقہ کا اثر پڑا مگر دکن پر ڈراوڑی زبانوں کا اثر زیادہ نہ پڑ سکا کیونکہ دو ایک دوسرے خاندان السنہ سے تھیں۔ یہاں اس زبان نے خاصا فروغ پایا اور متعدد شاعر و ادیب پیدا کرلئے۔

(۴) **آگرہ** - جب اکبر نے مظفر شاہی سلطنت کا گجرات میں خاتمہ کر دیا اور آگرہ کی بود و باش اختیار کی تو گجرات سے مرکز اردو آگرہ میں منتقل ہو گیا۔ اور یہاں اردو نے گوالیار کا اثر لیا۔

(۵) **دہلی** - پھر شاہجہاں بادشاہ نے اپنے ذوق عمارت سازی کے لئے دہلی کو منتخب کیا کروڑوں ماہران فن ملک کے گوشہ گوشہ سے آکر دہلی میں جمع ہوئے تو وہاں ہر قوم و زبان کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع ہو گیا چنانچہ لازمی طور پر اب دلی پھر اردو زبان کا مرکز بن گئی۔ ادیب اور شاعر یہیں تھے یہیں کے صاحبان قلم کی زبان مانی جاتی تھی اور دلی ہی کئی صدیوں تک اردو۔ ہندی۔ یا ہندوستانی زبان کا مرکز سمجھی جاتی رہی۔ جب گولکنڈہ کی سلطنت فتح کرلی گئی تو وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی پہونچا دیئے گئے۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ اور اس کی مدتوں کی خواہش تھی کہ گولکنڈہ کی ریاست کو فتح کر کے رمالی دکیونکہ یہ ایک بہت ہی دولتمند سلطنت سمجھی جاتی تھی اور یہاں ہیرے کی کانیں تھیں) اور علمی خزانوں سے مالا مال ہو۔ الغرض جب وجہی۔ ابن نشاطی۔ غواصی وغیرہ وغیرہ دکنی مصنفین کی تصنیفیں دہلی پہونچیں تو دہاں کے ادیب اور انشا پرداز اور شاعر اور نثار دنگ رہ گئے اور انھوں نے اس وقت جانا کہ وہ بولی بھی جو وہ اس تک صرف مذاق اور دل بہلائی کے لئے استعمال کرتے تھے علمی زبان

بن سکتی ہے اور اسی میٹھی اور سادی بولی میں دکنی شعرا نے کیسے کیسے جواہر پارے اور شاہکار بنائے ہیں۔ جب دکنی شعرا انتزاع سلطنت گولکنڈہ کے بعد دلّی پہنچے اور اپنا کلام سنایا تو انہوں نے وہاں والوں میں ایک نئی روح پھونکی خصوصاً ولی اورنگ آبادی کے دیوان نے دہلی کے شعرا میں اپنی تقلید کی تحریک پیدا کی اور شمالی ہند والوں نے صرف دکنی شعرا کی تقلید میں اردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا اور اردو کو علمی زبان بنانے کی کوشش کی۔ حاتم۔ آرزو۔ آبرو۔ ناجی فغاں۔ مضمون۔ مظہر۔ یکرنگ وغیرہ نے ولی سے فیض حاصل کیا اور باوجود چند کوتاہ خیالوں کے ناک بھوں چڑھانے کے ان کا کلام اتنا مستند اور استادانہ سمجھا گیا کہ پیرخاں کمترین نے کھلم کھلا کہہ دیا" ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں" لیکن رفتہ رفتہ دلّی والوں کو احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنے ملکی محاورات، اسلوب بیان، استعارات وغیرہ سے بہت دور جا پڑے ہیں اور ایک ایسے ملک والوں کی پیروی کر رہے ہیں جو ان کی اپنی معاشرت۔ روایات وغیرہ سے بالکل مختلف ہے۔ تو مظہر جان جاناں سب سے پہلے اس بات کے محرک ہوئے کہ شاعری ٹھیٹ شاہجہاں آباد کی زبان میں کی جانی چاہئے اور جہاں تک ہو سکے اپنے ملکی خیالات مناظر اور معاشرت و روایات کی ترجمانی کرنی چاہئے اول اول تو ان کی سخت مخالفت کی گئی لیکن آخر کار ان کی یہ تحریک چل پڑی اور دہلی والوں نے اپنا ایک الگ ڈگر قائم کر لیا جس پر وہ مدتوں قائم رہے۔

(۶) **لکھنو**۔ جب دہلی کی سلطنت میں زوال آنے لگا اور لکھنو میں ایک مستقل سلطنت قائم ہوئی شاہان اودھ کو علم دوست دیکھ کر دہلی صاحبان علم و فن سے خالی ہوئی اور لکھنو کے گلی کوچے آباد ہونے شروع ہوئے۔ شاہان اودھ مذاق سخن اور ذوق ادب رکھتے تھے۔ لیکن مصیبت یہ پیش آئی کہ بمصداق "جس کا کھائے اسی پر غرائے" اگرچہ دہلی کے شعرا اور صاحبان سخن انشا۔ جرأت۔ مصحفی وغیرہ وغیرہ لکھنو کی سرکار سے پلتے تھے لیکن میں پن نہ گیا اپنی زبان کو سراہتے اور لکھنو والوں کو بناتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنو والوں نے ایک اپنا دبستان الگ کھول لیا۔ انھوں نے زبان کو مانجا اور حقیقت یہ ہے خوب مانجا۔ محاورے چست اور اسلوب درست کئے۔ زبان میں شگفتگی اور رنگینی پیدا کی۔ مذکر و مونث اور واحد جمع کے قواعد بنائے۔ برج بھاشا کا اثر زائل کیا۔ چنانچہ وہ ہو ہوا اور ہووت ہوتیاں جو دہلی کا خاصہ تھا مٹا دیا جیسے میر تقی میر کہتے ہیں:-

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو   ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — چنیدہ منتخب ہی رہتے تھے واں روزگار کے
اسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اور اس کے عوض پوچھتے ہو۔ پوچھتا ہوں۔ پوچھتی ہیں۔ پوچھتی ہے بنایا۔ اب لکھنؤ اردو زبان کا مرکز اور وہاں کی زبان سند سمجھی جانے لگی یہانتک کہ لکھنوی شعراء کے سند کے بغیر زبان ناقص سمجھی جاتی تھی۔ ناسخ وغیرہ سے قواعد وغیرہ کے متعلق پوچھا جاتا تھا۔

(۷) حیدرآباد۔ دکن صدیوں پہلے بھی اردو زبان کا گہوارہ تھا بہمنی سلطنت کے بادشاہ خود زبان کے سرپرست تھے۔ انتزاع سلطنت کے بعد جب اس کے ٹکڑے ہو گئے تب بھی گولکنڈہ اور احمد نگر کی سلطنتیں اس زبان کی سرپرست رہیں۔ اور جب گولکنڈہ کی شہزادی شہربانو خجستہ سلطانہ بیجاپور کے بادشاہ سے بیاہی گئی تو وہاں بھی اس نے اپنے ذوق علم و سخن سے مجبور ہو کر اعلان کیا کہ جو کوئی ادیب یا شاعر اردو زبان میں کتاب اور کلام تصنیف کر کے سرکار میں پیش کرے گا مستحق انعام کا ٹھہرے گا۔ ملک خوشنود درباری شاعر ملک الشعرا تھا الغرض ایک شہزادی کے دم سے بیجاپور میں بھی علم و ادب کے چرچے ہونے لگے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی وہ نہایت پرانی اور نایاب کتابیں جو لوٹ کر دہلی پہونچائی گئیں اب بھی انڈیا آفس کے کتب خانوں اور انڈیا میوزیم وغیرہ میں محفوظ ہیں۔

شمس الامرا نواب فخر الدین خان بہادر پہلے شمس الامرا تھے جنہوں نے علمی کاموں میں دلچسپی لی انھیں ہیئت اور ریاضی سے خاص دلچسپی تھی۔ صاحبان سخن کی قدر و منزلت دیکھ کر اسی زمانے سے شمالی ہند کے ارباب ادب حیدرآباد آنے لگے چنانچہ شاہ نصیر بھی انھی میں کے ایک تھے۔ شمس الامرا کے حلقہ میں بہت سے علمی اور ادبی کام کئے گئے انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دوسرے شمس الامرا نواب رفیع الدین خان بہادر کو علم طبیعات اور کیمیا سے خاص لگاؤ تھا اور ان کے وقت میں اس مضمون پر معلومات فراہم کئے گئے تیسرے شمس الامرا نواب رشید الدین خان بہادر کو تاریخ سے دلبستگی تھی خورشید جاہ بہادر کو بھی تاریخ مرغوب رہی۔ الغرض اس انجمن کی وجہ سے بہت سی اصطلاحات خصوصاً قانون کی اور نئے نئے الفاظ بنے۔

(عصر جدید)

پنجاب

پنجاب یہاں مذہبی مناظروں اور بحثوں نے خوب کام کیا جس میں سید احمد۔ مومن خاں۔ مولانا اسماعیل شہید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل فارسی آلہ کار تھی لیکن یہ ساری مذہبی بحثیں اور تبلیغ کی کوششیں اردو میں ہوئیں اور اس نے ایک خاصہ ذخیرہ رسائل۔ مضامین۔ مقالوں اور کتابوں کا اردو زبان میں مہیا کر دیا۔

اب پنجاب اپنی صحافتی ترقیوں کے لئے مشہور ہے۔ اس کے رسالے میگزین دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ لکھائی اور چھپائی جیسی اچھی اور نظر فریب اس جگہ ہوتی ہے ہندوستان بھر میں اور کہیں نہیں ہوتی۔

حیدرآباد

حیدرآباد آجکل اردو زبان کا مرکز ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے دور دور تک شہرت حاصل کی ہے فرزندان جامعہ نے چشم بددور دہ نام اور کام کیا ہے اور کر رہے ہیں جو یادگار رہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ دارالترجمہ نے بھی زبان کی بہت مفید اور قابل قدر خدمتیں کی ہیں جس کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ حیدرآبادی ارباب ادب اور صاحبان علم نے بہت سی قابل قدر تصنیفیں کی ہیں جو ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں اور بہت تحقیق اور تدقیق سے اردو زبان کی خصوصیات اور آغاز و ارتقا پر غور و خوض کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

الہ آباد

الہ آباد بھی ایک مرکز اردو ہے وہاں کی ہندوستانی اکاڈیمی خاص طور پر قابل ذکر ہے جو سرکار نے علمی خدمات کے لئے قائم کی ہے اور جہاں علمی کام انجام پا رہا ہے۔

لکھنؤ

لکھنؤ بھی ایک مرکز ہے ۔ یہ اعظم گڈھ کے دار المصنفین کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے ۔

دلّی

دلّی اپنے اس مشہور علمی ادارہ کی وجہ سے نام کما رہی ہے جو جامعہ ملیہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کی کوششوں نے اردو میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکدی ہے ۔

آگرہ

سیماب اکبرآبادی کی کوششوں کی بدولت یہاں کا اسکول بہت کامیاب ہو رہا ہے ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آگرہ کو مرکز ادب ہندوستان بنا کر رہیں گے اور یہ بھی کہ اردو وہیں کی پیداوار ہے اور وہیں رہے گی ۔

لطیف النسا بیگم بی ۔ اے (عثمانیہ)

صالحہ

صالحہ میرے بچپن کی ساتھی تھی - اسکول سے گذر کر اب ہم کالج میں پڑھ رہے تھے۔ صالحہ کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جسے بہت زیادہ تہذیب یافتہ کہنا چاہئے۔ اسی لئے وہ پردہ وغیرہ کی کچھ زیادہ قائل نہ تھی اور اپنے صنف کی مجبوریوں کو ٹھکرا دینا چاہتی تھی۔ اسے ادب کا بڑا اچھا ذوق تھا متقدمین میں وہ میرؔ کی پرستار تھی مگر موجودہ دور کے غزل گویوں کو وہ ناپسند کرتی تھی۔ وہ حالیؔ کو سب سے بڑا شاعر سمجھتی تھی جس نے "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" میں سماج کی اس مظلوم مخلوق پر آنسو بہائے ہیں۔ وہ مردوں سے بدلہ لینا چاہتی تھی" ,, ,, وہ مرد کی ہر مصیبت پر ایک قہقہہ لگانے کی آرزومند تھی۔ وہ ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتی کہ کوئی مرد اس کے پھندے میں پھنسے اور وہ اسے تڑپا تڑپا کر نیم جاں بنادے اب تک کئی مردوں کو وہ اپنے ظلم کا شکار بنا چکی تھی، ذیل کا واقعہ بھی ان ہی واقعات کی ایک کڑی ہے جسے صالحہ نے خود اپنے قلم سے لکھا ہے۔

"میں نے اپنا ایک مضمون رسالہ شمیم کے مدیر کی خدمت میں بھیجا۔ مضمون کا عنوان "عورت کی مصیبت" تھا۔ اسمیں میں نے اپنے ہی معتقدات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی مجھے امید نہیں تھی کہ یہ مضمون چھپ بھی سکے گا۔ اس میں میں نے مردوں پر خوب لے دے کی تھی۔ مگر دوسرے ہی دن مدیر صاحب کا یہ خط مجھے ملا:-

محترمہ ... آپ کا مضمون پہنچا۔ یہ اتنا بلند ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جو اس کی تعریف کر سکوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مرد کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ مجھے اپنے ہی خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی

صنف کے لئے آپ کی یہ جد وجہد خدا کرے کہ کامیاب ثابت ہو۔ آپ کا یہ مضمون شمیم کی تازہ اشاعت کا حاصل ہے۔ اُمید ہے کہ آیندہ بھی آپ اسی طرح لطف وکرم فرماتی رہیں گی۔"

یہ اس کا پہلا خط تھا۔ اس کے بعد اس نے خطوط کا تانتا باندہ دیا۔ وہ خط لکھنے کے بہانے ڈھونڈتا۔ مگر میں بھی جوابات میں اس کے خوب ہی حوصلہ بڑھاتی رہی۔ اس کے تحریر کا انداز بالکل رسمی ہوتا۔ وہ کسی جرأت کے اقدام پر گھبراتا نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی اپنی طرز کو بہت ہی سنجیدہ بنا رکھا تھا۔ اسے خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ میں اسے بنا رہی ہوں آخر اس نے تنگ آکر لکھدیا۔

"صالحہ پیاری۔ (مخاطبت کی یہ جرأت امید ہے کہ معاف کی جائے گی) میرے اور آپ کے درمیان کی اس کاروباری گفتگو سے میں تنگ آگیا ہوں اب خدا کے لئے زیادہ نہ ستائیے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں اس کی یہ تحریر پڑھ کر بہت خوش ہوئی۔ رات بھر میں اس مردود کے خلاف پلاٹ سوچتی رہی۔ دوسرے دن میں نے اسے لکھا۔

"مدیر محترم۔ آپ کی تحریر نے میری بھی امنگوں کو اکسا دیا۔ میں بھی آپ سے ملنا چاہتی تھی۔ آپ ہی کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ ہماری ملاقات بھی ہوجائے اور یہ راز بھی کسی پر فاش نہ ہو۔"

اس نے جواب میں یہ تحریر بھیجی۔

"آپ کے خط نے میری زندگی کی ناامیدیوں کو خوشگواریوں میں بدل دیا ہے میں کل رات حسین ساگر پر اپنا دل آپ کے قدموں پر ڈال سکوں گا۔ آپ بھی ۹ بجے تک آجائیے۔"

میں رات بھر غصہ سے دانت پیستی رہی۔ صبح میں نے اسے لکھ بھیجا۔

"حسین ساگر پر میں نہیں آسکوں گی، وہاں تفریح کرنے والوں کا ایک ہجوم رہتا ہے۔ آپ اسی وقت میر عالم تک زحمت فرمائیں تو میرے دل کی دنیا آباد ہوجائیگی اور میری بہت دنوں کی آرزو پوری ہوجائے گی۔"

میں نے آرزو پوری ہونے کا سامان پہلے ہی سے مہیا کرلیا تھا۔ میں حامد بھائی کو ایک ایک خط دکھا چکی تھی۔ وہ بھی اپنے ایک دوست کے ساتھ مدیر صاحب کی پیشوائی کے لئے تیار تھے۔ غرض وقت مقررہ پر میر عالم کی پرسکون فضا میں یہ ہوا کہ مدیر محترم نے اپنا دل میرے پیروں پر تو نہیں مگر ہاں اپنا سر حامد بھائی کے قدموں پر ڈال دیا اور میری بہت دنوں کی آرزو پوری ہوگئی۔"

خورشید سلطانہ

شیخ چاند مرحوم

شیخ چاند مرحوم سکندر علی وجد

شیخ چاند مرحوم کی وفات .. .. سید محی الدین قادری زور

شیخ چاند مرحوم کی تصنیفات .. .. عبدالقادر سروری

آہ شیخ چاند .. .. بدر شکیب

شیخ چاند مرحوم سے .. .. میکش

شیخ چاند مرحوم .. .. اشفاق حسین

شیخ چاند مرحوم .. .. سید محمد ایم-اے

شیخ چاند مرحوم .. .. صدیق احمد خاں

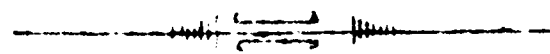
مقدمہ .. .. مولوی عبدالحق

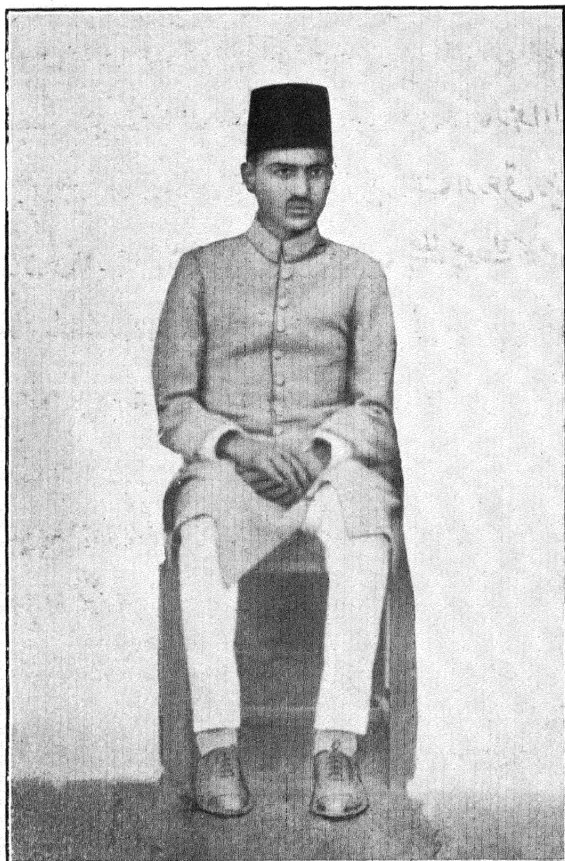
دس سال پہلے کی بات ہے، مجلہ کے افق سے ایک **"چاند"** طلوع ہوا اور پھر "اُردو" پر ضیا پاش ہوتا رہا، اور ابھی ماہ کامل بھی بننے نہ پایا تھا کہ ہمیشہ کے لئے گہنا گیا۔

شیخ چاند کی جوان مرگی ایک ایسا سانحہ ہے، جس کی یاد مدتوں مادر جامعہ کے دل کی کسک بن کے رہے گی۔ مجلہ کے صفحات سے مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا، ان کی تنقیدی صلاحیت کی اٹھان بھی یہیں سے ہوئی اور انھیں ضبط و تحمل اور محنت اور عرق ریزی کا سبق بھی مجلہ ہی سے ملا۔ مگر ان کی ادبی صلاحیتوں کو ابھی پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ہم سے جدا کر لئے گئے۔ اور ہماری یہ آرزو کہ وہ عثمانیہ کی سرزمین پر ماہ کامل بن کر چمکتے پوری نہ ہو سکی۔ مرحوم کی ذات میں وہ ساری خصوصیات موجود تھیں جو ایک آئیڈیل عثمانیہ میں ہونی چاہئیں۔

ادیب پیدا ہوں گے۔ شاعر پیدا ہوں گے، مقرر پیدا ہوں گے مگر جامعہ عثمانیہ سے پھر کوئی شیخ چاند پیدا نہ ہوگا۔

اشفاق





Late. Mr. SHAIK CHAND,
M.A., LL.B. (Osman.)

شیخ چاند مرحوم

مرگِ حبیب باعثِ رنج و محن ہے آج   دل ریش ہے تو درد بھرا ہر سخن ہی آج
جائے شمیم باغ میں بوئے کفن ہے آج   روتے ہیں گل کہ ماتمِ مرغِ چمن ہی آج

صد حیف زمزموں کا تسلسل نہیں رہا
سونا پڑا ہے باغ کہ بلبل نہیں رہا

ماتم کریں گے دیر تک علم و ادب ترا   تحقیق پر مدار رہا روز و شب ترا
نقاد نام دل سے بھلائیں گے کب ترا   رو دیں گے ذکر آئے گا محفل میں جب ترا

بیمثل و بے غرض تھیں وفا کوشیاں تری
ہاں [1]مقبرے کو یاد ہیں خاموشیاں تری

---

[1] مقبرہ رابعہ دُرانی (اورنگ آباد دکن)، جہاں مرحوم انجمن ترقی اُردو کے سلسلہ میں کام کرتے تھے۔

تیغِ قلم کی کاٹ دکھا کر چلا گیا　　پندار کے قصور ہلا کر چلا گیا
ناکامیوں کے رنج اُٹھا کر چلا گیا　　یعنی سزا کمال کی پا کر چلا گیا

کس درجہ جانگداز تھیں مجبوریاں تری
اہلِ وطن کو یاد ہیں محرومیاں تری

مشکل میں غمگسار دلِ اہلِ درد تھا　　اہلِ ریا کے واسطے بے مہر و سرد تھا
خوددار تھا سخی تھا، قناعت میں فرد تھا　　"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"

فرقِ غرور جوشِ خودی میں کچل دیا
دنیا سے بے نیاز تھا ٹھکرا کے چل دیا

یوں تو اجل کے وار سے ہے کس کو یاں مفر　　بہر غذائے قبر بنایا گیا بشر
پر یہ شباب کے لئے موزوں نہیں سفر　　دل خون ہو گیا تری بے وقت موت پر

دشمن ہے سر پہ، جنگ کا نقشہ بدل گیا
اُردو سے ایک دلیر سپاہی نکل گیا

بے گرم تیرے ذکر سے بزمِ سخن ابھی　　سر دھن رہے ہیں تیرے لئے اہلِ فن ابھی
احباب تیری یاد میں ہیں نالہ زن ابھی　　غم کر رہی ہے تیرا زمینِ پٹن[۱] ابھی

جب مر گیا تو سب نے بپا حشر کر دیا
پر زندگی میں تیرے لئے کچھ نہیں کیا

---

[۱] یہ تاریخی مقام اورنگ آباد (دکن) سے تیس میل کے فاصلے پر دریائے گوداوری کے کنارے واقع ہے یہیں مرحوم پیدا ہوئے اور تعلیم کی ابتدائی منزلیں طے کیں

مرحوم! تیرا ملک عجب فاقہ مست ہے حق ناشناس اور خیالوں کا پست ہے
بے حس ہی، بے عمل ہی، جہالت پرست ہی اہلِ ہنر کے واسطے تیشہ بدست ہے
بوڑھوں کا ذکر کیا ہی جوانوں میں دم نہیں
زندے بھی تیری قوم کے مُردوں سے کم نہیں

در پر تونگروں کے سدا سر جھکائیں گے بیکاریوں سے اپنی فراغت نہ پائیں گے
خود ناشناس کیوں تری تربت پہ آئیں گے غمگیں ہیں آج، پر تجھے کل بھول جائیں گے
ورثہ میں کچھ خلوص کا ترکہ ملا نہیں
ان سے کسی کے دل کا شگوفہ کھلا نہیں

طے ہو رہی ہے لطف سے تیری رہِ نجات عنبر[1] ہے اک طرف تو ہے اک سمت ایکنات
سودا[2] ہی خوش کہ سر پہ ہی تیرے ولی کا ہات بگڑی یہاں تو بن گئی عقبیٰ میں تیری بات
خوش بخت تھا قریبِ دلِ اہلِ دل گیا
مُردوں کا ساتھ چھوڑ کے زندوں میں مل گیا

سکندر علی وجد (عثمانیہ)

---

[1] ملک عنبر اور ایکناتھ (مرہٹی ادب کا ایک سادھو شاعر جو پٹن ہی میں پیدا ہوا اور وہیں وفات پائی، مرحوم کی مشہور کتابیں ہیں۔
[2] سودا پر جو مقالہ مرحوم نے لکھا ہے اس کا شمار اردو کے بہترین تحقیقی مقالوں میں ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہو چکی ہے

شیخ چاند کی وفات

وہ اگرچہ نوجوان تھے، مگر محنت و ریاضت، اور اردو کی خدمت کرتے کرتے بوڑھے ہوگئے تھے۔ کثرتِ کار نے ان کے تنومند قویٰ کو ایسا مضمحل کر دیا تھا کہ وقت سے پہلے وہ موت کے آہنی پنجہ کا شکار ہوگئے۔

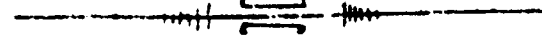
انھوں نے انجمن ترقی اردو کی بڑی تندہی سے خدمات انجام دیں۔ اردو شاعروں کے جملہ تذکرے اور قدیم اردو کتابیں جو گذشتہ چند سال سے انجمن نے شائع کیں ان سب کی ترتیب و تہذیب و فراہمی مواد وغیرہ میں مرحوم شیخ چاند نے جو زحمتیں اٹھائی ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انجمن کی لغتوں کے کام میں بھی انھوں نے جانکاہ حصہ لیا ہے۔ روزانہ مسلسل چھ چھ آٹھ آٹھ گھنٹے وہ مختلف مترجمین کے پاس سے آئے ہوئے مسودوں کی ترتیب اور ان کو مطبع میں جانے کے قابل بنانے، اور پروفوں کے دیکھنے میں صرف کیا کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب کو قدیم اردو کتابیں جمع کرنے، اور دور دراز مقامات اور دیہات میں سفر کر کے کتابیں حاصل کرنے میں بھی شیخ چاند مرحوم سے زیادہ کسی اور نے مدد نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ان تمام نایاب اور بیش بہا قلمی نسخوں کی بسیط فہرستیں بھی مرتب کر لی تھیں جو اگر شایع ہو جاتیں تو اردو ادب پر

تحقیقی کام کرنے والوں کی معلومات میں کافی اضافہ کا باعث ہوتیں۔ افسوس ہے کہ وہ اپنے کام کو پھولتا پھلتا نہ دیکھ سکے۔

شیخ چاند نے رسالہ اُردو میں جو تحقیقی مضامین اور اُردو کی مطبوعات پر تنقیدیں لکھی ہیں وہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ اگرچہ وہ اُردو زبان و ادب پر کام کرنے والوں میں سب سے کم عمر تھے۔ لیکن کثرت مطالعہ اور اردو ادب کے سچے ذوق نے اُن کے نقطۂ نظر اور معلومات کو بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں سے زیادہ سنجیدہ اور دقیع بنا دیا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں انھوں نے اُردو زبان اور ادب پر کافی دسترس حاصل کرلی تھی اور کام کرنے کی ایسی صلاحیت پیدا کرلی تھی کہ اگر وہ زندہ رہتے تو مولوی صاحب کے سچے جانشین اور اُردو زبان کے مخلص خدمت گزار ثابت ہوتے۔

سید محی الدین قادری زور



شیخ چاند مرحوم کی تصنیفات

کسی ملک اور قوم اور زبان وادب کی اس سے زیادہ بدنصیبی نہیں ہوسکتی کہ اس کے ہونہار اور سنجیدہ ارباب فکر عین اس وقت اس سے اُٹھ جائیں، جب وہ قوم اور ملک کی حقیقی خدمت کے لئے تیار ہو چکے ہوں۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، مہدی حسن افادی جیسے ارباب قلم کی موت ہمارا ایسا قومی نقصان ہے کہ جس کی تلافی شاید ہی ممکن ہوسکے۔ اس زمانے میں شیخ چاند مرحوم کی وفات، اردو زبان کے لئے ایک اسی طرح کا سانحہ ہے۔ مرحوم عین اسی وقت ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے، جب ان سے زبان اور ادب کی حقیقی خدمت کی توقعات قایم ہوچکی تھیں، اور جن کو انھوں نے بوجہ احسن پورا کرنے کا سامان بھی مہیا کرلیا تھا۔ مرحوم اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے اُردو زبان کی حقیقی خدمت کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اور اپنی فوق العادت محنت، ذہانت اور وسیع مطالعہ کے ذریعہ، ایک نفیس ذوق ادب اور محققانہ بصیرت پیدا کرلی تھی۔ زبان قدیم اور اس کے ادب پر کام کرنے والوں کی ضرورت اس زمانے سے زیادہ شاید ہی کسی زمانے میں اس شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ہوگی اور شیخ چاند مرحوم اسی خدمت کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بعض علمی مضامین تنقیدوں اور تصانیف کے ذریعہ اُردو کے رہنے والے مصنفین میں ایک بلند جگہ پیدا کرلی تھی۔

مرحوم نے کئی مضامین، اور تنقیدوں کے علاوہ، تین مستقل تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ تصانیف (۱) ملک عنبر (۲) ایکناتھ اور سودا ہیں۔ ملک عنبر مرحوم کی اولین تصنیف ہے جو نظام شاہی سلطنت احمد نگر کے سپہ سالار اور وکیل سلطنت کی سوانح حیات فتوحات اور انتظام مملکت پر مشتمل ہے۔ یہ مواد دو سو صفحات کی محققانہ کتاب ہے جس میں اس مشہور تاریخی شخصیت کی زندگی اور اس کے کارناموں پر نہایت سیر حاصل تحقیق پیش کی گئی ہیں۔

دکن کے اس مہتم بالشان مدبر اور سپہ سالار کے حالات اس قدر منتشر تھے کہ ان کو ایک جگہ جمع کرنا اور اس کے کارناموں کو، ان کے صحیح تاریخی ماحول کے چوکھٹے کے اندر رکھ کر ان کی حقیقی اہمیت معلوم کرنا، ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر مغل مورخین نے دکن کی دوسری تاریخی اور اہم شخصیتوں کی طرح ملک عنبر کے متعلق بھی جو غلط اور گمراہ واقعات درج کئے ہیں ان کی وجہ سے، اس کے کارناموں کی صحیح قدر ومنزلت کا اندازہ لگانا دشوار ہو گیا تھا۔ مغل مورخین کی ان غلط بیانیوں کے باوجود، ملک عنبر کی عظمت ہمیشہ برقرار رہی۔ اور جیسا کہ مولوی غلام یزدانی صاحب ام، اے، ناظم آثار قدیمہ، سلطنت حیدر آباد نے کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے "مغل بادشاہوں کے تاریخ نویسوں نے ملک عنبر کو اکثر بتبذل ناموں سے یاد کیا ہے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد وہ اس کی شجاعت اور حسن تدبیر کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے"۔ اس طرح اس کتاب کی ایک خاص تاریخی اہمیت ہے۔ مرحوم نے یہ کتاب لکھ کر اپنے وطن کی ایک ایسی خدمت انجام دی ہے، جس کے لئے آیندہ نسلیں، ان کو نہایت احترام کے ساتھ یاد کیا کرینگی۔

مرحوم کی دوسری تصنیف "ایکناتھ" خاص انہیں کے مولد ومنشا، کی ایک قابل قدر ہستی کے حالات اور سوانح پر مشتمل ہے۔ مہاراشٹر کا یہ مصلح اپنے زمانہ کے "تنگ نظرانہ تعصبات"، اور رسم ورواج کی بے جا قیود سے سخت متنفر تھا اس مہاتما نے اس زمانے میں ایک ایسی انسانی تحریک کی ابتدا کی تھی، جو سالہا سال تک فراموش رہنے کے بعد موجودہ زمانے کے اکثر مصلحین کے پیغام کا طرۂ امتیاز بن گئی ہے۔

اس موضوع پر قلم اٹھا کر شیخ چاند مرحوم نے اپنی وسیع خیالی، اور فراخ نظری، اور اس سے بڑھ کر ایک حقیقی ہندوستانی قومی ذہنیت کا ایسا صحیح ثبوت دیا، جو موجودہ زمانے میں اکثر قومی رہنماؤں کی بھی رہنمائی کرسکتا ہے مذکورہ بالا دونوں کارنامے، اپنی اپنی جگہ نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا آخری کارنامہ "سودا" اردو ادب سے متعلق جدید تحقیقات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دراصل مرحوم کا وہ مقالہ ہے، جو انھوں نے

جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ بورڈ کے سامنے ام۔ اے کے بعد ریسرچ کے مقالے کے طور پر پیش کیا تھا۔ بورڈ نے اس مقالے کو بے حد پسند کیا جس کا اظہار معتمد بورڈ نے "تعارف" میں کیا ہے۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے اس کی جانچ کی اور تحریر فرمایا کہ:۔

"مقالے کے مطالعہ کے بعد میری یہ پختہ رائے ہے کہ شیخ چاند صاحب مقالہ نگار نے، فراہمی مواد مطالعہ بحث ادا، ترتیب و بیان میں پوری کاوش اور محنت کی ہے اور اس طرح پوری تیاری کے بعد مقالہ لکھا ہے۔ یہ مقالہ اس قابل ہے کہ جامعہ عثمانیہ کو اس پر مبارک باد دی جائے کہ اس کی معارف پروری اور تربیت سے ایسا مقالہ نگار پیدا ہو سکا۔"

واقعہ یہ ہے کہ سودا کو اردو شاعری میں جس قدر شہرت اور اہمیت حاصل ہے اس کے مد نظر ان کی حیات اور کلام پر اس وقت تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ سودا اردو شاعری کے ارتقا کے ایک نہایت اہم اور عہد آفرین دور میں پیدا ہوئے تھے، اور ان کی مخصوص طرز فکر سے جو دبستان اردو شاعری کا قایم ہو گیا تھا اس کے اثرات اس قدر وسیع ہیں کہ ان پر جس قدر بھی لکھا جائے کم معلوم ہوتا ہے۔ شیخ چاند مرحوم نے نہایت صبر، استقلال، پامردی اور اس سے بڑھ کر سچے ذوق تحقیق کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد اس استاد الاساتذہ پر ایک ایسی چیز پیش کی جو اعلیٰ پایہ تحقیقاتی کارناموں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

یہ مقالہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر حصے میں کئی ابواب ہیں۔ پہلا حصہ تمہیدی ہے اس کے پہلے باب میں وہ تمام سیاسی اور معاشرتی حالات پیش کئے گئے ہیں جنھوں نے سودا کی حیات، ذوق اور شاعری پر اثر ڈالا۔ دوسرے باب میں، سودا کے عہد تک کی اردو شاعری اور اس کے ارتقا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ تحقیقی ہے، اس کے پہلے باب میں سودا کی مفصل سوانح عمری اور دوسرے میں ان کے کلام کی محققانہ چھان بین کی گئی ہے۔ تیسرا سودا کے کلام کی تنقید پر مشتمل ہے۔ اس میں سودا کے پورے کلام کے محاسن اور معائب پر سیر حاصل تحقیق پیش کرنے کے بعد ان کا درجہ اردو شاعری میں معین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری اور اختتامی حصے کے پہلے باب میں اردو زبان کو بنانے اور سنوارنے میں سودا کا جو حصہ رہا ہے اس پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری باب میں اردو زبان اور اس میں سودا کی صحیح عظمت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

ان وسیع مباحث سے ظاہر ہے کہ مقالہ نگار نے، موضوع بحث کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں، اور اگر مقالے کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے کسی بحث کو ادھورا اور تشنہ نہیں چھوڑا۔ بلکہ ایک سنجیدہ محقق کی طرح ہر چیز پر موافق اور مخالف خیالات کا اظہار نہایت صفائی کے ساتھ اور مدلل طور پر کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہایت تحقیق سے سودا کے اصلی اور الحاقی کلام کا بھی پتہ چلا کر، ہماری زبان اور ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔

مقالے کی تدوین کے سلسلہ میں انھیں سودا کے کلام اور کلیات کے کئی نسخوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا پڑا تھا۔ اور اپنی تحقیقات کے نتیجے کے طور پر، انھوں نے سودا کے کلام کے بڑے حصے کی تصحیح بھی کر لی تھی اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو سودا کا مکمل کلیات بھی مرتب کر کے شائع کر دیتے، لیکن افسوس کہ ان کی اور ان سے زیادہ ہماری یہ آرزو، اور، بہت ساری توقعات کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گئی۔

عبدالقادر سروری

آہ شیخ چاند

شیخ چاند کی موت اُردو اور دکن دونوں کے لئے ایک سانحہ ہی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں اُنھوں نے اُردو کی جو خدمت کی وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ مرحوم کو دکھنیات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا جس سے علمی دنیا بخوبی واقف ہے "سوداکی شاعری"، ان کا وہ آخری کارنامہ ہے جس نے ان کے نام کو ہمیشہ کے لئے اُردو کے ساتھ وابستہ کردیا ہے۔ تاریخ ادب میں بھی انھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی کسی موضوع پر جب وہ قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ معلومات کا سمندر ہے کہ امنڈا چلا آرہا ہے ان کی تحریروں میں ایک اجتہادی شان تھی۔ ان کی تنقیدیں سخت اور بے لاگ ہوتی تھیں۔ وہ شخصیتوں سے مرعوب ہونے والے نہ تھے انھیں اپنی قابلیت پر گھمنڈ اور بجا طور پر گھمنڈ تھا لیکن وہ کبھی اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔

"مجلہ عثمانیہ" کے اجرا تک شیخ چاند کے نام سے کالج کی علمی دنیا ناواقف تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی کارنامے ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر زور کی "روح تنقید"، کی تالیف کے قصے سنے جاتے تھے اور مولوی سروری صاحب اور سید محمد صاحب علی الترتیب "دنیائے افسانہ"، اور "ارباب نثر اردو" پر کام کررہے تھے ادھر معین الدین صاحب قریشی نائب صدر انجمن اتحاد اور ان کی کابینہ برادران کلیہ میں سے مضمون نگار شعرا اور دیگر صاحبان ذوق کے انتخاب میں مصروف تھے تاکہ صحیح معنوں میں طلبائے عثمانیہ کی علمی کاوشوں اور ادبی رجحانات

کا ترجمان رہے۔ مجلہ نکلا اور اس نے نکلتے ہی کالج کی چاردیواری میں ایسے مضمون نگار فراہم کئے جن کی افتادِ قلم سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے کارنامے ایک نہ ایک دن اُردو میں اپنی جگہ حاصل کر کے رہیں گے۔ چنانچہ شیخ چاند کے "قاضی شہاب الدین" والے مضمون نے جو مجلہ کے پہلے شمارہ میں شائع ہوا ان کے متعلق یہ توقعات قایم کر دیں کہ مطلعِ اُردو پر یہ چاند واقعی چاند بن کر چمکے گا۔

شیخ چاند کی پہلی کتاب جو شائع ہوئی "ملک عنبر" ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی تحقیق زبان تک محدود نہ تھی بلکہ تاریخ سے بھی انھیں بڑا شغف تھا۔ "ملک عنبر" کا بہت کچھ مواد انھیں احمد نگر میں دستیاب ہوا تھا۔ دکن کے اس جلیل القدر سپہ سالار کے متعلق جس نے صحیح معنوں میں دکھنی قومیت کی داغ بیل ڈالی تواریخ میں نہ صرف بہت ہی کم مواد ہے بلکہ مورخین ہند اس کی حقیقی عظمت کے سمجھنے سے قاصر بھی رہے ہیں مرہٹہ قوم میں جو جوشِ عمل پیدا ہوا وہ دراصل ملک عنبر کی کوششوں کی وجہ ہے "ملک عنبر" کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ مرہٹی زبان میں ترجمہ ہوئی اور مصنف اس کو انگریزی میں شائع کرنے کی فکر میں تھے۔

اردو ادب میں اگر شیخ چاند کا نام زندہ رہے گا تو سودا والی کتاب سے۔ اس پر نواب صدر یار جنگ بہادر (علامہ حبیب الرحمن شروانی) نے جو سودا کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ اتنی وقیع ہے کہ اس سے کتاب کی اہمیت میں چار چاند لگ گئے ہیں شیخ چاند نے انجمن ترقی اُردو اور رسالہ اردو کی بھی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ اگر انجمن کی جانب سے مرحوم کے اُن مضامین کو جو مجلہ عثمانیہ اور رسالہ اُردو میں طبع ہوئے ہیں کتاب کی صورت میں شائع کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف شیخ چاند کی روح ہی کو سکون حاصل ہوگا بلکہ یہ علم و ادب کی بھی خدمت ہوگی۔

خلوص، ہمدردی، انکساری، اور ایثار شیخ چاند کی زندگی کی اہم خصوصیات تھیں۔ وہ ایک خاموش قسم کے آدمی تھے۔ نمود و نمایش سے اُنھوں نے ہمیشہ احتراز کیا وہ کام کرنے کو پیدا ہوئے تھے اور آخر وقت تک کام ہی کرتے رہے۔ یہ بات کالج کے ابتدائی جماعتوں ہی سے اُن میں موجود تھی، اور بعد میں ان کی فطرت میں ایسی رچ گئی کہ طبیعت ثانیہ ہوگئی۔ اسی کام نے ان کی صحت کو تباہ کیا، اسی کام نے انھیں زندگی میں سرسبز ہونے سے روکا اور اسی کام نے انھیں موت کی آغوش میں سُلا دیا، وہ علم کے سچے فدائی تھے اور سچ تو یہ ہے کہ علم کی قربانگاہ پر انھوں نے اپنی جان عزیز کی بھینٹ چڑھائی ع "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

بدر شکیب

بی-اے-یل یل بی (عثمانیہ)

شیخ چاند مرحوم سے

ترے لب تھے اور صہبائے عمل کا جام تھا — ترا ہر اک سانس ذوقِ زیست کا پیغام تھا
ترا عزم مستقل تھا آئینہ دارِ کمال — ترے ذوقِ کار کے تانوں پہ تھی زلفِ خیال
تری غربت پر امارت کا تکبر تھا نثار — سربلندوں کو جھکا دیتا تھا ترا انکسار
غم سے دنیا کے نہ آئی ترے ماتھے پر شکن — مسکرا کر سہہ لئے تو نے سدا رنج و محن

دامنِ اردو پہ ہے اب تک ترے دل کا لہو
یاد ہے بزمِ ادب کو ترا اندازِ نمو

تھی خزاں بر دوش تری زندگانی کی بہار — تری مرگِ ناگہاں پر ہے جوانی سوگوار
تری مرقد پر ہے روشن زندگانی کا چراغ — چاند کے دل میں ابھر آیا ہے ترے دل کا داغ
تری تربت کا ہر اک ذرہ ہے قرطاسِ شباب — جس پہ لکھی ہے زمانہ نے حدیثِ انقلاب
بے غرض محنت سے تجھ کو زندگانی مل گئی — مر گیا لیکن حیاتِ جاودانی مل گئی

باعثِ عزت سمجھتے تھے دکن والے تجھے
یاد رکھیں گے سدا ترے وطن والے تجھے

میکش

شیخ چاند مرحوم

تیر کا مہینہ، دو پہر کا وقت، ایک نوجوان میز کے سامنے بیٹھا ماحول اور وقت کی سختیوں سے بےخبر کام کیے جا رہا ہے۔ پسینہ میں شرابور ہے۔ انجمن ترقی اُردو ڈکشنری چھپوانا چاہتی ہے، اس مشکل کام کو اس نوجوان کے قلم کی جنبشیں آسان کر رہی ہیں۔ پروفس کا ڈھیر سامنے رکھا ہے۔ نگاہوں کا سارا ذوق و شوق اور نظر کی ساری تیزی ان باریک حروف والے کاغذ کے پرزوں میں غرق ہو کر مدہم پڑتی جا رہی ہے۔ مگر وہ ان صبر آزما گھڑیوں کو اپنی ہمت کے سہارے سہہ رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کی نگاہوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی ہے شاید اسے مستقبل کا خیال آ گیا ہو۔ اپنی محنت کا اجر پا کر وہ مستقبل کو سنورتا دیکھ رہا ہو گا۔

رم جھم بارش ہو رہی ہے۔ مقبرہ کا چمن باوجود اپنی پیرانہ سالی کے شباب کی رنگینیاں برسا رہا ہے۔ روشوں پر گلاب کے تختے اور سرو کے درخت، شفاف و صفاف اور چھلک پڑنے والے حوضوں میں اپنے سایوں سے ماحول کو یکسر شعرستان، بنا رہے ہیں اور ایسا وقت جبکہ ہر نوجوان دل ہمہ سرلغزش بن جاتا ہے اور ایسا ماحول جس میں ایک بوڑھا بھی اپنے ٹھٹھرے ہوئے سینہ میں جوانی کی گرمی محسوس کرتا ہے، ایک نوجوان ایسا بھی ہے

جو وقت کی رنگینیوں سے آنکھیں پھیرے، کتابوں کے ڈھیر میں بیٹھا اپنے علم کی پیاس بجھا رہا ہے، ان بوسیدہ قلمی کتابوں کے ورقوں پر اپنی نگاہوں کا سارا شوق دید ختم کئے دے رہا ہے۔ اس کا صحت مند جسم، کشادہ سینہ، تنومند بازو، زندگی کی ساری تلخیوں کو سہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ مستقبل کی درخشانی کا خیال اب بھی اس کی امنگوں کا سہارا بنا ہوا ہے۔

اسی نوجوان کی ایک اور تصویر بھی ہے۔

ایک ضعیف و ناتوان جسم جس کے لڑکھڑاتے پیروں میں جوانی آخری سانسیں لے رہی ہے، اب بھی اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ اس کے قلم کی تیزی و روانی کا اب بھی وہی عالم ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں مگر اس کے دل و دماغ کے جواہر پارے اب بھی ادب میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ اس کے آنکھوں کی چمک اور چہرے کی بشاشت غائب ہو گئی ہے مستقبل کی تابناکی کا خیال اب مایوسی اور ناامیدی سے بدل گیا ہے۔ زمانہ اور وقت کی سختیوں کو وہ ماضی کی یاد میں بھول جانے کی کوشش کر رہا ہے، اب وہ اس ناکام مسافر کی طرح لڑکھڑاتے پیروں سے چل رہا ہے جو راستہ کی دشواریوں اور کٹھن منزلوں سے گذر کر بھی منزل مقصود کا کہیں نشان نہیں پاتا۔ اس کا دل بیٹھ گیا ہے۔

ماحول کی بے حسی اور بیدردی کی یہ تصویر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ابھی سسک سسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دینا باقی تھا — ایک آخری ضرب نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اب فن مکمل ہو چکا تھا!!

یہ ہیں مرحوم شیخ چاند کی وہ تصویریں جن میں ان کی تیس سالہ زندگی کی قیمتی مصروفیتیں بھی ہیں اور کرب و تکلیف کی گھڑیوں کے آخری لمحے بھی۔

شیخ چاند مرحوم ٹیپن ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، وسطانیہ کی تعلیم وہیں ختم کی۔ اورنگ آباد آکر فوقانیہ میں شریک ہوئے۔ اورنگ آباد کالج کی بنیاد مولوی عبدالحق صاحب کے ہاتھوں پڑ چکی تھی، اور یہیں سے اورنگ آباد کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی مردم شناس نگاہیں شیخ چاند مرحوم پر بھی پڑیں، اس ذہین طالب علم کو مولوی صاحب نے اپنے آغوش شفقت میں لے لیا۔ اس طرح مرحوم کی ادبی اور ذہنی نشو و نما

ایسے ماحول میں ہوئی جہاں مولوی عبدالحق صاحب کی رہبری میں پروفیسر وہاج الدین، پروفیسر ابراہیم اور پروفیسر غلام طیب سرگرم کار تھے اور جن کے خلوص اور ایثار سے متاثر ہو کر ہر طالب علم اپنے آپ کو زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر کھڑا پا رہا تھا۔ کام کرنے اور دوسروں کے کام آنے کے جذبات تربیت پا رہے تھے۔ چشم بد دور اسی دور میں اورنگ آباد کے اُفق سے "نورس" بھی طلوع ہوا۔ طالب علموں میں مرحوم شیخ چاند ہی سب سے پہلے مضمون نگار تھے، "مہاتما بدھ سے خطاب"، مرحوم کا پہلا مضمون تھا جو طبع ہوا، جس کی مولوی صاحب اور اساتذہ نے خوب تعریفیں کیں اور اس ہونہار اہل قلم کا دل بڑھایا۔

اورنگ آباد کی تعلیم ختم کر کے مرحوم جب مادر جامعہ کی آغوش میں آئے تو یہاں انھیں پھر مولوی صاحب کی شاگردی نصیب ہوئی۔ جامعہ کی ادب نواز فضا میں کام کرنے کا ایک اور وسیع میدان ہاتھ لگا۔ مجلہ اپنے شباب پر تھا اور ملک کی ادبی فضا میں آفتاب بن کر چمک رہا تھا اور اسی کی کرنوں میں جامعہ کے ادبی ماحول کی پرورش ہو رہی تھی۔ یہی کرنیں جب مرحوم پر پڑیں تو مرحوم نے اپنے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ وہ مجلہ سے قریب ہوتے گئے اور آخر میں اپنے آپ کو مجلہ کے لئے وقف کر دیا۔ پہلے اس کے منتظم مقرر ہوئے اور پھر مدیر۔ مرحوم کی ادارت میں مجلہ اس بلندی پر پہنچا کہ ان کے بعد آنے والوں کے لیے اس معیار کا قایم رکھنا مشکل ہو گیا۔

مرحوم اپنے محترم استاد کی طرح اپنے موضوع کے لئے تحقیق میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو اسی کا ہر پہلو مکمل کر کے چھوڑتے۔ اس میں جانفشانی محنت اور کھیکڑ اٹھانی پڑتی ہے اور جس قدر ضبط و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے وہ محقق ہی خوب جان سکتے ہیں۔

مرحوم کے کئی مضمون مجلہ میں شائع ہوئے اور ہر مضمون اپنے ماخذ پر ایک اضافہ ہے۔ "قاضی شہاب الدین اورنگ آبادی"، "شعرائے اورنگ آباد"، "عبدالولی عزلت" اور "بہار دانش" یہ سب مرحوم کی ادبی کاوشوں کے ایسے ثمر ہیں جو مجلہ کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ مرحوم کی تنقیدی صلاحیتوں کا علم بھی سب سے پہلے مجلہ ہی کے صفحات سے ہوا

مرحوم نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد، جامعہ کی آغوش سے جدا ہو کر جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو مولوی صاحب کی شفقت، انھیں اپنے دامن سے کس طرح علیحدہ کر سکتی تھی۔ غرض مولوی صاحب نے اپنے شاگرد رشید کی ذات میں

ایک رفیق اور مددگار کو بھی پالیا اور اپنے کام کا آدھا بوجھ اس نوجوان کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اب مرحوم انجمن ترقی اُردو کے لئے وقف ہوگئے، اور اپنے فرائض کو اس خلوص اور ایثار سے انجام دیا کہ دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ، انجمن ہی کے ہو رہے۔ مرحوم کی زندگی کا یہ حصہ بڑی مصروفیت میں گذرا، ابھی رسالہ اُردو کی ترتیب و تدوین سے فرصت نہ ملتی کہ ڈکشنری کی طباعت کا صبر آزما کام مرحوم کو اپنی طرف گھسیٹتا۔ ادھر ملک عنبر اور ایکناتھ شائع بھی نہیں ہوئی تھیں کہ سودا، کی تحقیق کا کام سر پر آپڑا۔ غرض مرحوم نے اس مختصر سی زندگی میں اتنا کام کیا کہ ان کے فرصت کے دنوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنا پڑیگا مرحوم شہرت پسندی اور اپنے آپ کو اچھالنے کے، نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ انھیں صرف ایک ہی دھن تھی، اور وہ کام کرنے کی، شاگرد کے اس انہاک اور لگن کو دیکھ کر استاد کو بھی رشک آتا ہوگا!

مرحوم کی سب سے پہلی ادبی کاوش جو شائع ہوئی، ملک عنبر ہے۔ جس پر ہاشمی صاحب نے پیش لفظ اور یزدانی صاحب نے مقدمہ لکھا ہے۔

ہاشمی صاحب لکھتے ہیں "لایق مولف نے جس محنت اور قابلیت سے ملک عنبر کے پریشان اور منتشر حالات کو جمع کیا وہ ان کے علمی ذوق کی دلیل ہے اور جس محنت اور خوبی سے اُردو میں تحریر کیا وہ ان کے حب وطن اور ادبی شوق پر گواہ ہے"

یزدانی صاحب نے لکھا ہے "ملک عنبر کے حالات مختلف کتابوں میں منتشر تھے، اس وجہ سے اس مشہور سپہ سالار اور مدبر کی قابلیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا، شیخ چاند صاحب کا تاریخ دوست اصحاب پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ان کو بڑی مشکل سے یک جا جمع کر دیا ہے اور ایسے ابواب قایم کر دیے ہیں کہ نتیجہ نکالنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کو مبارک ہو کہ اس کے ایک نونہال نے یہ مفید کام کیا"

مرحوم نے ملک عنبر پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے اور دکن کے اس سپہ سالار اعظم کی زندگی پر جتنی کتابیں مل سکتی تھیں، ان کو پڑھ کر اپنے لئے مواد جمع کیا۔ یہ سب کچھ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں کیا۔ مرحوم اُردو کے طالب علم تھے، اس موضوع پر تو کسی تاریخ کے طالب علم کو لکھنا چاہئے تھا، مگر مرحوم کے حب وطن نے ان کے ذوق و شوق کی رہبری کی، اور انھوں نے ایک ایسا کام کر دیا جس کی وجہ سے دکن کی تاریخ پڑھنے والے

انھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ان کی کوشش اردو تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس کا ترجمہ مرہٹی میں بھی ہوا۔

مرحوم کی دوسری کتاب "ایکناتھ" ہے۔ ایکناتھ پٹن کا ایک سادھو شاعر تھا اس نے اپنے جواہر افکار سے مرہٹی زبان (جو اس وقت تک صرف عوام کی زبان سمجھی جاتی تھی) کے علم ادب کو مالا مال کر دیا اور اہل مہاراشٹر کی اخلاقی بیماریوں اور روحانی خرابیوں کو دور کرنے کی بڑی جد و جہد کی۔

آج بھی مرہٹی ادب میں، اس مصلح شاعر کا نام بڑے ادب سے لیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف شاعر ہی تھا بلکہ روحانی حیثیت سے بھی اس کا درجہ بہت بلند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شاعری اور اس کی تعلیم ہزاروں لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔

مرحوم نے اپنے ہم وطن شاعر کو مرہٹی زبان کی حدود سے نکال کر اردو میں جس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے وہ ان کی وطن پرستی پر گواہ ہے۔ مرحوم پٹن کی تاریخ بھی لکھنا چاہتے تھے، اس کے لئے مواد بھی جمع کر لیا تھا مگر افسوس کہ لکھنے کی نوبت نہ آسکی۔

مرحوم کی آخری کتاب "سودا" ہے۔ یہ مرحوم کا ایسا ادبی کارنامہ ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا یہ اصل میں ان کا ایم۔ اے کے بعد کا تحقیقی مقالہ ہے جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے، اسے مجلس تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ نے انجمن سے شائع کرایا ہے۔ یہ شعبہ اردو کا پہلا مقالہ ہے جو اس مجلس کی طرف سے شائع ہوا۔

مرحوم اپنے مقالہ کے لئے دو سال تک مواد جمع کرتے رہے اور اسے اس وقت لکھنا شروع کیا جب وہ بیمار پڑ چکے تھے، مگر شکر ہے کہ مقالہ ان کی زندگی ہی میں ختم ہوا اور طبع بھی ہو گیا مگر افسوس ہے کہ وہ اس کی اشاعت نہ دیکھ سکے۔

رسالہ اردو کے صفحات مرحوم کے ادبی ذوق اور تنقیدی صلاحیت کے گواہ ہیں۔ ان کی تنقیدوں کا انداز وہی ہے جو مولوی عبدالحق کا ہے، بلکہ ان کا لہجہ کچھ سخت ہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرحوم کی تنقیدیں تنقیص کی حد تک سخت ہوتی تھیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ جس تلاش و جستجو کے بعد کسی موضوع پر قلم اٹھاتے، اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ دوسروں کی سہل انکارانہ طبیعتوں پر چوٹ کرتے۔

میں خان بہادر نصیر الدین خیال مرحوم کی کتاب "مغل اور اردو" پڑھ کر بہت متاثر ہوا تھا نہ صرف ان کے

اسلوب بیان سے بلکہ ان کی معلومات سے بھی۔ مگر جب اردو میں مرحوم کی تنقید پڑھی تو حیرت ہوئی کہ خیال جیسا ادیب بھی کتنے غیر ذمہ دارانہ انداز میں قلم چلا سکتا ہے۔

مرحوم جس کتاب پر تنقید کرتے اس کی اچھائیوں اور برائیوں کو کھول کر رکھ دیتے ان کی تنقیدی نظر کا یہ عالم تھا کہ معمولی سی معمولی غلطی بھی ان کی نگاہوں سے بچ نہ سکتی تھی۔ ہمارے یہاں تنقیدی ادب کی بڑی کمی ہے مرحوم کی ذات میں ہم نے نہ صرف ایک محقق کو بلکہ ایک تنقید نگار کو بھی کھو دیا۔

مرحوم کی تحریر میں سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی اور شوخی بھی تھی۔ جو سادگی اور بانکپن ان کے کردار میں پایا جاتا تھا۔ ان کی تحریروں میں بھی عیاں ہے۔

مرحوم کی زندگی کے آخری دو سال بڑے کرب و اضطراب میں بسر ہوئے ان کی صحت خراب ہوتی گئی۔ ان کی آرزوئیں اور امیدیں نا امیدی سے بدل گئیں رات دن کی محنت اور مسلسل کام کرنے کا انھیں کچھ اجر نہ ملا۔ اپنی صحت کی خرابی کے زمانہ ہی میں وہ تھوڑے دنوں کے لئے جامعہ میں استاد بھی مقرر ہوئے تھے اس وقت ان کی یاس انگیز گفتگو سن کر دل بیٹھ جاتا تھا کہ ایسا جوہر قابل اور زمانہ کے ہاتھوں یوں کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہے۔

مرحوم کی زندگی طالب علموں کے لئے ایک سبق ہے کہ مرحوم نے اپنے شوق اور محنت سے علم حاصل کیا تحقیق و جستجو کرکے ادب اردو کو نوازا اور خاموش کام کرکے شہرت پسندی کو ٹھکرا دیا۔

اب ہم میں ان کے جیسا خاموش کام کرنے والا اور زمانہ کے مصائب کو ہنس کر ٹالنے والا کوئی نہیں رہا۔
اگر مجھ سے کوئی مرحوم کی قبر پر شعر لکھنے کو کہے تو میں یہ شعر لکھ دوں گا ؎

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغانِ شبِ مہتاب بے جا سوختیم

اشفاق

شیخ چاند مرحوم

یوم ولی کے سلسلے میں میں نے اپنے دوست شیخ چاند صاحب کو بھی ولی کی زندگی اور عہد ولی کے ادبی ماحول سے متعلق ایک مقالہ لکھنے کی دعوت دی تھی جس کے جواب میں مرحوم نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہوئے مجھے اطلاع دی کہ "عرصہ ہوا کہ میں نے ولی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے حدود موضوعات کم و بیش وہی ہیں جو آپ نے اپنے مراسلے میں لکھے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہوں دو تین روز میں اپنے مضمون کا مفصل خاکہ لکھ بھیجوں گا۔ اگر مجھے موقع دیا گیا تو اس پر نظر ثانی کروں گا اور آپ کے علمی جلسے میں ضرور شریک ہو کر عزت حاصل کروں گا۔ اس عریضہ کی رسید کی اطلاع کا منتظر ہوں"۔ میں نے اس کی رسید لکھ بھیجی اور اس سلسلے میں ان کے دوسرے خط کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ دفعتاً ایک روز اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر حیران رہ گیا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ مرحوم کی یہ تحریر بالکل آخری تھی اور ان کی بیماری جو بظاہر خفیف سی معلوم ہوتی تھی بالآخر جان لیوا ثابت ہوگی۔

شیخ چاند کی وفات سے اردو ادب اور خصوصاً طبقہ طیلسانین عثمانیہ کو جو عظیم نقصان پہنچا اس کی تلافی بہت مشکل ہے مرحوم کی عمر صرف ۳۱ سال کی تھی لیکن وہ اپنی ادبی تحقیقات، علمی معلومات، اور پختہ طرز نگارش

کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر تھے۔ انھوں نے تکمیل تعلیم کے بعد پورے پانچ سال شبانہ روز ادبی تحقیقات اور علمی کام میں بسر کئے اور اس مدت میں اپنے مطالعہ سے قدیم اردو ادب میں ایسی دسترس پیدا کرلی تھی کہ بعض کہنہ مشق اور تجربہ کار محققین بھی ان کی معلومات کو سن کر دنگ رہتے تھے۔

مرحوم ۵ ارخورداد سنہ ۱۳۱۵ف کو پٹن ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ دو تین سال گھر پر تعلیم پانے کے بعد سنہ ۱۳۲۲ف میں مدرسہ وسطانیہ پٹن میں شریک ہوئے اور یہاں سے سنہ ۱۳۳۰ف میں مڈل کا امتحان پاس کیا پھر اورنگ آباد آکر وہاں کے مدرسہ فوقانیہ (حال انٹرمیڈیٹ کالج) میں شریک ہوئے اور سنہ ۱۳۳۲ف میں میٹرکولیشن کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ایف اے کی جماعت قایم ہو جانے سے وہیں تعلیم پاتے رہے سنہ ۱۳۳۴ف میں وہ ایف اے کامیاب کرکے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوئے اور سنہ ۱۳۳۶ف میں بی۔ اے ہوئے پھر سنہ ۱۳۳۹ف میں ام۔ اے اور سنہ ۱۳۴۱ف میں ال، ال، بی کے امتحانات پاس کئے۔ جب جامعہ میں مجلس تحقیقات علمیہ کا قیام عمل میں آیا تو سب سے پہلے یہی شعبہ اردو میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے سودا پر علمی تحقیقات کے لئے نامزد کئے گئے اس مقالہ کی تکمیل کے بعد وہ چند ماہ کے لئے جامعہ عثمانیہ میں اردو کے منصرم لکچرار بھی ہوئے جس کے بعد سررشتہ تعلیمات کے سلک ملازمت میں منسلک ہو کر اورنگ آباد کالج میں کام کر رہے تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد وہ اپنے ماموں عبدالرزاق صاحب کی لڑکی سے بیاہے گئے تھے۔

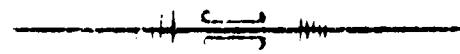
مرحوم میں میٹرک کامیاب کرنے کے بعد ہی سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو گیا تھا ایف۔ اے کی تعلیم کے دوران میں وہ اورنگ آباد کالج کے رسالہ "نورس" کے جو اس زمانہ میں جاری ہوا تھا اڈیٹر بنائے گئے۔ ازاں بعد وہ جامعہ کے رسالہ "مجلۂ عثمانیہ" کے بھی اڈیٹر ہوئے۔ مرحوم کی پہلی تصنیف جو کافی تحقیقات کا نتیجہ تھی "ملک عنبر" کے نام سے سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ تین سال بعد انھوں نے اپنے وطن کے رہنے والے مرہٹی شاعر ایکناتھ کی ایک مبسوط اور محققانہ سوانح عمری شائع کی۔ ان کی سب سے آخری اور سب سے اہم کتاب جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے وہ سودا کا معرکتہ الآرا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ کوئی چار سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے اور اس میں اردو کے مسلم الثبوت استاد سودا کی حیات اور شاعری کے متعلق مرحوم کی پانچ سالہ تحقیقات کے نتائج پیش کئے گئے ہیں۔ مرحوم نے مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب مؤلف "دکن میں اردو" کی

کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" پر جو تفصیلی تنقید لکھی تھی اور جو علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے وہ بھی ایک قابل قدر تحقیقی کوشش ہے۔

ان مستقل کتابوں کے علاوہ مرحوم نے "کتب درسیہ عثمانیہ" کی ترتیب، انگریزی لغت (جس کا اردو اڈیشن "انجمن ترقی اردو" کی طرف سے شائع ہونے والا ہے) اس کے ترجمے اور رسالہ اردو کی تنقیدات کا کام بھی انجام دیا ہے۔ نیز انھوں نے انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ کی قلمی کتابوں کی بھی ایک فہرست مدون کی تھی جس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ اس سلسلے میں انھیں بڑی محنت اٹھانی پڑی اور اس سے ان کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ وہ دکن کی مشہور سلطانہ، چاند بی بی کی سوانح عمری لکھنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے اور کوئی تعجب نہیں کہ انھوں نے اس کے متعلق کافی مواد بھی فراہم کر رکھا ہو۔

یہ ان کے علمی کارناموں کا ایک نامکمل خاکہ ہے۔ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ موت نے ہم سے ایک ایسے ادیب اور محقق ادب کو چھین لیا جس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں اگر وہ زندہ رہتے تو یقیناً ان کے قلم سے بے شمار کار آمد مضامین نکلتے۔ ان کا آخری مضمون جو یوم دلی کے سلسلے میں وہ لکھ رہے تھے نا تمام رہا۔ یہ "الموسیٰ" کے دلی نمبر میں مرحوم کی آخری یادگار کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

سید محمد ام۔ اے (عثمانیہ)



شیخ چاند مرحوم

شیخ چاند مرحوم تعلقہ پیٹن اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ وسطانیہ پیٹن میں ہوئی ان دنوں پیٹن میں ہر جگہ علمی چہل پہل نظر آتی تھی۔ لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق عام تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیٹن جو صدیوں پہلے سنسکرت علم و ادب کا گھر اور بڑے بڑے علما کا مسکن تھا پھر اپنی علمی کوششوں کے باعث ایک خاص حیثیت اختیار کرے گا۔ کھیلوں میں بھی پیٹن کے طلبا کو خاص امتیاز حاصل تھا جس طرح وہ مکتب کی جماعتوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اسی طرح کھیل کے میدانوں میں بھی وہ نمایاں تھے۔ مرحوم بھی انہی میں سے ایک تھے وہ ایک خاموش طالب علم کی طرح آئے اور کلیہ اورنگ آباد میں شریک ہوئے یہ کلیہ اورنگ آباد کی ابتدا کا زمانہ تھا مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں سے یہاں ایک علمی اور سماجی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ آپس کے تعلقات نے استاد اور شاگرد کو ایک رشتہ میں جوڑ دیا تھا۔ بہرحال مرحوم کو یہاں اپنے شوق کو پورا کرنے کے سب سامان موجود ملے۔ بہت جلد انھوں نے اپنے ادبی ذوق کے باعث حلقہ احباب میں نمایاں حیثیت اختیار کر لی۔ آپ کے شفیق استادوں کی صحبت نے اُن میں حقیقی ادبی ذوق پیدا کر دیا اور بہت جلد وہ اُردو کے سب سے بڑے محسن اور مربی مولوی عبدالحق صاحب کے سایہ عاطفت میں چلے گئے۔ وہیں پروان چڑھے ایک مشہور ادیب ہوئے، زبردست ناقد کہلائے۔ چند کتابیں تصنیف

گیس اردو باغ میں ایک بلبل خوش الحان کی طرح چہکے اور وہیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

مرحوم کی طبیعت میں سادگی، خلوص اور محبت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کی سادگی اور خلوص کی وجہ سے احباب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گو ان کا زیادہ وقت کام میں صرف ہوتا تھا مگر فرصت کے وقت وہ ایک اچھے ساتھی تھے۔ بلا کے زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش مذاق تھے جس محفل میں بیٹھ جاتے جان پیدا ہو جاتی۔ وہ اپنی طالب علمانہ شوخیوں کے باعث بہت مشہور تھے۔ ہر شرارت میں پیش پیش رہتے۔ جب تک اقامت خانہ میں رہے اس کی زندگی بنے رہے گو اس وقت بھی وہ اپنی انشا پردازی کے باعث استادوں اور طلبا دونوں میں ہردلعزیز تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے مگر ان کے رکھ رکھاؤ سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ وہ ایک ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔ نئے اور پرانے طلبا سے ان کا برتاؤ یکساں تھا۔ جو ان سے ملتا تھا خوش ہوتا تھا۔ اورنگ آباد چھوڑنے کے بعد جب انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں قدم رکھا تو وہاں بھی یہ سادگی اور شرافت ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز بنی رہی۔

جامعہ کی تعلیم ختم کرنے اور کافی شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی مرحوم میں غرور پیدا نہ ہوا۔ ایک مرتبہ ہم لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا نام بدل دیں مرحوم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس سے پہلے بھی ان کے کئی ساتھی اور حتیٰ کہ استاد بھی اسی قسم کا مشورہ دے چکے تھے۔ انھوں نے کہا مجھے نام سے نہیں کام سے غرض ہے۔ اس سے مرحوم کی سادگی کا ثبوت ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی نمود و نمائش سے کوسوں دور تھی۔

اتنی سخت طبیعت، سادگی اور علمی مصروفیتوں کے باوجود مرحوم زمانہ کی بے راہ روی سے نہ بچ سکے۔ یہاں بھی طبیعت کی انتہا پسندی دکھا گئے سخت محنت کے بعد زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنے کی دھن میں انھوں نے کبھی صحت کی پرواہ نہ کی اور یہ چیز ان کے لئے سخت مضر ہوئی۔ اپنی انتہا پسندی کے باعث ان کو بہت جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا کام چھوڑنا پڑا۔

یوں تو مجھے شیخ چاند مرحوم سے بیسیوں بار ملنے کا اتفاق ہوا مگر دو ملاقاتیں خاص طور سے یاد رہیں گی۔ ہم اپنے یوم کلیہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مجھے کلیات نظیر کی ضرورت تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں مقبرہ پہونچا سکوت چھایا ہوا تھا۔ درختوں کے پتے تک خاموش تھے واقعی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملکہ محو خواب ہے اور کائنات

اس لئے خاموش ہے کہ اس کی نیند میں خلل نہ ہو۔ میں بھی آہستہ آہستہ کیاریوں اور روشوں کو طے کرتا ایک چھوٹے سے دروازہ سے باہر نکلا سامنے ایک پہاڑی ہے اور دامن میں ایک مکان ہے منظر بتلا رہا تھا کہ اس کو بدعتی دور کے علما اور فضلا کا مسکن ہونا چاہئے تھا اور ایک عالم کو اپنے علمی کاموں کے لئے اس سے بہتر جگہ کوئی نہ مل سکتی تھی۔ رخانہ باغ سے گذر کر میں برآمدہ میں پہونچا ایک مسہری پر مولوی عبدالحق صاحب قبلہ لیٹے ہوئے تھے سامنے ایک ٹائپ کی کتاب کھلی پڑی تھی ایک ہاتھ میں پنسل کا ٹکڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں حقہ کی نلی تھی دوسرے کونے میں شیخ چاند مرحوم کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے میز پر چند کتابیں کھلی پڑی تھیں۔ میں کوئی پندرہ منٹ کھڑا رہا مگر کسی نے بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں بھی باہر آگیا۔ بڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید ان میں سے کوئی اپنی ضرورت سے باہر آئے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر ہمت کرکے اندر گیا شیخ چاند مرحوم نے مجھے دیکھا قریب بلایا اور ہم دونوں بازو کے کمرے میں چلے گئے۔ انھوں نے کلیات نظیر کا ایک نسخہ دیا یہ اورنگ آباد ہی کے کسی صاحب کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اور احتیاط سے واپس کرنے کی تاکید کی۔ دوران گفتگو میں تین مرتبہ مرحوم نے خدا حافظ کہا مگر بات کچھ اس طرح بڑھتی گئی کہ ان کو رکنا پڑا مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ میں نے ان کا وقت ضائع کیا۔

دوسری مرتبہ ان سے گذشتہ موسم سرما کے آغاز پر ملا۔ کوئی نو بجے کا وقت ہوگا جب میں مرحوم کے گھر پہونچا اپنے آنے کی اطلاع دی انھوں نے اندر بلایا۔ اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اپنے کسی ادبی شاہکار پر آخری نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا صحت خراب ہو چکی تھی بہت ہی نحیف ہو گئے تھے مگر چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی اور طبیعت میں وہی انکساری۔ جامعہ عثمانیہ سے بڑی محبت تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ جامعہ کی دلچسپ زندگی اور علمی سرگرمیوں کے متعلق سوالات کرتے رہے میں اپنے معلومات کی حد تک جوابات دیتا رہا۔ مرحوم نے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے متعلق اطمینان کا اظہار کیا وہ خوش تھے کہ اس شعبہ میں علمی زندگی موجود ہے۔ کچھ اپنے زمانہ کے واقعات بیان کئے میں تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھا رہا جاتے وقت کہنے لگے بھائی جب تک یہاں ہو آیا کرو۔ کیا خبر تھی کہ ایک ماہ بعد مرحوم ہم سب کو داغ مفارقت دے جائیں گے۔

صدیق احمد خاں متعلم سال چہارم

مقدمہ

(یہ مقدمہ مولوی صاحب نے شیخ چاند مرحوم کے تحقیقی مقالہ "سودا" پر تحریر فرمایا ہے)

مجلس تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ کا یہ پہلا ادبی اور تحقیقی مقالہ ہے جو شایع کیا جاتا ہے تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے یہ اس پائے کا مقالہ ہے کہ اگر کسی یونیورسٹی میں بھی پیش کیا جاتا تو قابل قبول ہوتا۔ اگرچہ یہ میری نگرانی میں لکھا گیا ہے لیکن جس محنت اور کد و کاوش اور تلاش سے شیخ چاند صاحب نے اسے مرتب کیا ہے اس کا حق انھیں کو پہنچتا ہے۔ علاوہ عام نگرانی کے اتنا البتہ میں نے اور کیا کہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے اور متعدد مطبوعہ کلیات اور دیوانوں کو چھوڑ کر سودا کے کلام کے تقریباً چھبیس قلمی نسخے اس کام کے لیے بہم پہنچائے جن میں صرف دو نسخے مستعار تھے۔ ایک حبیب گنج کا نسخہ جس کے لیے میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کا شکر گزار ہوں اور دوسرا انڈیا آفس کا۔ حبیب گنج والا نسخہ سودا کی حیات ہی میں مرتب ہوا تھا اس لئے اس میں پورا کلام نہیں ہے۔ انڈیا آفس کا نسخہ بہت مستند ہے کیونکہ یہ وہ نسخہ ہے جو خود سودا نے اودھ کے رزیڈنٹ مسٹر جانسن کو بطور پیشکش دیا تھا۔ اس کے سرورق پر ایک تصویر بھی ہے جو غالباً سودا کی ہے اور

اس مقالے میں جو تصویر دی گئی ہے وہ اسی کی نقل ہے۔

اس مقالے کی جانچ کے لئے مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی سے درخواست کی گئی اور مولانا نے ازراہ علم دوستی اسے منظور فرمایا۔ آپ نے مقالے کے مطالعے کے بعد جن الفاظ میں اس پر تبصرہ فرمایا ہے وہ مؤلف کے لئے نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ اثنائے تبصرے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"پورے مقالے کے مطالعے کے بعد میری یہ پختہ رائے ہے کہ شیخ چاند صاحب مقالہ نگار نے فراہمی مواد، مطالعہ، بحث و ترتیب و بیان مطالب میں پوری کاوش اور محنت کی ہے اور اس طرح پوری تیاری کے بعد مقالہ لکھا ہے۔"

"اظہار رائے میں تحقیق اور آزادی دونوں سے کام لیا ہے۔ ان کی رائیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا ذوق ادبی عمیق اور سلیم ہے۔"

"فہرست مطالب شاہد عادل ہے کہ مقالہ نگار نے اپنے مضمون کے تمام پہلو بحث کے وقت پیش نظر رکھے ہیں مقالے کے مطالعے نے برابر اس خیال کی تائید کی جو ابتدا میں فہرست مطالب دیکھنے سے وسعت بحث کی بابت قائم ہوا تھا۔"

"یہ مقالہ اس قابل ہے کہ جامعہ عثمانیہ کو اس پر مبارکباد دی جائے کہ اس کی معارف پروری، اور تربیت سے ایسا تحقیق پسند مقالہ نگار پیدا ہوا میں اپنی محدود واقفیت کی بنیاد پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پانے والوں میں بھی کمتر ایسا مقالہ لکھنے پر قادر ہو سکے ہوں گے۔"

قابل مقالہ نگار نے اپنے مضمون کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے تمام ضروری ماخذوں سے بخوبی کام لیا اور سودا کے کلام اور خصوصاً اس کی حیات پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ اور بہت سی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا ازالہ اور بعض نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی تنقیدی نظر پختہ نہیں ہوئی اور تحقیق کے اسلوب سے لوگ بہت کم آگاہ ہیں اور ہیں تو اس کے لئے صبر و محنت کی تکلیف گوارہ نہیں۔ مؤلف نے دونوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ یوں تو یہ بات ان کے تمام مقالے میں جا بجا پائی جاتی ہے لیکن جہاں جہاں انھوں نے غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا پردہ فاش کیا ہے وہاں ان کی تنقیدی نظر کی ضرور داد

دینی پڑتی ہے۔ ایک معمولی غلطی یہ چلی آرہی ہے کہ سودا نے میر کے مرثیہ پر اعتراض کئے ہیں اور اس کی زبان اور بیان کی خوب ہنسی اڑائی ہے یہاں تک مولانا شبلی تک[۵] اس غلطی میں مبتلا ہوگئے یہ ایک منظوم رسالہ ہے جو سودا کے کلیات میں شامل ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرثیے کا مصنف کوئی شخص متخلص بہ تقی ہے۔ میر نے کبھی اپنا تخلص تقی نہیں کیا۔ علاوہ اس کے رسالے پر حکیم اصلح الدین کا دیباچہ موجود ہے جس سے اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ اصل میں یہ ایک صاحب محمد تقی دہلوی عرف گھانسی تھے یا مثلاً یہ عام طور پر مشہور ہے اور تذکروں میں مذکور ہے کہ شجاع الدولہ نے بڑے اشتیاق سے سودا کو دہلی طلب کیا۔ لیکن تحقیق کے بعد یہ غلط ثابت ہوتا ہے اس قسم کی متعدد غلطیوں کی اصلاح اس مقالے میں کی گئی ہے۔ دوسری قابل تعریف یہ بات ہے کہ ہر دعوے کے لئے سند اور حوالہ پیش کیا گیا ہے محض قیاس سے کام نہیں لیا گیا۔

سودا کے کلیات اور دیوانوں کے جس قدر نسخے بہم پہنچائے گئے ان سب کا مولف نے بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اس سے ایک تو بہت سی لفظی غلطیاں درست ہوگئیں اور دوسرے کام کی یہ بات معلوم ہوئی کہ مطبوعہ نسخوں میں بہت سا کلام الحاقی ہے، یعنی ان کے بعض شاگردوں اور خصوصاً قائم کا کلام ان میں شریک کردیا گیا ہے۔ اور بہت سا ایسا کلام بھی ہے جو ان نسخوں میں داخل ہونے سے رہ گیا ہے۔ اسلئے اسکی ضرورت ہے کہ سودا کے کلیات کا صحیح نسخہ مرتب کرکے شایع کیا جائے۔

مقالے کی ترتیب بھی میری رائے میں بہت معقول ہے پہلا حصہ تمہیدی ہے جس میں سودا کے زمانے کے تاریخی اور معاشرتی حالات اور ماحول سے بحث کی ہے جس کا اثر سودا کی شاعری پر پڑا اسی حصہ میں یہ بھی دکھایا ہے کہ سودا نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت ہماری شاعری کی کیا حالت تھی۔ دوسرے حصہ میں سودا کے سوانح حیات اور کلام و تصانیف پر تحقیقی بحث ہے تیسرا حصہ تنقیدی ہے اس میں سودا کی اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی شاعری کا ہمارے ادب میں کیا درجہ ہے۔ چوتھے یعنی آخری حصے میں اس امر پر

---

[۵] دیکھو موازنہ انیس و دبیر طبع اول صلا۔

بحث ہے کہ سودا نے زبان کے بنانے میں کیا کام کیا ہے اور ہمارے ادبیات میں سودا کو کیا اہمیت حاصل ہے۔

آخر میں ماخذوں کی فہرست اور ان معتبر اور مستند کتابوں کے نام بقید سنین و اسمائے مصنفین درج ہیں جن سے مقالہ نگار نے استفادہ کیا ہے۔

مؤلف کا طرز بیان سادہ، مدلل اور متین ہے۔ اور اپنے مطالب کو اچھے پیرائے اور اچھی زبان میں ادا کیا ہے جو اس قسم کی تحریروں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔

مجھے مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ "پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری پانے والوں میں بھی کمتر ایسا مقالہ لکھنے پر قادر ہوں گے"

یہ مقدمہ چھپنے کے لئے مطبع کو دے دیا گیا تھا کہ اتنے میں یہ افسوسناک خبر پہونچی کہ شیخ چاند کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس سے اس کے تمام عزیزوں اور دوستوں اور خاص کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ بہت ہونہار اور قابل نوجوان تھا اور آئندہ اس سے بہت سی توقعات تھیں۔ اس کا ذوق ادب بہت اچھا تھا۔ اردو ادب میں اس کی معلومات بہت وسیع تھیں، تحقیق و تنقید کی نظر رکھتا تھا اور یہ سب کچھ اس نے اپنی محنت اور شوق سے حاصل کیا تھا۔ اگرچہ یہ مقالہ اس کے سامنے ہی چھپ چکا تھا لیکن افسوس کہ وہ اس کی اشاعت نہ دیکھ سکا اور جیسا کہ اس کا ارادہ تھا وہ اس کا اشاریہ (انڈکس) تیار نہ کر سکا۔

عبدالحق

راس مسعود

سر سید راس مسعود کی بے وقت موت سے ، ہماری قوم اور ملک کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ وہ دوسرے انسانوں سے کچھ جدا حیثیت اور شخصیت رکھتے تھے۔ وہ ذاتی اور خاندانی وجاہت، عالی ظرفی، فیاضی اور علمی اور ادبی ذوق کی وجہ سے نہایت ممتاز اور مستثنیٰ لوگوں میں سے تھے۔ وہ جہاں رہے ممتاز اور مقبول رہے۔ اور جب دنیا سے اٹھے تو صدہا اور ہزارہا آدمی اُن کے ماتم میں شریک تھے۔ اُن کے دوست اور جاننے والے تو خیر ان کی موت کو کبھی نہیں بھول سکتے، لیکن جن لوگوں نے صرف نام سنا تھا ان کو بھی ان کے مرنے کا صدمہ تھا۔

حیدرآباد میں اگرچہ وہ ناظم تعلیمات تھے لیکن اثر اور مقبولیت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے سررشتہ تعلیم کا رتبہ بڑھ گیا تھا۔ ان کے زمانے میں تعلیم میں جو ترقی اس ریاست میں ہوئی وہ نہ کبھی پہلے ہوئی تھی اور نہ آئندہ اُمید ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام میں اُن کے مشوروں سے بہت بیش بہا مدد ملی اور آخر تک اس کی ترقی و فروغ میں کوشش کرتے رہے۔

لوگوں کا کام نکالنے اور غریبوں کی مدد کرنے میں وہ بڑی دریا دلی اور فیاضی سے کام لیتے تھے۔ یہاں ہزارہا ایسے اشخاص ہیں جن کو اُن سے فیض پہنچا ہے اور اُن کے رہین منت ہیں۔ وہ حیدرآباد میں سب سے مقبول اور محبوب شخص تھے۔ اور اُن کی مقبولیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ جانے والے تھے۔ ہفتوں پہلے اُن کی دعوتیں شروع ہوگئی تھیں اور کوئی دن اور کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں مدعو نہ ہوں۔ پبلک کی

کی طرف سے اُن کی رخصت کا جو جلسہ ہوا وہ ایسا پُر شان، پُر خلوص اور دھوم دھام کا تھا کہ دیکھنے والا اُس کا سماں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اسٹیشن پر اس قدر ازدحام تھا اور لوگ اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کسی شخص کو یہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی اور کسی شخص کو اہل حیدرآباد نے اس جوش اور خلوص سے رخصت نہیں کیا۔

یہ کیا بات تھی؟ یہ اُن کا وسیع اخلاق اور اُن کی مہر و محبت کا اثر تھا۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت پر لوگوں کے کام آتے تھے وہ بڑے زندہ دل، بذلہ سنج اور شگفتہ رو تھے۔ ان کی صحبت میں مردہ دل سے مردہ دل آدمی بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اُن کے انتقال کے بعد میں جس کسی سے ملا وہ ان کی موت سے غمزدہ اور ملول تھا اور ان کی خوبیوں کو یاد کر کے افسوس کرتا تھا۔

حیدرآباد سے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی وائس چانسلری پر ایسے وقت گئے جبکہ یونیورسٹی کی حالت بہت سقیم تھی اور ساکھ بہت کم ہو گئی تھی۔ مرحوم نے وہاں پہنچ کر اس کے وقار کو بڑھایا، اس کی مالی حالت درست کی اور اس کی علمی شان کو ترقی دی۔ خاصکر سائنس کا شعبہ قایم کر کے اس کی علمی حیثیت کو دوبالا کر دیا۔ غرض کہ یونیورسٹی کی کایا پلٹ دی۔ یہ مرحوم ہی کی سی وجاہت اور شخصیت والا شخص کر سکتا تھا۔ اب ان کے بعد ہم دوسرا شخص اپنی قوم میں تلاش کرتے ہیں تو نہیں ملتا۔ ہماری قومی ترقی میں سب سے بڑی کوتاہی اسی بات کی ہے

گو مرحوم ہم سے ایسے وقت میں رخصت ہو گئے جبکہ ان سے ہماری بہت سے توقعات وابستہ تھیں، لیکن اُن کے اخلاق اور اُن کے نیک اعمال کا نقش ہمارے دلوں پر ہے اور وہ ان کی یاد ہمارے دلوں میں مدتوں تک تازہ رکھیں گے۔

عبدالحق

The players are so enthusiastic as to have broken their limbs, but are to be commiserated since their contributions are looked upon lightly.

On the whole they have been the means of discouraging other games as they happen to be so much in the way.

After surveying the activities of all these clubs we detect lack of spirit and sense of reality.

We regret that the department of Physical Instruction has so far succeeded only in maintaining a mediocre standard.

HOCKEY.

Mr. Ram Rao is the captain. As the destinies of the club have fallen into such able hands we can anticipate anything. And now success depends upon his decision to use his sense and skill in the coming events.

Mr. Mujtaba Yar Khan, the Secretary, is not only a keen sportsman but is also very sound in collaborating with the captain in the efforts they are making to raise the standard of hockey.

Mr. Khaja Barkatullah, the president, is watching these efforts with interest.

TENNIS.

Mr. Badruddin, B.Sc., the secretary, is very keen and of the needed sort. Five courts only are being run which are too few to accommodate the interested. As the game is popular, its is a pity that there are not more courts available.

We congratulate Mr. Badruddin on having managed to obtain a coach. We are hopeful of better days.

ATHLETICS.

We realise that Mr. Zahiuddin Ahmad the Secretary has done a great deal of work for this club, but we regret that much still remains to be done before the University Athletics can come up to the desired standard. We appeal to Mr. Asad Ali, the Physical Instructor for help guidance in this matter.

BASKET BALL - VOLLEY BALL - BADMINTON.

These games enjoy the direct sympathies of the Physical Instructors; and so far have justified the existence of their presidents rather than of themselves.

The College News

CRICKET.

This club is so celebrated among us that it is unnecessary and equally necessary to speak of it. It still enjoys the patronage of Professor Hosain Ali Khan as president. Mr. Ashraf Ali Khan is an experienced player, and is now captain. Mr. Riasath Ali Mirza is the secretary who has made his own contribution to the welfare of the club.

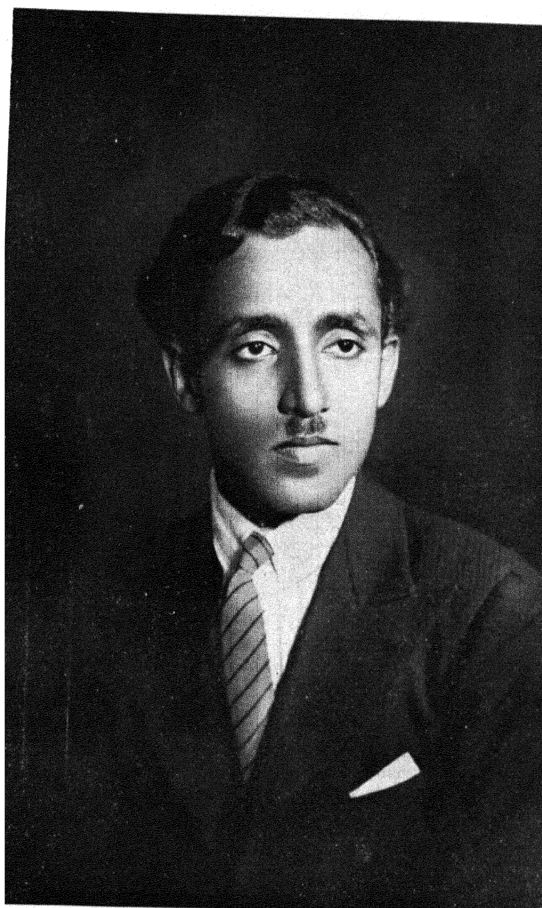
This season, the members of this club, in spite of all their enthusiasm have been victims of chance; we wish them better luck next time.

We cordially congratulate Mr. Abdul Waheed Razvi B. Sc., ex-captain a member of this club, on being selected to play for the Combined Indian Universities' XI against Lord Tennyson's Eleven.

FOOTBALL.

Mr. Maqsood Shah Khan B.Sc., the captain is well worthy of the post. His efforts are always to alter the spirit which so often adheres this game. His secretary, Mr. A. Karim, is a good addition to his side. The president, Mr. P.K. Ghosh has been doing much in the way of surveying and reviving.

Our Foot-ball team was able to put up not a bad show this season as we were really handicapped by our captains inability to 'head on'!



Mr. KHAJA NASRULLA, B. Sc. (Osman.)

Editor, English Section.

reflected beam of light passes a light wedge which tends to cut off variable amount of light, depending on the position of the mirror at the inistance. The remaining light strikes the recording film after passing through another optical system thus producing the so-called variable width sound record.

Fig. (4) gives a schematic diagram of a variable density recording system.

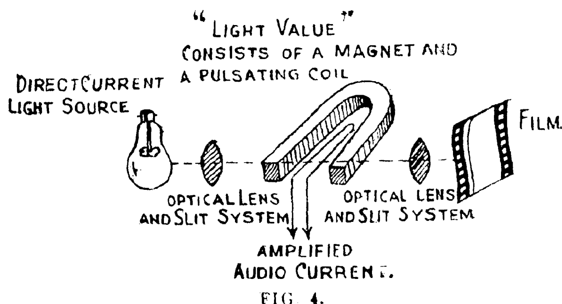


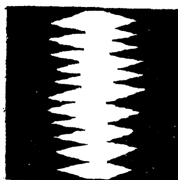
FIG. 4.

In this the image of an incandescent source is focused on a "Light Valve" formed of two ribbons of duralumin 0.0005 x 0.0006 inch. These carry the speech current and are placed in a magnetic field. As the current varies they move together and apart. Commercially they are at present tuned to 9500 cycles. In order to lower the level of background noise a reflected biasing current is passed through the ribbons when no sound is being recorded so that the gap merely closes. As the sound current increases the biasing current decreases and the aperture widens sufficiently to allow the amplitudes necessary for recording. This is the system of the "Western Electric Noiseless Recording", the most common type of the variable density Record.

Numerous difficulties had to be overcome in providing an acceptable film record but remarkable advances have been made and very good results achieved.

The other is the variable width method—a serrated band with tooth-like projections. Fig. (2).


FIG. 1.


FIG. 2.

The fundamental principle of these systems of recording is to transform sound pressure variations into light and photograph the latter on the film simultaneously with the action. The picture and the sound record are than printed on a single film side by side.

Fig. (3) gives a schematic diagram of a variable width sound recording system.

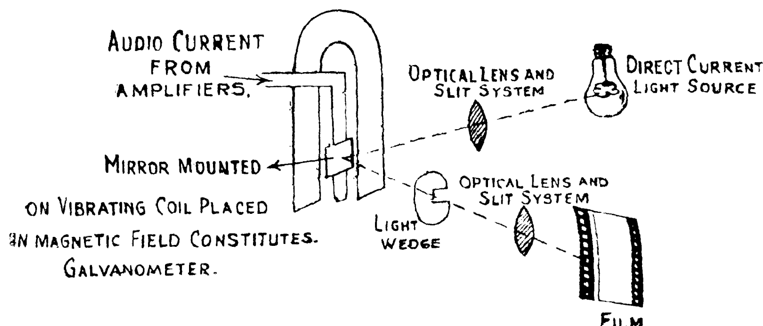


FIG. 3.

The light source is a direct-current incandescent lamp. The light from the lamp, after passing through a complicated lens and slit system strikes the galvanometer mirror. The position of the mirror depends on the instantaneous currents passing through it. The sound is picked up by a microphone amplified and fed to the galvanometer, so that the mirror rocks back and forth according to the sound pressure variations. The

and in the centre between them is laid a mass of plastic material made up of aluminium silicate, resin, shellac and barium sulphate. The top half of the press is brought down and the material is squeezed flat, the wavy lines of the negatives being impressed on the material. One negative stamps the top side of the record and the other the bottom side. The black record is then removed from the press and its rough edges are polished smooth.

To reproduce the recorded sound, the record is placed on the turn table which is set rotating. As the record goes round and round the needle fixed in the sound box moves in the grooves, and is vibrated to and fro by the undulations. The needle communicates its vibrations to a lever which shakes a mica diaphragm, and that, as it sets up waves in the air which exactly reproduce the sound waves originally made.

The development of the vacuum tube amplifier and the rapid and great improvements in vibrating instruments, such as the microphone and loud speaker, have opened new possibilities in recording and reproducing sound.

In talking-pictures we wish to record the speech or the music accompanying the action that is being photographed and then reproduce this recorded speech or music simultaneously with the picture.

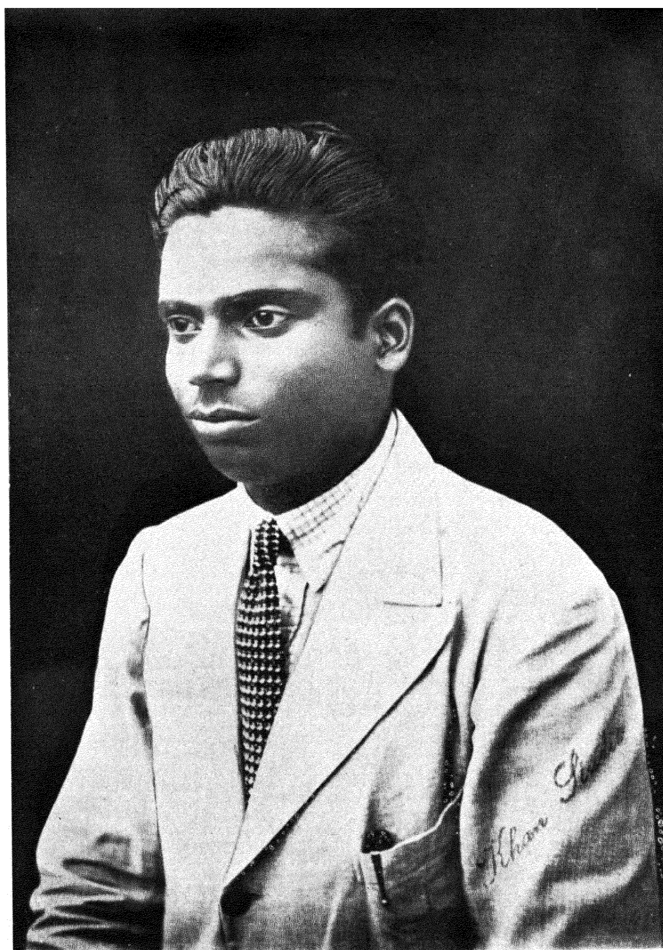
Two methods of recording sound on films are in common commercial use today. One is the variable density method--a series of striated bands--Fig. (1).

One of these methods employed in preparing modern gramaphone records with which every one is familiar is as follows:--

The musical sounds produce waves in the air which strike upon the mica diaphragm of a microphone and set it vibrating. This moves granules of carbon through which an electric current is passing, and the flow of electricity is varied. The current now passes to an amplifying apparatus through an eliminator, which smoothes out in equalities in sound. From the amplifier the current passes through wires wound round an armature placed between the poles of an electro magnet, on which is a stylus. The variation in the current from the microphone causes the armature to move to and fro. Attached to the armature is a stylus or cutting needle, and as this moves to and fro it cuts a groove in a revolving wax disc. The wax disc is so rotated that one inch of wax is cut and grooved every eighty-four revolutions (in the case of His Master's Voice Records).

The wax disc from the recording machine is passed to the plating shop, where it is first dusted with graphite to make it electrically conductive. The disc is now placed in the first electroplating bath to be coated with copper, and thus forms a negative of the record. The copper negative is removed from the wax disc and placed in the second bath to be coated with silver. This silver deposit when stripped off is a hard positive replica of the wax disc. The silver positive is now placed in the third bath and plated with nickel, the nickel negative thus formed being afterwards stripped from the silver positive and backed up with copper to form a strong base ready for stamping out the records in vulcanite.

To make the records, two nickel stamping disc are placed in a steam heated hydraulic press face to face



Mr. ABDUL MUQEEM, B. Sc. (Osman.)

President of the Students' Union.

Recording & Reproducing Sound

BY

SYED BASHIRUDDIN NIZAMI, B.Sc. (Osmania).

The word sound is commonly used in two different senses: (1) to denote the sensation perceived by means of the ear when the auditory nerves are excited, and (2) to denote the external physical disturbance which, under ordinary conditions, suitably excites the auditory nerves.

It is a matter of common knowledge that in a calm pool of water, when a stone is thrown, a disturbance is created on the surface of the water, which travels outwards in concentric circles. A similar wave is created in the air when one talks, sings or plays musical instruments. These are characterised by the to and fro motion of the air particles. The motion of the air particles creates variations of air-pressure at each point in the air. These air pressure variations can be made to actuate delicate membranes.

Sound was recorded early in the 19th century by Young, Wertheim, Scott and others. In 1876 Edison used a groove of varying depth pressed in a cylinder of tinfoil, which was the forerunner of the modern gramaphone. To reproduce sound he used a point travelling over hills and valleys of the record groove and connected to a diaphragm at the end of a horn.

Since this pioneer work, many methods have been tried with varying degrees of success.

The hill on which the village is situated consists entirely of iron ore and iron ore is found about four miles around the village. Coal and iron are the two things which ensure the prosperity of a country. Countries like Italy, Germany, Japan and Britain are ever ready to go to war for the possession of coal and iron mines and they have an unquenchable thirst for these two minerals. The mineral wealth of a country makes it rich or poor. For this nations fly at each others throats and for this very reason countries are always at logger—heads!

ALLA YAR KHAN,

B. Sc. (Senior.)

five decades its water has been wasted and no one thought of utilising it. We pitched a small tent near the tank and made all possible arrangements for the night. The place presented many things of interest to us. We all prepared our meals and enjoyed our dinner heartily.

The moon reigned supreme in the sky. It was shedding a flood of silver light and the whole tank looked like a melten sheet of silver. The moonlight reflected in the tank provoked pleasant feelings in our hearts and our happiness was beyond measure. Two of us had a great aptitude for angling. They set to it with great zest. The others were lost in contemplation of the glorious scene. For a while we became followers of Epicurus whose sole motto is "eat, drink and be merry, for tomorrow you will die." We were quite insensible of the passing of time and when we looked at our watches, it was nearly two o'clock. Very reluctantly we repaired to the tent and enjoyed a deep and profound sleep.

The cold morning breeze and the hilarious songs of the birds woke us early in the morning. The birds were singing hymns in praise of the Almighty, our Creator. We all got up and, after making our ablutions, offered prayers. We took a ramble around the tank in the best of spirits. The moon looked pale and had lost all its brightness. The reign of the moon was over and it was making way for the coming sun. At last the sun began to peep from the East. The marvellous scene of the sunrise held us spell-bound. We prepared our meal and enjoyed our breakfast in good humour. Again we set out on a walk and this time came across a stone of black colour. We examined it minutely. It was iron ore and was heavier than any ordinary stone. This incited our curiosity. We made for the neighbouring hill and our surprise knew no bounds when we found that it was an iron mine.

Sirala

This fascinating village is situated about eight miles from Mudhol, A taluque in Nanded Disirict. I think very few people have been to this place of enchanting beauty.

A party consisting of five people started on bicycle at 6-30 p.m. on the 17th of Teer '46 F. They proposed to enjoy a picnic in Sirala. The sun was setting. There were people of different temperaments in our company and yet we enjoyed the journey to the fullest possible extent, singing merry songs. The long shadows of the Acacia trees, thick shrubs, and small hillocks and the cool salubrious air of the countryside filled our hearts with ecstasy. In villages only do we experience the true pleasure of living and see nature in its true form and spirit.

We left the road and followed the cart-track. We had a rifle with us and we enjoyed the walk. In order to reach Sirala we had still to cover three miles. No sooner the sun was set than the crystal clear face of the moon appeared in the firmanent. The queen of Heaven was impatiently awaiting the departure of the sun. As soon as the sun disappeared it began to shine with a dazzling brilliance. The milk-white moonlight made our journey all the more interesting. The bright refulgence of the moon had dimmed the the light of the stars and they looked pale on the horizon. After fully enjoying the scene we resumed our journey and soon reached Sirala.

This village is situated on the slope of a hill. There is a tank resembling the Husain Sagar. For the last four or

The Epilogue

(Freely Translated)

(Here is my retort-modest to Milton's Paradise Lost, a free sort of a translation, intended to convey the sense of the original and rendered into English merely for "Fun's" sake! Let not any metre-master find fault. It is a specimen of my poor metre-mastery)

PARADISE?

But O for the cold—cold castles
Of the palsy-stricken Elysium divine
With its lusty streams of honey and milk—
O the very thought of it makes me sick
And cold!—O dear God, take back
Thy proffer : no more, of that mossy food
And grassy pursuits of Thy pastures green.
I am no cow—away!
Away with that Godly food,—away!
I want no milk. Grant me what I want
Aye, something fleshy to sustain my body
O God, I am sick mortally sick
Of this eternal laziness, O the monotony
Of the Heaven has made me degenerate.
No, give me back that "Verduous green
And winding mossy way", that a poet has sung.
O, "let my heat ache again and that
Drowsy numbness pain the sense
As if, of hemlock I have drunk."

Let me now most dramatically devise an ingenious method of inserting an epilogue in the shape of a slong composed in my own Lingua Franca, now that I am on the point of the leaving the "Pavitra" Parnassus of Urdu poetry. It is a poem bearing the head-line—"Paradise?", and I feel that it fits in well with the spirit of my message, delivered in an ailen language. Why should my own language remain unrepresented?—a language which, I think, is a superb monument of Hindu-Moslem Unity, a language in the making of which the great minds of the two communities have poured forth their very life-blood.

The sweet blue roads of air,
Scatter them, send them there,
Lavishly load them with your lusty song
Invisible, exquisite miniatures
Braving invisible seas for invisible shores.
Go it—you thrush—relieve your supple throat
Of each unlaboured, artless, perfect note:
And then be still. No rhapsody endures."

And so I am still, ye thrushes mute. I have had my say, and what is said is said—that is my message. It is no message—I have simply declared my mind, as that talented Irishman, the martyr of modern times, had declared his genius when he first visited the land of the prying Yankees. "Have you anything to declare"? they asked. "Nothing to declare ... except my genius," retorted the brilliant Irishman.

And so my task is done. Let me sing a song and end—music and song, that is my frailty. It is from Byron, but slightly modified:

"My task is done, my message hath ceased, my theme
Has died into an echo; it is fit
That spell should break of this protracted dream.
The torch shall be extinguished which hath lit
My mid-night lamp—and what is writ is writ
Would it were worthier—but I am not now
That which I have been—my wings are clipt
And I am a caged bird—for a year or so,
And the glow of my spirit is fluttering, faint and low."

It is they who make or mar life. It is they who are so frank and un-studied, they who, like the beautiful 'Skylark' in Shelley's most beautiful poem, "Sing because they must." Their talents many a time and oft, remain unrecognised. But they care not. They are divinely self conscious, and they humbly feel that they are "the un-acknowledged legislators of the world." That is all all is theirs, the rest is yours, the crumbs, Ye politicians and legislators!

So do not wholly or solely expect any teaching of English poetry, in the professional sense of the word, from me. I am no lecturer, much less an English lecturer. I do not believe in lectures. They are mere jargons, mere metaphysics. That is why when I want to talk seriously, I read a paper. I am never prone to lecture in that clownishly modern way with all its abominably modern method of "desk-thumping and loud-speaking conceit." Loud-speaking conceit? Yes, I am no "loud-speaker", but an artlessly inspired Moulvi, I am here, and here I stand to inspire you, to infuse poetry into you. I believe in the poetically "direct method" You may gain indirectly by this direct method by passing your examinations, but that does not concern me—it is no business of mine. No business of mine—I repeat again. Mine is to sing, yours to respond—to dance! Song and Dance? Yes, these are the only divine means to an end, that is, Success—Success in life, success in examinations. Take that you will, ye sons of Israel!

Let me poetize this poetically ungrammatical message with a superb poem—a poem whose very beginning is ungrammatical. See how transitively intransitive it is. Listen! marvel:

"Go it, you thrush—the boundless air is yours,
Send out your galleon fleet of notes along,

Shall change, shall become first a peace out of pain,
Then a light, then thy breast,
O thou Soul of my Soul! I shall clasp thee again,
And with God be the rest!

Now, with God be the rest—let us first learn to be restless. That "divine discontent" the immortal Shakespeare has spoken of, is sprung from the same discontentment of which I am at this moment making a "Prachar"! Discontentment is equally divine as discontent and freedom is their child—the reward of their labouring pain. Believe me, discontent is the "life-blood" of all inspiration; in fact, it is life, the poetry of life. Without it a poet ceases to be a poet. He may at best become a hopelessly clever versifier, a metre-master; but never an inspired being.

So try to unlearn what you have learnt so far. Never be daunted, never stoop to priggish purity in any form—purity of style, purity of blood. The so-called purity is mere verbosity, "a mode of imperfection". Try to be perfectly imperfect, an inspired being. Then only you can command or mould this imperial language with all its Jackdawisms and borrowings from the French, German, and Greek languages. But the English language is superb—just as our own Urdu language is superb with all its borrowings from Arabic, Sanskirit, Persian, and what not. But who made the two languages so rich, so superb? They who talk of Patriotism, and make a "Prachar" of Nationalism and language? No, not they, but those mere singers of whom a poet has sung so beautifully—

"We are the music makers,
We are the dreamers of dreams,
Wandering by lone sea-breakers,
And haunting the desolate streams."

as a matter of fact, of any language or literature. I have always stood, and stand, even now,--not as a professional lecturer or teacher but as a common singer. I am, no doubt, a strangely discontented man, and an indifferent and imperfect poet. We are all poets, as Carlyle has remarked; but my logic is different. I say we are all poets, because we are discontented beings, or at least hope to be so, as have been the heroic fighters of yore. Let us defy death, or even that greater curse than death, viz, cowardice. Let us brave dangers and difficulties, like the great heroic poet of the Victorian era, the consort of Elizabeth Barret Browning:

Fear death?—to feel the fog in my throat,
The mist in my face,
When the snows begin, and the blasts denote,
I am nearing the place,
The power of the night, the press of the storm,
The post of the foe:
Where he stands, the Arch Fear in a visible form,
Yet the strong man must go:
For the journey is done and the summit attained,
And the barriers fall,
Though a battle's to fight ere Guerdon be gained,
The reward of it all.
I was ever a fighter, so—one fight more,
The best and the last.
I would hate that death bandaged my eyes, and
Bade me creep past.
No! let me taste the whole of it, fare like my peers,
The heroes of old,
Bear the brunt, in a minute pay glad lip's arrears
Of pain, darkness and cold.
For sudden the worst turns the best to the brave,
The black minute's at end,
And the elements rage, the fiend voices that rave,
Shall dwindle, shall blend,

But, of course, there is one consolation that I have been asked as they say, to, teach English Poetry. All poetry is one. All great minds are one. All universal poetry and gifted poets are the common heritage of man and are not the monopoly of any clime or country. Shakespeare and Milton and Browning are as much our poets as Ghalib and Wali and Iqbal and Kalidas and Kabir and Tagore are ours. I do not believe in Imperialism. I defy all prestige and pedantry and grammer and idiom. An Englishman may be proud of his widely scattered empire and of his pure and grammatical and idiomatic English. Let him be proud of his prosaic English – I am proud of my inspired English, of my own 'Carlylese' which defies stereotyped phraseology and autocratic modes of expression. A brilliant countryman of De Valera once remarked that he disliked "the characteristic British face". I hate the characteristically British attitude in the domain of language and literature. I hate his offensively correct English which is "as filthy as his smoking" which offends the un-tobacconic mind of George Bernard Shaw. Excuse me, when I say that I also hate two things most – the horrible gramophone, and the abominable phonetics, because they make life and language mechanical. I know, gentlemen, that my staunch friend and very learned colleague and collaborator................ would have vehemently denounced me for this blasphemous remark of mine which is a grave insult to his favourite hobby, which, I am afraid, is very soon to become his most honourable profession! But let that pass—he is not here.

But excuse me for this digression. What I seriously want to say is: never attempt to learn poetry, but try to "lisp in numbers", or if you cannot possibly do so, try at least to hear those that lisp divinely. They are God's own men, His chosen men. Hear them, honour them but do not, for God's sake, clip their wings by making them silly lecturers and the fettered slaves of English language or literature—or

again called upon to handle English classes. Though I feel a bit of uncomfortable, yet it is such a jolly change to see oneself transmigrated, body and soul, into so many different forms! These sweet little ironies of life make me proudly, or rather conceitedly, conscious of some thing in me, that is that I am so indispensable in the eyes of Mr. Azam! Well, no more of such displays. Let me be a little more manly—excuse me, I mean ... a little more human and modest. And now, to return to business.

But one thing more, before I begin. You seem to wonder why I have chosen to read a paper. There are good many reasons which you would come to know presently, the chief reason, of course, being that I wanted to have this informal utterance on record because it springs from the very bottom of my heart. I did not like that it should be breathed out from my lips and "dissolve into thin air". Secondly, because, while I lay brooding over the message, I thought of your uneven standard of English which would make all my inane oratory fall on deaf ears. Excuse me for this outspoken frankness. Therefore, I deemed it proper to write out what I wanted to say, so that I might proceed slowly. And now, I shall proceed slowly - very slowly. I have poured forth my heart, my most genuine feelings, in this message of mine and......I do not want a word to be missed.

Gentlemen,

I feel very much elated and honoured, indeed, that you have all assembled, here, to hear an inspired Moulvi who has been forced to become an English lecturer. All credit goes to your Principal who, a clever magician as he is, has charmed me most willingly to accept this rigorous imprisonment extending over a period of one year. I hope you will sympathise with me and, as you pass away from this college, let me not remain here to see that awful day of this punishment prolonged to one of life imprisonment!

"My Message"

WITH

A Proem & an Epilogue

Before I actually deliver my message, I deem it proper to give a bit of my strange auto-biography, or correcter still, a bit of my own "Transmigro-graphy". Transmigro-graphy? You seem to wonder what I exactly mean by this strange word which you, I am sure, would not find in any English dictionary. Well, it is a word which I have coined to describe my own helplessness which resembles the condition of that unlucky stone which rolls about and "gathers no moss", as they say. Well, I am such a transmigrated being, but never mind—I am what my maker has made me, and I am proud of my unmossiness, that is, that I am, or rather have been, so useful to the institution which proudly claims to be the oldest institution in this historic city of the celebrated Charminar.

I began my career in this great institution as an English teacher, as they say. A little later, I was (quite un-Bottom like) "translated" a turned into a Moulvi, called upon to handle Urdu classes wherein, I remember well, that, in the beginning, I made gigantic efforts to out-beard those that were my Herods! A few years later, I was asked to share the charge of the Persian department in the college section. It has again been my proud lot to see, in this brief span of an academic life, the truth of the very old English proverb most vividly manifest itself, viz, that "history often repeats itself"! After so many vicissitudes of fortune, I am once

Sir Akbar Hydari, feeling that the examination of these possibilities and the facts connected with them would be good exercise for the students of the Osmania University, has given his approval of the plan of the colony for the research work being near the University. The Co-operative Department is issuing a leaflet with appreciations received from the foremost people in all parts of the world, including conspicuously King Edward, the present Secretary of State, and a recent Under Secretary.

Once more the Calcutta University publications insist that in these days when we feel that some thing energetic has to be done and for every reason we must be constructive, we must diligently study all the aspects of this great modern possibility of co-operation.* Organizing educative employment, they point out specially, is the hopeful way to start. They show how easily it might be extended to poor children both in the villages and the towns and then be a hopeful solution for India's great problems of popular education and unemployment even among non-graduates and those of little education only.

We have now the continued and repeated successes of the Swiss pioneers, the late Sir Asutosh Mookerjee's splendid action, Senator Sheppard's bill and the official notice of eight countries to encourage us to apply ourselves diligently and patiently to the research work of this new educational and co-operative system.

Endorsement has come from every side of the great idea that we must concentrate our efforts on saving the young and that then they will save us. To give the young the education in the Golden Rule, the training to service and in enthusiasm which means moral and physical health to them, we must establish the co-operative organization, and it to give co-operation generally the new impetus in the new and hopeful direction that promises to make it solve our greatest problems.

* See the booklet published by "Capital" of Calcutta "Co-operation and the Problem of Unemployment"; see also "The (London) Times" Educational Supplement, 15 I and 10 II 1920, 6 and 13 V 1922, 2 IX 1923, 17 I and 26 X 1925, seven full column notices and many other leading papers.

villagers for their products. They would need to sell only very little indeed. The villagers and the colony shareholders would buy things of them. Their goods would be cheap because they would be produced under favourable economic conditions. There would be no middleman.

Even in the beginning, the colonies would be able to take payment to some extent in labour. Ultimately it would be the great feature of the system. Taking payment in produce, the colonies would become dealers in produce. A very important part of their functions might be grading and marketing.

It might seem that an enterprise, devoting part of its profits to educative employment for the young, to paying school masters for the villages, to paying doctors in kind to visit and open dispensaries—with its own products and others obtained by barter would be quasiphilanthropic, and not co-operative in the strict sense of the term. But that is not so. It would be sound business for those financing to stipulate that some of the profits should be spent in a manner which would make the whole country side vitally interested in supporting the colony and looking after it closely. In the colony every industrialist would not be interested only in his industry, but in all the colony industries because, again, directly or indirectly, he would get everything he ordinarily needed from them in barter for his products. The schoolmasters would depend practically for their living on the colony, the doctors would be interested. These all, and the villagers would look after the colony very closely, forming their colony committee or co-operative society. Purchasers would also be members and be interested. This would give the shareholders "gilt edge" security for their fixed interest, and so be financially sound.

managers their salaries, with credit with the co-operative organisation, which the industries would purchase by supplying it with their goods.

It was to lead people to study these wonderful developments of co-operation which have now been made possible that Calcutta University established a special lectureship and carried out its great propoganda to show that the co-operation we can now establish between capitalists, workers and consumers for production for use is fraught with hopefulness* promising not only to solve the problems of unemployment in the towns and under employment in the rural districts but also to humanize our whole industrial system by leading towards the combination of industrial and agricultural employment which is sound economical and the greatest of all boons that could be given to the town worker and his family.

NO MORE HOPEFUL FIELD FOR ITS APPLICATION THAN THE INDIAN RURAL DISTRICTS.

Co-operation between capitalists and workers for production for use would lead us, beginning with colonies, to developments of Co-operation that would enable us to carry out rural reconstruction that would be paying enterprise of the greatest financial promise whilst immensely benefiting the peasants and educated classes. The rural colonies would be sound enterprise for all concerned. The various little industrialists would be sure of a living, because they would produce, between them, most of the things necessary to them, and obtain almost all the others by barter with the

* Proceedings of the Executive Committee of Post Graduate Studies in Arts. Calcutta University. No. 29 of 10th March 1920. Over 20,000 books, booklets and pamphlets were printed and sent out with 2,500 printed circular letters from the University.

it to others, as for instance to workers they might employ improving their holding. In that manner the colonies, though their equipment might be industrial and perhaps centralised in some localities, would be the means of bringing about agricultural improvements in the villages. As the organization developed, the doctors and school masters would be paid in credit for which they would draw almost any ordinary goods they wanted to have. When they wanted some thing the organization did not supply, they would be oble either to buy it from a dealer paying him with a cheque on their account with the co-operative organization—which would very often be as good as a money draft to him—or they might cash the cheque with a friend who would make good use of it to take things he wanted from the organization.

USING OUR GREAT POWER FOR THE GOOD OF THE PEASANT.

As the organization grew, the variety of commodities it supplied would increase. Very soon the peasant would be able to arrange to pay his debts with the credit he earned. Ultimately he would be able to pay his rent. We should then have the old system of payment in kind in a new and vastly improved form, and rural prosperity such as we have never known yet, because the powerful means progress has given us would come into more and more general use and for the good of the peasants.

RURAL RECONSTRUCTION AND INDUSTRIAL DEVELOPMENT.

India is alive now to the fact that rural reconstruction must include the development of industries. Industries would spring up everywhere when the colony co-operative system developed and made it possible not only to pay the workers in kind, but share-holders their dividends, and

end to unemployment, the plan having been rendered easy now by our labour—simplifying methods, which enable almost anyone to work usefully in connection with any kind of production.

A SIMPLE BEGINNING IN THE INDIAN RURAL DISTRICTS.

Thus the system of payment in labour having been rendered possible now by labour simplifying methods, we are promised a new industrial revolution, one that will do good to all classes. The Calcutta University publications insist specially on the fact that simple beginnings could be made with an organization that would give the Indian peasant the clothes and other necessaries he wants, medical care, educational for his children, the means to improve his holding, for payment by work in a colony. He might go to the colony himself for a month or so in the year, or send his son to it for a few years, to get an excellent training in every way—a lad of twelve even would very soon be useful, or he could send some of his women folk, the villages making suitable arrangements for them.

It will be a privilege for people to make the payments in labour in well organized colonies, not a sacrifice. They will pay, not by hard toil, but by the help of machinery. Each village or group of villages could have its colony its educational centre also. Then the Indian masses would begin to benefit by the immense power that progress has given us, under a system combining individualism, capitalism and co-operation.

AGRICULTURAL IMPROVEMENTS.

We may hope that soon peasants who earned credit with the co-operative organization would be able to transfer

and of producing things in great abundance in a good organization, but with little good to the masses, resulting, on the contrary, in insecurity, depression and unemployment.

The whole evil, however, will begin to be turned into good when we do as Senator Sheppard's bill proposes, and give people "access to these powerful means of production" to produce things for their own use. When we do that, the machine will simply help people produce what they want more easily. It is when it is used only in competetive trade, to intensify competition, and not at all for production for use that dire havoc results.

Educative employment and its labour army would illustrate the utilization of machinery in the way that makes it man's useful servant instead of his too potential enemy. They wouuld organize the young in a co-operative organization that would give its workers necessaries for payment in labour. Such a co-operative system could always have employment for people in a developed country, because it would send them out to work in various establishments for remuneration in commodities—credit as already explained—and then (mainly) divide the produce among them, among the people engaged in the administrative work, and among those who provide necessary capital. It would operate in different ways in the less devoloped countries. These are dealt with specially in the Calcutta University Publications. It is the old idea of co-operative production for use applied in new ways that have now become possible. The plan has always been the production of goods in one way or another by the members, the co-operative store taking what each one contributed and giving him his share corresponding to his contribution and in the variety of goods he wished to have. The brilliant hope that has now shone on the horizon is that of beginning with the young for education and training. From that beginning we may hope to go on and put an

main passive spectators of this. We cannot refuse to do for our children what the Swiss have done for their tramps !

As Sir Asutosh Mookerjee, Senator Sheppard and Sir Akbar Hydari have seen, such results as these call us imperatively to push forward with various special applications of the economic principle, beginning with educational colonies.

AMERICA AND THE COLONY PLAN--THE "UNITED COMMUNITIES" BILL.

Senator Sheppard has placed before the United States Senate a bill to solve the whole problem of unemployment on the colony plan. The bill has been referred to committee.

A remarkable feature is that, quoting its words, the aim is to provide for the "highest standard of living consistent with the available skill and ... the use of the most productive type and pattern of machinery equipment reasonably available" (Section 15) of the bill. Sir Asutosh Mookerjee's great appeal to Indian patriots was to render the best service to their country by establishing that form of co-operation and he took the lead in connection with the Modern Co-operative Agricultural Association Ltd., that was formed to carry out the idea, but most disastrously died at the moment when it was about to commence work.

EDUCATIVE EMPLOYMENT AND THE GREAT CO-OPERATIVE MOVEMENT.

The purely economic aspects of "educative employment" and educational colonies are of the greatest importance and profoundest interest.

The dominating fact of our time is our rapidly improving means of reducing the labour of production of necessaries

EXCELLENT AGRICULTURAL AND UPLIFT SCHOOLS.

The colonies would in every case be the best practical agricultural schools. They would also be schools of practical co-operation. In them peasants would learn to improve their dietary. Young lads would be under educational discipline. All would receive elementary education.

THINGS THAT HAVE BEEN DEMONSTRATED.

In appealing to people to join us or help us in this most hopeful research work of our time, our great argument is that beginnings have been made with striking success and must be followed up. They have illustrated in different applications the immense power of production for use with modern labour - simplifying methods, and have shown that we must vary and multiply applications.

Mr. & Mrs. Kellerhalls have demonstrated the successful working of the modern colony system with the very worst workers, as well as in an educational application. Their labour colony receives many "unemployables". These often remain a couple of months only, so that there is extraordinarily little time to train them. Nevertheless, owing to judicious use of modern methods, the establishment pays practically like a commercial undertaking. "Unemployables" pay by their labour for their maintenance and earn their bonus. A very relevant detail is an apology contained in the report for the high expenditure on food, laundry and books and papers for the inmates. It is explained that they are fed well so that they may be able to work well, that the influence on them of being encouraged to dress decently and given recreation is wholesome, and contributes to efficiency. The bonus on leaving further encourages them. All is paid for by labour classed as "unemployable", but made useful in co-ordinated production for use. Clearly we cannot re-

and, after a time, a bonus to enable them to make a start in life. Colonies might therefore by themselves solve the whole problem of unemployment among all classes.

But we have no need to establish special colonies for the educated unemployed. We should employ all in different kinds of educational colonies. As the system developed the employment would improve, and the colonies would become practically "United Communities".

COLONY WORK FOR PEOPLE AWAITING EMPLOYMENT.

That is the hopeful kind we must have now. It might soon become possible without hardship, but on the contrary with great benefit to all, to make turns of useful social service in the educational colonies for the rural classes and urban working classes, cumpulsory for those receiving education helped in any way by the State, and a condition for government service in certain grades. In the colonies the young people would be able to earn their maintenance whilst rendering social service. Having necessary experince they would be able, with very little capital, which could be advanced to them if necessary on their joint security, to enter into various partnership arrangements with neighbouring cultivators, more or less on the lines of familiar produce sharing systems to help them to produce more for use, also to carry out more profitable kinds of commercial cultivation. They would be working partners, giving help at moments when extra help is so valuable, taking, as their shares, useful products for their own use. The arrangement should be of great advantage to the cultivators and should illustrate another of the right "back to the land" plans for the educated classes. They might easily obtain their principal foodstuffs in that way, whilst being engaged in the colony in industrial, commercial or teaching work.

kinds of employment to save some money and return to their villages with the means to improve their condition there. We know how their earnings are filched from them now, and how they are not led but positively driven, to spending them badly. We need colonies consisting simply of the co-ordinated plots in which the workers would work half their time, producing their own food, working the other half in a factory, or in any kind of employment, for a money wage at first, though ultimately for remuneration in kind. The important thing is that they would be required to enter into an agreement which would be framed to ensure as far as possible that the earnings would be used to pay a debt, to improve their holding, or to equip them for some industry. That would be the condition of admission to the colony and to the employment. With the co-operation of employers most important things might be done in that way for rural betterment. We shall study this great possibility.

"EDUCATIONAL EMPLOYMENT" AND UNEMPLOYMENT AMONG THE EDUCATED CLASSES.

Colonies for "educative employment" would attack the problem of unemployment among the educated classes, as well as that of rural betterment, on every side, and should be a rapid and complete remedy for unemployment.

Owing to technical progress, the Swiss pioneers Mr. and Mrs. Kellerhalls have been able to demonstrate in their country, and Senator Sheppard to plan in America, a colony—"United Communities" system in the American term—that will not be a mere refuge for disappointed people but that will become more and more as it develops an avenue of hope for the ambitious. Progress has increased the productive power of labour enormously. Consequently a good modern colony organization can give its workers their maintenance

at first colonies to which weavers will come and work with small power looms, Chamars in little tanneries, Muchis in leather-goods workshops, with some good equipment, wood and metal workers similarly. Youths and adults wanting education will also come and cultivate plots scientifically co-ordinated. Co-ordination will enable them to get their living for half a day's work on the land and spend the other half working in one of the industries, with time left for elementary and technical education. With modern methods there is work in connection with industries that people can very soon learn, and that all wood consent to do.

These colonies will serve the cause of education and rural betterment, in various ways. Their well equipped workers will produce appreciably more than they could under village conditions. They will pay in suitable ways for the advantages they will receive, so that the colony will not only pay interest on capital, but also do important social work. As the organization develops this social work will include paying teachers and doctors, mostly in kind, and paying for other services for the villages - see again the Calcutta University publications—the reports of the various committees that have examined the plan, and p. 26 of the address to the Osmania University Economics Society.

There are many ways in which rural colonies might be organized, according to the people who joined. Little partnerships of qualified people might take one of the industries, or there might be someone in the position of master, and employer of the other workers. When local craftsmen were employed, who had their local customers, they might be paid at least partly in kind.

"FACTORY COLONIES" FOR PEASANTS.

One of the most important things to be done for rural betterment is to give peasants every facility to obtain various

THE "LABOUR ARMY" PLAN AND HOW WE SHALL BEGIN TO PUT IT INTO PRACTICE.

We shall from the first illustrate the correct economic plan of "educative employment". It is not contemplated that there will be great farms and industries specially for the youths to work in. The plan is to form them into a labour army going out to work in a suitable way in various private undertakings for remuneration in the goods they want for their own use and for their organization. They will work for payment in the shape of a bill to draw goods from the industry. Their co-operative store will take this bill. With it, it will take whatever goods it wants from the industry, and give the young worker the value in the goods he needs.

Exemplifying the principle, we shall get people to join our pioneer colony and establish suitable industries. These will by anything from the small plots of land cultivated in well planned co-ordination, to get the most from them with the minimum of labour, to workshops with power, for various small manufacturing, the members co-operating with one another in every practically feasible manner. The public will be appealed to support us by purchasing good products at good market rates. With this co-operation from the public the colony will give its members facilites for diśposal of produce, it will also give technical advice and guidance, in some cases capital. The members will pay for the valuable help by assisting in the educational work.

RURAL COLONIES FOR OUR NEXT STEP.

As soon as possible we shall turn our attention to exemplifying the organization of rural educational colonies, on the lines of that which the Rural Reconstruction Association is also establishing at Bhade in Bhor State. They will be by far the most important factor in rural uplift. We anticipate

We shall take also lads in occupations that do not give them any prospects, inducing them when possible to take their job in pairs, on some system of rotation suitable to the job, so as to spend half their time in the colony learning something that will open a future to them. There are numerous cases in which such an arrangement would suit both employer and employee and the whole problem of unemployment among the poorer classes of educated people might be solved in that way, making many jobs employ two people, as well as giving them hope, ideas and ambitions, bringing some joy into their lives illustrating the hopeful way of leading that class to solve its problems by working on the land and in industries.

We shall hope that good illustrations of the principle will result in many colonies coming into existence. We have already a suitable place in view for another to illustrate further the principle of the right kind of land work in the case of educated men of higher qualifications : the school namely in which the teachers will be half teachers and half industrialists, or cultivators bringing up their pupils to be practical workers and earners. Once the principle illustrated such schools might bring large numbers of graduates to the land and industries in that right way so giving splendid employment to many.

Educational colonies for poor boys will differ from the others only in that the industrial work will be predominant in them. A good organization for production for use - earning (or saving) the distributors's wage as well as the producer's will enable them to make more valuable contributions to their homes than the money wage they would generally get, whilst enjoying the priceless advantages of the colony training.

enable the adolescents to earn so well that they can be kept in the organization, and then the children can be useful helping them. Thus the organization must always have its well trained adolescents, some adults, and children, all in well organized co-operation.

We shall have small plots of irrigated land cultivated by little groups in partnership, but systematically co-ordinated, with every arrangement for mutual help, also for technical assistance and advice. The crops from each plot will belong to the partners, but a cooperative organization of the groups will arrange all advantageous specialization by various groups, arrange also for exchanges of produce and mutual help, and to settle questions that may arise between the members of groups.

The adolescent element of our pioneer colony will consist of youths who have come to realise that their purely literary education has led them into the wilderness, and who will come to our colony to learn practical work.

For these we shall also endeavour when necessary to find a half day industrial work by which they will earn.

The first thing to be done is to take advantage of the important economic fact that people employed for about one to two hours a day on an average, producing certain classes of food stuffs to consume them themselves, to take them home, or to deliver them to a customer who will pay the market price, work very profitably for that hour or two, because they earn —or save fortheir benefit—the producer's, middleman's and distributor's wages.

That is the the fact that properly taken advantage of, in a suitable organization, opens up many great possibilities, which we shall explore practically.

Our colony is to be situated near the Osmania University so that we may have as much help as possible from it.

THE FIRST WORK FOR OUR COLONY.

Looking at the question from the point of view of what we shall do first, and what we shall hope to see it lead to soon, we shall consider the general educational aspect.

From the educational point of view alone everyone knows that good and really useful practical work is the very best thing for the young. First of all it gives them the great idea of useful service the great Scout idea which all have learned now to appreciate. Secondly good practical work, and good games alternating with class work, can keep them zestfully occupied all day, as variety is life to the young. Keeping them happily busy means, in a word, doing all that is best for character as much as for health, and to make them grow up well disposed as much as practical and capable.

From the beginning therefore we shall seek the co-operation of qualified people, members of the University if possible, to bring into existence a school to carry on the work of that which was established with the same object in Calcutta by the late Maharajah of Kasimbazar, and to carry the idea further. We shall begin with a small number of boys and tutorial classes as wasdone in Calcutta. The boys will pay moderately. Those helping us will be moderately remunerated. It will give an opportunity for students to earn.

Children can work usefully as helpers to workers with some experience. "Educative employment" has become possible now because, with good modern methods, it can

guiding them, in a great cooperative productive organisation that will give a perfect solution for education problems for the poorest as well as for the rich and which could make the children of the poor well off, using good methods to produce for themselves most of the simple things they need for their welfare under happy natural conditions. Incidentally it would give the best possible relief for poverty, and above and beyond everything else, it would enable us to bring up the young in their co-operative organization under the conditions that are happiest and best for them, and very specially morally best, with good productive work and school work. alternating in a way that would keep them joyfully busy all day, and with time for the best games and sports, to complete their happiness, and development in every way. Economically all that is absolutely possible now, and it was to appeal to people to apply themselves energetically and practically to finding the ways of realising the possibilities that the late Sir Asutosh Mookerjee, supported by the late Lord Sinha, Sir Dinsha Wacha, Sir Dorab Tata and many of the most prominent Indians of the day, launched Calcutta University on to a propaganda that was acclaimed in the Press from Calcutta to San Francisco and written about as having been "perhaps without a parallel in the annals of any learned body". It was to awaken people to realise the fact that progress calls us now to study schemes of education and child and Juvenile welfare very far beyond anything dreamed of in the past.

Good and in some cases most brilliantly successful work has been done in other countries, giving striking illustrations of the practical application of the fundamental principle, and the Right Hon'ble Sir Akbar Hydari has felt that Hyderabad must make its contribution to the practical research work.

The Hyderabad Pioneer Educational Colony

Pending the publication of Captain Petavel's Report this summary of it is being issued for the information of those who wish to help the pioneering work that is to be undertaken under the supervision of the Co-operative Department.

THE AIMS OF THE PIONEER COLONY.

The consensus of opinion revealed by the world-wide enquiry on the economic lessons of the Great War carried out immediately after its conclusion by Calcutta University, on the initiative of the late Justice Sir Asutosh Mookerjee, declared unanimously and emphatically that its lessons had shown that educationalists and co-operators must combine to work out practical schemes of educational employment for the young that will pay, and that when necessary, as in India* will make education self-supporting. Our colony is being established for research work in that direction.

The principle is essentially the organization of the adolescents, with the children helping them, and a few adults

*For details see the report of the Royal Commission that examined the suggestion in 1917, the Calcutta University Commission, and issued an appendix about it, (Appendix Vol. VII p. 18). The Bihar and Orissa Vocational Education Committee also issued an Appendix, followed by a Resolution in the Legislative Council offering help to those who would try to do pioneering in the Province (365 D. Feb. 10th 1925 Section 25). The Government of Bengal Unemployment Investigation Committee recommended it to Government and made three lengthly references to it in different connections (See its Report, and Appendix Vol. II p. 61 and 231 and App. Vol. III p. 15). Many other governments have issued information about it officially.

his followers to believe that he had given up his pursuit of supremacy and acquisition. But once it came his way he pounced upon it and laid his hands upon what he could easily make his own.

Grey Wolf—the most appropriate name given to the biography of a man who in all respects resembled the ferocious animal as far as his bravery, manliness, lack of passion and ambition are concerned—is a book which has met with the approval of all and the admiration of many who have read it.

It is unique in its representation of truth and emotion, which is the greatest stimulant to a man of action. Ambition influenced by emotion, passion and feeling achieves its highest degree of perfection; and all these details of the workings of a man's mind one portrayed in the great book.

Most people believe that Armstrong has only seen and depicted one side of the picture. But I maintain that he has dealt with the details of Kamal's life with no prejudice, and has tried to render exactly what he thinks Kamal to be and what Turkey has become under his guidance. Kamal has inspired in his countrymen a sense of superiority, and by flattery and by lifting their dead hearts to enthusiasm he has revived their talents. All this was good, but to achieve his dominance he should not have persuaded them to think that other nations were their enemies. Kamal indulged also in the dangerous practice of rooting out his political rivals.

If an author expresses all these truths impartially, he should not be regarded as cherishing personal or national prejudices.

The book is great as far as it has told what the author deemed it his business to tell—the truth and only the truth.

S. M. ABBAS,

4th Year

A Great Biography

Only recently I had occasion to read Armstrong's Grey Wolf—an intimate study of Mustafa Kamal, the dictator of Turkey. A really great book, it reveals the activities and intrigues the obscure general indulged in to secure the position he has now achieved. As a reviewer remarked, it was the duty of Armstrong to tell the truth and he has told it. He has penetrated deep into Kamal's intimate affairs and opened them out to the world that we may know and be guided by his policies.

According to the author, Kamal would not have become a dictator had the Great War not broken out, where as Mussolini and Hitler established themselves firmly in the Revolutions and political controversies and gained firm positions and leadership. Kamal was a General and possessed speculative insight to a very high degree. In the Gallipoli campaign as in various others, he obtained victory by his powerful imagination of things to come; and by making the people of Turkey believe that he was the only saviour of his country, as opposed to other leaders such as Fethi, Pefet, Abdul Hameed and Abdul Majeed, whom he pointed out as representatives and instruments of the British Government, he came suddenly to the forefront and proclaimed his right of sovereignty and protection.

He was a very staunch supporter of his nation and executed even his friends when once they opposed his actions, but what was most remarkable in him was his gift of utilising an opportunity for which he often waited so long as to lead

money in elaborate garden parties, luncheons and other social functions to which will come invited all the elite of the Imperial Capital. And distinguished visitors from abroad shall be received with stately splendour and shown Golkonda, the mine of Kohinoor, and Osmania University, the Mint of intellectual sovereignty.

In the Assembly I shall devote my attention to the problems of reform, be they social, political, economic, educational and what not I shall vehemently plead for the reservation of some foreign scholarships to students prosecuting their higher education in the Culinary Art and the Sartorial Science. The inclusion of cosmetics and toilette in the curriculum of our ladies shall engage my immediate attention; our savants of Vedic philosophy shall have the advantage of a year's practical training in the Arctic Home of the Vedas.

In everything I do, my sole aim shall be to advance the prestige of Hyderabad and its university. You may rest assured that my pre-eminence will secure me a place in every standing committee. My advice will be sought for the solution of numerous national problems long before tackled with success by us.

Hence I most humbly pray the educated men and women of my constituency to give me their first preferential vote.

T. R. PADMANABHACHARI,
(M.A., CLASS)

though few others have denied it. Mr. Dhunjeebhoy, the Photographer, whose aesthetic taste is unquestionable, observing my attractive countenance seated me in the centre of a group photo.

My rivals are spreading propaganda that I am not interested in games. It is untrue, for I am a sportsman in the true sense of the word. I never missed a football match in which Maqbool or Anvar played, nor was I ever absent from the Fateh Maidan when Zaidi took part in the heats. I am myself a good player, and I made my debut as a full back behind the net. In tennis I scored the largest number of runs during the last season, thus breaking the record of Gyanchand.

As an unpaid probationer for exactly three months in the Judicl Branch, I gathered enough experience of legislative and official procedure.

Lastly it is to be remembered to my credit that I am an Independent candidate standing on no party ticket. I am not bound by false pledges and empty promises of any political party. I am free from the rigid rules and conventional attitude of party politics. As your true delegate I shall serve humanity to the best of my ability and not be a weather-cock of popular opinion.

It is premature to present my constituents with a thorough legislative programme, for it ought to be based upon expediency and not be a fossilised document. But I shall not be an obscure member of the Federal legislature, (for no Osmanian shall be obscure in whatever walk of life he may be), and I have already an outline of my course of action.

Firstly, I shall proclaim to the world at large the magnificence of Hyderabad by lavishly spending the rate prayer's

not being found enough to award me prizes in, I was offered books and medals for "Good Conduct and Attendance".

I have been brought up in the traditions of loyalty and service to the state. My grand-father was a "Rao Saheb" and my father a first class Bench Magistrate. I have regularly witnessed for the past fifteen years the Birthday and New Year Parades. When H.E.H. the Nizam returned in state from his first visit to Delhi, our school boys lined the road in front of the British Post Office, and I was seated on the parapet wall to hold aloft the banner. I have taken very great interest in the Viceregal visits to Hyderabad. When Lord Irwin came, I was in the front row of people in the old State Library Compound, and for Lord Willingdon's visit I was near the Mussaffarkhana. And when Lord Linlithgow pays his visit to Hyderabad, I earnestly hope, I will receive him on behalf of you all at the new Nampalli Station.

As for my abilities as a platform speaker, you have heard me, rather too often without the feeling of boredom, in the union, and elsewhere. Being the best speaker, I was unanimously elected secretary of a College union, and I successfully conducted the Annual Inter-College Elocution Competition, which was held neither by my predecessor, nor by my successor. You must have also noticed that my speeches are punctuated by applauses, mostly from the fair sex.

Being chairman of my Hostel Union, I presided over the Inaugural and the Valedictory meetings and my rulings have since become classical. I assure you my experience will stand me in good stead if I should become the speaker of the Federal Assembly.

I have the most handsome personality among the candidates seeking your votes. My mirror is my best judge,

My Election Manifesto

I am standing as a candidate for the ensuing elections to the Federal Assembly from the Hyderabad Students' constituency. Numerous of my friends and well-wishers have long pressed me to do so, on the score that there is no better man who can represent your interests. The Hyderabad Students' Union, (now a defunct body) at its last meeting resolved that if ever the Federation should materialise, I should be the first student delegate to the Parliament of a federal India. I am also told by many that the Hyderabad students are eagerly looking forward for my filing the nomination papers before the Returning Officer.

It is never in my nature to decry my rivals as they do me. I shall only enumerate, and briefly too, my own modest accomplishments and qualifications in which I rise above the others.

I have had a pial school education, which our ancestors called the Gurukul. In my second standard I got a double promotion, for my grand-father's ability in coaching me up. Since then my educational career has ever been brilliant. I passed the Middle School Examination in 1929, when it was held for the last time, with only a slip (failure) in my additional Sanskirit. All my Government or University Examinations I passed without ignominy in the first attempt which feat very few of my classmates could perform. I was the recipient of several prizes in my school, having been a pet student of all teachers. The different subjects of study

I have always done it half-heartedly, I never got more than a third division in my examination. I even failed this time. I preferred to walk instead of catching the bus in which we are warned against smoking.

I have read much of history but always with a disgust, because to me it is the subject in which the hiding of the truth is proportional to the research done. Moreover it is self-deception to search for a meaning in what is not up-to- date, and to search for truth where it is artistically hidden. Yet I like history for one thing. It has kept the record of the discovery of the new world. Because he revealed the presence of my Nicotiana, Columbus appears to me like a hero who discovered not only a tract of land and the way to it, but discovered a new world of thoughts—a domain in which pleasure prevails.

MUJTABA YAR KHAN,
(Senior Inter:)

My Lady Nicotine

The moments of my greatest enjoyment are those when I am smoking, I feel my whole self being conquered by the blue smoke which charms my eyes. The flavour at once transports me into a more colourful world – the world of imagination. And then even the labour of handling the cigarette becomes distasteful. In such moments of ecstacy, I have practically hated everything. I have hated the man who out of shallowness has regarded smoking "as a cylindrical business with the fool on one side and the fire on other." I have hated Aristotle who has maintained that "life is a list of events." I have hated the superficiality of those who judge life by actions; because in my conception, life is a glamorous thought, all the glamour of which is lost when it is enacted. I have hated the authors of opportunism. To me our culture has always appeared illogical. It asks us to refrain from smoking before our elders. I even entertain the idea of inviting them to borrow the services of this restorer of peace and presence of mind, thereby taking a step towards the condemnation of all that is conventional. I laugh at myself when I recollect the days when I used to refrain from smoking even before my juniors. The rules of our society are a bundle of inconsistencies. Why should I offer a cigarette to anybody, when I do not know that everyone has the same regard for smoking as myself. Naturally I cannot bear the idea of such a thing being used to no good end.

I hate the idea of appearing for an examination where it is forbidden to enter without a cigarette in the mouth. As

life should be to grow in spiritual grace, strength and symmetry.

(9) Be interested in others. This will divert your mind from self-centeredness and other selfish habits. In the degree that you give, sympathize and help, with no thought of return or reward, in such degree will you experience of happiness.

(10) Live in a daylight compartment, this means to live one day at a time, take no anxious thought for the morrow. God supplies you with everything essential for your progress. Concentrate upon your immediate task, and do it to the best of your ability.

(11) Have a hobby and cultivate an avocation to which you can turn for diversion and relaxation.

(12) Keep close to God. True and enduring happiness depends primarily upon close alliance with God. Priceless riches come from close daily communion with Him. It is your privilege to share his thoughts for your daily spiritual nourishment, and to have constant assurance of divine protection and guidance.

Finally moderation should be your watchword. Too much of anything is bad. Democritus has said "Throw moderation to wind, and the greatest pleasures will give you greatest pains". Intellectual pleasures are preferable to bodily ones for they are of longer duration. It was Epicurus who pleaded for intellectual and spiritual pleasures and discarded physical ones. This is what we must do to be saved from misery.

in debt. To secure ultimate independence from pain exercise the fine qualities of prudence, frugality and self denial.

(3) Cultivate a yielding diposition. The habbit of generous acquiescence gives a right balance to human will. Resist the tendency to want things your own way. See the other person's view-point. Take a large view of the life.

(4) Think constructively. Store your mind constantly with useful, progressive, encouraging thoughts. Every uplifting idea you entertain has a happy influence on your life. Train yourself to think deeply accurately.

(5) Be grateful, be glad for the privilege of life and work. Be thankful for the chance to give and to serve. Let each day witness your spirit of thankfulness. Be appreciative in your appraisal of others.

(6) Rule your moods. Rid your mind promptly of every discordant or undesirable thought and cultivate a mental attitude of peace, poise, and good will. Direct your mind to pleasant, agreeable, helpful subjects. Dwell upon the best aspects of life.

(7) Give generously. Give out of the fullness of your heart, not from a sense of duty, but because of the wish to serve. There is no greater joy in life than to render others happy by means of intelligent giving.

(8) Work and pray with right motives. Analyze your motives and impulses, determine which should be encouraged and which restrained. Resist all undesirable tendencies. The highest purpose of your

life. At the outset we must know that "Life is the gift of nature and beautiful living the gift of wisdom."

There are at least four things which are more or less under our own control and which are essential to happiness. The first is a moral standard by which to guide our actions. The second is some satisfactory home life in the form of good relations with one's family and friends. The third is some form of work which justifies our existence to our own country and makes us good citizens. The fourth thing is some degree of leisure and the use of it in someway that makes us happy. The other important and vital thing is a man's mental outlook which can make a thing good or bad and can make him rich or poor, miserable or contented.

Aristotle has rightly said that "to be happy means to be self sufficient". Contentment is the secret of happiness. We should imitate animals for they are placid and self-contained. The wise man seeks not pleasure but freedom from care and pain. How is it possible to attain freedom from care and pain?

There are twelve Rules for happiness which "The Oriental watchman and Herald of Health" has published and they are the following:—

(1) Live a simple life. In character, in manner, in style, in all things the supreme excellence is simplicity. Be moderate in your desires and habits, because Lord Buddha has rightly said that desire is the cause of pain. True simplicity is free from self-seeking and selfishness. Realize the desirability of true simplicity and try to make it a pre-eminent quality in your character, work, and daily life. Simple things are the best, even simple food.

(2) Spend less than you earn and avoid extravagance. Keep out of debt. Better go supperless than rise

Secrets of Happiness

The world of happiness is not the world that I live in or have ever desired to live in. I can well understand the remark of Goethe in old age that " He had no more than a fortnight's happiness in his life ". Yet that long life of his seems to be full of happiness to a layman. Like Dr. Johnson I consider life a fatal complaint and it is to be endured and not to be enjoyed. The world is a great field of battle where each man fights the other. There is no peace anywheie. In the words of a well known poet, " The wind fights with the forests, you can hear them slashing and slaying all night long The sun fights with the sky, the light with dark and life with death." It is all a bitter quarrel. None is satisfied.

In the opinion of Schopenhauer. " If the world is will, it must be a world of suffering. First because Will itself indicates want, and its grasp is always greater than its reach. For every wish that is satisfied there remains ten that are denied. Desire is infinite while the fulfilment is limited. Therefore a man does not live in a state where all of his desires are satisfied. Therefore he is discontented and miserable."

What is to be done with this world of misery? We must find a solution. We must make the best of the worst world as much as possible. It is with pride I say that it is only a philosopher who can give us a grain of consolation in this tide of misery. In the light of opinions of philosophers, I suggest the following methods be adopted to lead a contented

sideration of consciousness of power which influences the belligerents to have recourse to arms instead of settling their difference by a peaceful submission to arbiteration. But unless such schemes were devised, it would be impossible to put a stop to the havoc which war brings in its train, with bloodshed and misery, crippling all resources.

The question of world peace can only be settled when human beings begin to love each other. We must not, because we love our own country, hate or despise other countries and their inhabitants. While seeking to promote the interests of our country in its manufactures and commerce, we must not allow ourselves to suppose that by injuring other countries in these matters, our own country will be benefited. Every country, on the contrary, has an interest in the prosperity of all other countries, for when a country is prosperous, it is able to buy from others what those others have to sell. In short all the rules for the conduct of individuals apply equally to naiton. We are to love ourselves as far as to seek by all fair means to advance our own interests, but we are also to love our fellow creatures and do them all the good in our power

It would require no prophet to foretell that the love of war, though considerably weakened, will continue as a ruling passion as long as man is to remain in a fighting condition, unless he is by some mysterious process changed into a loving and peaceful being ; and though religious persecution has happily long ceased to exercise its pernicious influence, the spirit of proselytism which has grown up since in a milder form, will probably continue to produce its effects, whether for good or bad, it is not easy to divine.

The 'gentle art of killing,' as it is described, has been cultivated so sedulously as to have attained to the highest stage of precision and destruction. Quick firing and machine guns of various kinds have been designed for speedy destruction with smokeless gunpowder, high-explosives and floating mines. Every possible improvement has been made in military armament and in naval armaments also; there are warships of numerous kinds including sub-marines, torpedoes and their counter-blasts. The horrors of war with such appliances can be better imagined than described. It is estimated that during the last century, some 14,000,000 lives were directly sacrificed in war, and it is said that people should not be scrupulous about the use of fire-arms as those who profess these scruples are treated with derision.

War by itself is a tremendous evil, the miseries and remorse it leaves is in-estimatable; especially these days when warfare is carried on under the eyes of more enlightened peoples than in the past. During these days political science and economic inquiry have made vast strides, and consequently the injurious social effects of warfare may be minimised though not averted, and a considerable body of public opinion, far more enlightened than during any previous European war, is almost certain to exercise some pressure in the direction of wise and far-reaching action both during the war and after it is ended.

There is a school of thought which holds positively that war is no doubt a great and inevitable evil, but that it can never be abolished as long as human nature remains what it is, while other thinkers like Tolstoy say that war is a disgrace and shame to humanity.

Any scheme having for its object a remedy for war might not only be considered as quixotic and chimercial, but condemned as one absolutely impracticable in the con-

Militarism To-day

BY

(S. K. SINHA 2nd YEAR)

As a minute examination of the question in all its bearings is a task I am not prepared to undertake, I now propose to show very briefly how far the spirit of Militarism has developed into destructive tendencies. Inspite of all efforts for the preservation of human life and the establishment of protective and charitable institutions, the love for Militarism is, I am afraid, in the ascendent. The potentates sometimes fight with mere shadows and pick up some flimsy pretext as a justification of hostilities. In so doing they imagine and profess that their mission on Earth is one of absolute peace and nothing but peace. Almost every aggressor, or even a tyrant, is heard to invoke the propitious aid of his patron Saint. He proclaims to the outside world that his cause is a just one and his war really a holy crusade. Huge land and naval armaments are kept and maintained on a war-footing by the powers at an enormous expenditure, which is a strain upon the pockets of poor tax payers. Any resolution proposing reduction of such heavy armaments is negatived, if ever it is moved. A system of universal military service, though different from that of conscription strictly, so called, prevails in France, Germany, Italy and other European countries, as result of which a very large number of young recruits ranging from 18 to 20 years of age are removed from the plough or other peaceful occupations, to be forced into military service, in which they are required to serve up to the age of 40, at least under various systems of recruitment.

To call ourselves ideal students we should not only stick to our own ideal objective, but should also help to raise the standard of common people. We are expected to fore-see such calamitous results as would occur through negligence and carelessness ; and guiding the people concerned, should assist them to alight upon a shore calm and peaceful, and devoid of the clash and collision of self interested individuals.

Our career of reform should begin in the university, where we should indulge in smoothing all oppressed feelings and invidious sentiments and in making them slide harmoniously. More over we should realize our responsibility, in and out of the class rooms, with regard to manners, behaviour, etiquette, obedience, the acquiring of learning and sense of duty.

Lastly we should be enthusiastic about the welfare of our state and should serve it and its ruler to our utmost capability.

*

utilize what we have been made capable of and to use what has been gathered around us.

The learning of the professors that we have attained through their untiring devotion and our own concentration, the knowledge of books that we have gained through their coaching and our own strenuous labour, the study of the strange and valuable phenomena of life that we have learnt through their ability and our own skill, are to no advantage if we do not avail ourselves of the first opportunity that is offered us in after life.

We, university students, are standing upon the threshold of a great revolutionary epoch, an era which may open with the promise of a successful career or close with the consequences of a dreadful catastrophe. It is up to us to see that we do our best to achieve that which marks our attainment of the former. It remains entirely with us to put to use all that we have learnt in our university—all that has been of benefit to us as well as to others.

These are what should be the functions of an ideal student. We are not expected to spend our precious time in foolish sport or idle gossip, or with the aim of exposing the weaknesses and infirmities of our acquaintance, students and professors, friends or foes alike—but to step into the healthy and progressive atmosphere with the prospect of ultimate gain and unending progress, always on the lookout for something better than we have previously achieved.

We are not to be deflected from our right path by the injurious advice of selfish people nor are we to be led astray by the venomous counsel of hypocrites. We should always be occupied in seeing our way right and clear through the thick fog of tyranny and conspiracy, and should reach our goal in time to save others from the disastrous ends of the conspiracies of self-centred scoundrels.

What We Should Be

The present age sees no marked difference between the teacher and the taught, so that the functions of a professor overlap the functions of a student. This disparity ceases to seem more so in the case of university education. Both of them work alike in trying to make the one understand the other, and the range of the study of one begins just where the other ends—hence the uniformity and the continuation of thought and expression, which is so difficult to detect to be two different efforts - at the height of their completion.

Even though this stage of perfection has been reached the main characteristics of both may be laid down.

The teacher or the professor is expected to devote as much of his time and energy to the betterment of the student's mind, as he can. His incessant efforts and endeavours are the only source through which he can improve the knowledge of the young man, and advance his learning that the latter may benefit by it in all phases of human life. His function is to procure for the student as many resources as can easily be brought within reach of him.

The function of the ideal student is to derive benefit out of the things that have been put at his hand for his convenience. If we wish to attain that height of perfection and to claim the worthy title, we should think it our duty to see that we enjoy what we possess and to achieve what we are brought near to. We should always be on the look-out to

depart . . . . . . To be or not to be . . . . . . Padma married some one else? Other than me—I still living- -".

"Nabha Mansion"
12th December 1925.

A fatal mistake--how soon revealed yet how late—It is how too late to mend--How I wish to choke the doctor to death—what a fatal error—Why should he have mistaken the blood of another man for that of mine? . . . . . . Ah! But this was to ruin my life . . . . . Padma! I can sigh on your portrait alone for all my life to come to worship thee all my life.

The rest of the page had blurred letters, blurred probably by tears.

Chari threw the diary into the drawer, and stood beside the table a little sad. When once again his sight encountered the portrait, he drew near, and moved his eyes sharply on it, and lo? he saw the name and date below:—

PADMA
1905——1926.

Padma! 1926! Ah! she must have pined and died."

A tear fell from his eyes—a tribute to her memory, at the altar of love.

Now we understood to whom the professor prayed, and why.

. . . . To-day I could follow my professor better. When he said "unlike poles attract," I believe it to be gospel truth."

A few more pages revealed the various incidents of their mutual love – how he offered his rain-coat to her, how they played together in mixed doubles so on and so forth. While reading these pages his eyes came across another note which ran thus:

"Presidency College Hostel,
21st October 1925.

Heaven rejoice—How happy to-day – Padma's father has consented to our union. How soon is my wish fulfilled. I am in an ecstasy! I shall go mad. Oh, but I shall see Padma in the evening how shall I talk with her, and please her. How I wish November to be gone soon – The 1st of December. It will open a new page in my life-ay in you too, my love!"

Many pages after this were simply blank. Why, thought he turned on and found a page with some thing written.

"Nabha Mansion
5th December 1925.

New moon—Crescent moon – Full moon – again darkness—Heavens take me in the darkest zone of the universe – How am I to stand the collapse – Why should I have at all to insure my life—Damn the doctor who told me I am on the verge of T.B.—

Ah! But well he did – Or else I would have ruined her whole life – How deep her disappointment. Like summer showers came her tears—Heavens – I must

if you were really praying, if I am not inquisitive ?" said he, while looking through the book.

" Why should you doubt it " replied the professor with a faint smile.

" . . . An apostle of atheism praying ! I believe it? Never ! "

"Ah ? It is a sad tale to tell, " he sighed. "It has been burning my heart for the last twelve years. You are my friend, and I shall reveal it to you. Perhaps your sharing my sorrow might give me solace".

Thus speaking, the professor with heavy footsteps approached the bookshelf in the corner, and took out a pocket sized book. While it passed from the professor's hand to his, he noticed the number 1925 on it. It was diary " Read the folded pages, and keep it in the drawer ", this instruction was given in an undertone and the professor wearily left the room.

Chari could not account for his sudden departure. He opened the folded page first. It ran thus.

" Presidency College Hostel
13th July 1925.

. . . . How fascinating ! How bewitching ! How charming I simply rooted to the spot, when I came across her in the reading room. The bell rang and she wanted to go to the Telugu class. Bewilderingly she looked around, and approached me shyly. In a ***musical tone***, she asked the way to the Telugu Class— A chivalrous knight errant I was at that time . . . .

The Portrait of A Damsel

"Three . . . . four . . . . five" . . . . he counted the steps, and soon his hand was on the call bell.

"Jee-Huzur"—was the response, and he was ushered into the drawing room." "The saheb is just returning from prayer" said the servant leaving the room.

"What? Professor Raman praying? This cannot be. Has he not denounced very often, and vehemently the existence of God in private and public? . ." This was the line of thought, while he cradled himself on the spring sofa.

It was a well furnished modern room with every convenience and comfort. It was sultry and he wanted to switch on the fan. Suddenly his eye was caught by a portrait on the wall in front of him. He drew near it, as if hypnotised.

It was the portrait of a lovely damsel; her eyes gleaming; her hair curly and flowing; and her features fine. But in her face, lurked deep sorrow.

. . . . . . "So beautiful and yet so pathetic! Why?"

He sat down and pondered.

Just then the professor came in and greeted him.

"May I have Saha's text book on Heat" he said, and the professor hurried to his table to fetch it.

"Yes, it is a good book" said the professor. The talk went on about various text books. "By the by, may I know

He regained the Saar, a rich industrial area. There was a disarmament conference at Geneva. This was the time to accept Germany by giving her equal opportunities or self-defence. Two things were under discussion. Either all the powers must disarm to Germany's level, *i.e.* (No submarines, tanks, military air-craft, guns over 4·5 inches, no ships over ten thousand tons) or they must allow Germany to rearm. The other nations were reluctant to accept it, so Germany with drew from the League of Nations on the 14th of October 1933. Thus Hitler freed himself from the League and determined to break the treaty. He refused to pay war debts. He marched into the Rhineland and occupied it with armed forces without previous notice. Now he is rendering great help to General Franco, the leader of the rebellion against the present government of Spain. He is demanding the restoration of his lost colonies. When old president Von Hindenburg died, Hitler became the president as well as the Chancellor, gaining 90 percent of the Votes. He forced all the Germans to vote for him. In the course of two years, Germany has again become one of the great powers of the world and is a terror to other nations. Hitler is the sole master of Germany and unlike Stallin and Mussolini, he is the most unguarded man. He goes whistling everywhere with a walking stick in his hand and hears the cheerful words from every German,

"HEIL HITLER".

M. A. JABBAR, B. A.,
(Osmania).

Soon after taking charge, Hitler started his work in earnest. The communists were declared to be traitors, and those of their leaders who had not escaped to foreign countries were at once arrested. Their meetings were prohibited and the entire labour press consisting of more than 200 daily news-papers, was suppressed until further notice. Those clauses of the constitution guaranteeing the personal liberty of the citizens was suppressed by a presidential decree. He completed the work of centralizing. After some days all the states too lost their liberty. He did all that was in his power for his country. He worked out schemes, established families on farms, stretched the system of private charity and gave jobs to unemployed young men. The Jew were persecuted. The term Jew was extended to all who were not altogether of German blood. All Germans who had even one Jewish grand-parent were considered to be foreigners racially. Those who held positions in the civil service or the legal profession were the first on whom the blow fell. In the course of a few months thousands of Jewish civil servants, officials, lawyers, Judges, doctors, teachers and employees lost their positions. The case of professor Einstein is perhaps the one that created great surprise and indignation in other countries. A few succeeded in obtaining positions in other countries and 700 emigrated to Palestine. The Nazi party requested all Germans to refrain from entering Jewish shops and this was strengthened by armed pickets. The result was that all the shops were ruined.

In foreign matters the Nazis were serious. They had an idea of re-establishing the position which Germany had lost during the war, and to a great extent they were successful. In his speeches and writings, Hitler announced that he wanted to break the whole pernicious system of the Versailles treaty. He made up his mind to re-arm his country.

insurrection, a government under social Democratic leadership assumed office. But socialism in Bavaria had been much weakened by the events of 1919, and an anti-socialist government took its place. In this atmosphere of revolution and counter revolution Hitler created his Nazi organisation. In 1920 the Nazi movement became Pan-Germanic in its attitude and in 1923, attempted a counter revolution and set out for Munich to overthrow the Weimar Republic. The Bavarian government successfully repressed this and Hitler was condemned in 1924 to five years detention in a fortress. He was afterwards set free and began to work immediately. He organised his party so well that it spread gradually from Bavaria into the other parts of the country. Its real chance came only with the world slump. It went ahead by leaps and bounds when the politicians at the head of the Weimar Republic ceased to be able to maintain tolerable living conditions for the mass of the German people, including both the middle class and the manual workers. At the election of November 1932, the Nazi members fell to 196 and in February 1933, when Hitler had already become Chancellor and established his Nazi dictatorship, the Nazis polled 17 1/4 million votes and returned 288 members. Thus the Nazi party came into power.

A German writer has described the scene on the evening when the news of the victory was received: " In the evening of 30th January 1933, a torch light procession was held in Berlin to celebrate the appointment of Adolf Hitler as Chancellor of the German Reich. All the people marched with banners and flags towards the residence of Hitler, who stood by the open window showing his youthful figure. Boundless enthusiasm filled the mass of the happy people on whose lips was Hitler's name, who crowded the streets of the capital." Captain Goering, Hitler's closest collaborator, described the success in Berlin as the most magnificent demonstration of the German spirit since 1914.

We shall now see the growth and advancement of the Nazi movement; its aims, ideas, and the work done by its leader Adolf Hitler. We shall first see his character and life, because the history of the party is the history of its leader. The following is a quotation from a German anonymous writer who thus described Hitler "He is a simple man who rose to prominence through an extraordinary gift of oratory, a keen mind capable of extreme simplification and a natural shrewdness in dealing with men. A man of medium height and commonplace features. It would be hard to spot him in a Sunday afternoon crowd. In hours of rest and privacy, Hitler is simple, friendly, and full of commonsense. He neither drinks nor smokes. He likes children and motor cars yet at the slightest provocation a fierce temper boils up and the man is changed beyond all recognition. His face is burning, his voice assumes the angry shouts of the public meeting, and his words carry bitter, biting sarcasm. The man who only a minute ago, was quite a simple companion has become the ruthless dictator of a great people." He was born in 1889, in the little Austrian town of Brannase and studied in the school of Linz. His parents died when he was only 16 years old. He failed at school and was loafing about in streets for many years. He always thought of becoming a painter. At about 25, he began to acquire a taste for literature. When war broke out, he joined the Bavarian Infantry. He fought well, was wounded and remained in hospital for some time. When he came out, the revolution was over, but its second wave was in full swing in Munich. He remained with his regiment and threw himself with great energy into the turmoil of political discussions. He formed his own party and began to organise it in Bavaria in 1919. The German revolution of 1919 actually began in Bavaria, and it was there that the first revolutionary government was established under the leadership of Kurt Eisnar, the independent socialist. After a short lived communist

sound reasons for their verdict that the experiment had not been successful.

We have now to turn back the pages of history over some years in order to explain how the up-heaval of 1933 was rendered possible. It was upon a coalition government headed by Social Democrats that the depression fell. Divided internally, the government had great difficulty in pursuing any coherent policy in face of the depression. The financial situation continued to grow worse. The parties of the right including the Peoples' party, demanded a drastic reduction of unemployment and on this issue the government broke up in March 1930. It was succeded by a bourgeois government under the leadership of Bruning, a member of the Catholic Centre party. The depression was becoming more and more extensive and the condition of the country was becoming worse. Neverthless the Bruning Cabinet carried on, and appeared for a time to be meeting with success, but it could not maintain itself for long. A length in July 1932, in face of the tremendous growth of the Nazi movement and of popular discontent, President Hindenburg dismissed the Chancellor and bestowed the office upon Von-Paplen. He soon began to negotiate for an accomodation with the Nazis, but Hitler seeing that his party was not offered a freehand, refused to colloborate. Popular discontent with the aristocratic Nationalist government of Von-Papen began to grow, and Hindenburg against his will was compelled to get rid of his unpopular Chancellor. He was replaced by Von-Scholeicher who tried his atmost to appease the discontent by following a more moderate policy and did his best to come to terms with the trade unions and to obtain at least the toleration of the Social Democrats. But his ministry was short lived. The Nazi party at this time was at its zenith. Hindenburg at last in January 1933 sent for Hitler and offered him the Chancellorship.

majority with an elected president who was empowered to declare a state of emergency and to govern by decree. There was also a Reichsrat, which like the American Senate, was to represent the various states.

The Weimar constitution was the most democratic the world has ever seen. It became law in August 1919. It was the first republic of the world. It left Cinemas and Theatres free from censorship. It gave to all men moral and political freedom. It did not destroy its enemies, but tolerated them. It was human enough to give pensions to thousands of ex-officers and civil servants. This republic having been born soon after the defeat, knew no honour. Inwardly Germany was rotten. It allowed so much moral and political freedom that it left no room for duty. The result was that unemployment began to spread every where. The enemies of the republic were growing rapidly and the members of the communist party were increasing in number. The Catholics of the Central Party formed a rallying point for all who were disgusted with the moral laxity of the Weimar Republicanism. Nationalists began to preach the doctrine of honour and duty and their number increased from seven in 1919, to 178,000 in 1929. There was again confusion and turmoil. The young men were furious for more than a million were left without work. They were ready to rebel agaist two forces ; against the powers who had drawn up the Versailles treaty and against the republic of Social Democrats. Nobody could prophesy at that time which party would overthrow the Republic. It was universally believed that no party had power to save the country from foreign agression, and from internal difficulties. At last the party which came forward was National Socialist. Things were ripe for a change. The Republic was played out, and an impartial review of the record leaves one with the impression that the German people had on the whole a number of

the result was that a treaty was signed at Versailles. The Germans were struck dumb by the news of the treaty. It cut away arbitarily large pieces of German Territory. It dogmatically declared Germany solely responsible for the war. It annexed German Colonies and dis-armed Germany completely with only a vague promise of general disarmament to follow, which we have seen afterwards, resulted in nothing.

There was no end to it. No body seemed satisfied and this caused great agitation everywhere in Germany. There were many parties in the country and every one of them wanted to establish their own ideas of government. The moderate wing of the Socialist Democratic party wanted parliamentary democracy. The minority wanted a Soviet Republic, so did the extremists. They wanted first to seize power violently, secondly to dispossess the capitalists and establish a working class dictatorship. There followed a civil war between the majority Socialists and Communists. The Communists wanted to seize power and made their first attempt on 6th January 1919. This was put down very effectively by the social Democrats.

The Social Democrats, having come in power wanted to establish a firm constitution. It was for this purpose that an election was held and afterwards a moderate and Democratic Assembly met at Weimar to draft the new constitution. But the industrial workers were opposed to this parliamentary republic and its constitution. Every where they rose in rebellion and actually proclaimed a separate republic of Bavaria. The republican government was strong enough to over-throw them and order was restored. Thus after overcoming all these difficulties, Germany became in real sense a parliamentary democracy with a Reichstag elected by the votes of the whole adult population, male and female with a chancellor and a cabinet dependent on the support of a

Having been kept in harbour for a very long time, the navy even more than the army at the front developed strong pacific tendencies. On 30th October at Kiel, the sailors turned against their own leaders. This marks the begining of the revolution in Germany. Noske, the leading member of the Social Democratic party, who became famous later on as the protector of the German republic against the communists, was sent to Kiel to deal with the situation created by the mutiny. The Kaisar who had left the capital in panic in order to confer with the military leaders alternated between desperate hopes of re-establishing his positon in Germany by force of arms, and a willingness to listen to the advice of those who were pressing him to abdicate on both internal and external grounds. It widely held in Germany that the allies would never make peace as long as the emperor remained on the throne. Public opinion was that the abdication of Kaisar might clear the way for a compromise and save the country from anarchy or the establishment of a socialist Re-public on the Russian model. But the Kaisar was unable to make up his mind. In October, Prince Max of Baden was made chancellor and the more radical parties hoped that their chance to bring about a peace had come at last. He proclaimed the abdication of Kaisar without receiving positive consent. Thus the family which had been ruling in Germany for five centuries came to an end. Prince Max of Baden realising his own situation to be very critical, resignd in favour of Elbert, the head of the socialist party.

In June 1917 the Reichstag adopted the famous resolution in which, while pledging itself to the continued defence of the father land, it desired a peace based on accommodation without annexation or indemnities. Despite the failure of the indirect peace negotiations of 1917, the publication in January 1918 of president Wilson's fourteen points greatly strengthened the demand for peace within Germany

The Post-War Germany

Germany entered the great-war of 1914 along with other great powers. It is useless for our purpose to dwell upon the causes which led to the great world war. This much we can say that, politically no less than industrially, Germany was during this period proclaiming with ever-growing insistence her right to be considered as a great power, and the rivalry between Germany and the Great Britain, which added to the old enmity between Germany and France and the desire of the French to regain the provinces lost in 1871, led to the Great War, was taking an ever more menacing turn. Germany late in the field as a great power, was at a serious disadvantage when attempting to build up for herself in imitation of her rivals an extensive Colonial Empire.

When war came, the Germans hoped to end it rapidly, but there was much discontent as the war was prolonged and the promise of victory still made by the military leaders carried less and less conviction among the mass of the people. The intensified submarine campaign failed to produce the anticipated results in stopping the supply of men and mutions to the allied armies or in starving out the civil population of the Great Britain. In September 1918, the military leaders, had become aware, not merely of the inevitability of defeat, but also of the impossibility of continued resistance for more than a very little longer. Their reserve of troops was exhausted, and they realised that at any moment the fighting line might break. The despairing attempt to lead out the German navy to a pitched battle with the British fleet led immediately to the refusal of the sailors to fight.

which can discover cultural elements in useful activity, and above all it would increase a sense of social responsbility.

The present day world is in the grip of severe economic distresses and almost all the familiar means of livelihood are now difficult. Careful deliberation points to the encouragement and promotion of vocational education as the only possible solution of grave economic problems.

Hyderabad, the premier State in India was undeveloped about twenty-six years ago. During this short period, it has made rapid strides in this field under the present ruler. The late Dr. A. H. Mackenzie, one of the greatest educationists of India, rendered great services to our state by his schemes of reorganisation. He laid out a scheme of study, according to which vocational training was considered a necessary part of our education. According to him vocational instruction would be brought into effect in Moffosil Middle Schools. By following his scheme, Hyderabad would thrive and become a promising state with a sure place among the advanced countries of the world. When our schools like those of Germany, Japan, and England are well equipped for industrial education, we shall be able to keep pace with those industrial countries and out the problem of unemployment which has been distressing many a country, will cease to exist.

H. W. BUTT,
B. A. (Jr.)

But a question arises at present as to whether vocational education would prove advantageous in our schools.

There was a time when people in India lived simple lives mainly depending on the produce of their country; their one religion with its caste distinctions, according to the code of Manu permanently settled their various occupations in life. Hence in the absence of foreign inroads and foreign interference they lived happy, peaceful and contented lives depending upon their own lands and industries and a set of professional men, as laid down from times immemorial. But at present one is able to observe that with the great advance of civilisation the world is becominng smaller. Scientific and commercial progress has broadened our views of life, and our education. So we should improve ourselves and our schools with the help of this. To put it clearly, our education should be such as would make us true and genuine men.

Some people thoughtlessly oppose vocational training on the ground that it would give to the masses a narrow technical education for specialised callings, carried on under the control of others. But if this is calmly considered, one would perceive that there is no ground for it, as industrial life is so dependent upon science and so intimately affects all forms of our social intercourse, that there is an opportunity to utilise it for the development of one's mind and character. The introduction of vocational education in our schools would enable us to make use of our theoretical knowledge in practical callings. Thus we should be giving some substantial help to our fellow-men who till now received only our lip-sympathy. Vocational training would give those, who are engaged in industrial callings, a desire to share in social work and ability to become masters of their fate. So much for those who have poorer economic opportunities. With regard to the more privileged classes of the community, it would increase sympathy for labour, create a disposition of mind

latent powers and general efficiency. But efficiency is attained not by negative means but by positive use of native individual capacities in occupations having social development as one of its aims. To put it clearly one must say that social efficiency indicates the importance of industrial competency as persons cannot live without the means of subsistence. If an individual is not able to earn his own living he is a drag or a parasite on the activities of others. To quote Sir Nizamat Jung. " The best type of an educated man is he who holds his knowledge and capacity in trust for the benefit and development of his kind and uses them for himself as a guide to the right path". True development is attained by the active use of our faculties. Without this active use, our education becomes merely an arm-chair philosophy. " A degree," says Sir Akbar Hydari " signifies or is supposed to signify some kind of efficiency, and efficiency means fitness for doing some work in the practical affairs of life". This efficiency seems to be conspicuous by its absence in many degree-holders of the present day. The inevitable results of the present system of education wherein stress is not laid on vocational education are, that it makes the boy grow up into a cultured slave, diffident, spineless, without initiative, with no spirit of adventure, lacking in the power of self-help and often in self-respect, always expecting to be guided or chaperoned by others, a grown-up baby-citizen, perpetually dependent upon the Government for his purposes, progress and welfare. It is for this reason that vocational training for students will prove to be the best method of rooting out these defects.

A vocation signifies any form of continuous activity which renders service to others, and utilises personal powers to achieve good results. One observes that the field of liberal education is too narrow, whereas vocational training not only enables a man to cultivate the practical side of life but also helps him to get beyond the confines of arm-chair philosophy.

The Need of Vocational Education in our Schools

Since the sixteenth century there have been conflicting opinions offered by great educationists regarding the aims of education. In spite of these conflicting opinions, Spencer has fully dealt with the different values of education and has laid great stress on the moral, intellectual, physical, social and scientific phases of it. Even today one cannot say for certain that the present aims of education will hold good in the days to come.

It has been well said that with the advance of civilization and culture, standards of education differ: Political and educational aims always move parrallel with civilization and culture. Now in these days of keen competition for life, great importance is being attached to the introduction of vocational education in schools. This importance cannot be more emphatically asserted than in the words of Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur. He said, "We are born to do things and not simply to know them". While your mind labours to achieve the highest reach of thought, let your hands be busy making useful things, thus developing your intellectual and spiritual powers with material comforts. In this lies the secret of a people's greatness, and this is how Japan, a nonentity among the world powers forty years ago, has now risen to its zenith.

It is accepted by all the modern educationists that the aim of education should be the natural development of one's

deemed the citizen-philosopher fitted at length for the contemplation and study of the highest good, an occupation which he would at times have to interrupt in order to discharge the active duties of the highest and the most responsible positions in the State. After the death of Dionysins, Plato made two journies to Sicily, and attempted practically to realise his ideal state at Syracuse but his efforts proved fruitless. If according to modern notions, Plato's scheme appears fantastic and impracticable, his fundamental views on human education and perfection bear great resemblance to Christian doctorines and his writings abound in profound truths, observations and reflections bearing upon the development of the faculties of human nature:

highest virtue or human perfection consisted in acquiring knowledge of the good and bringing one's life into conformity with it. Human nature is tripartite, embracing mind (intellect or reason), seated in the head; the will, seated in the heart or breast; and the passions, or lower animal nature, seated in the stomach. Each division has its special virtue; that of the mind being wisdom; that of the will manliness, courage or valour, and that of the passions moderation or sobriety. In Plato's ideal state men divided themselves into classes corresponding to these virtues. The lowest were those who supplied man's physical wants, namely the labourers. Above them stood the guardians of the law and of the safety of the state, the police, the warriors, the representatives of courage and manliness. At the top of all stood the philosophers and rulers of society, by virtue of their approaching nearest to the knowledge and practice of wisdom. Such are in brief the most essential features of Plato's ideal state, and by these his theory of education is naturally determined. From the first to the tenth year education, according to Plato, should be chiefly physical giving the child a sound body by gymnastic training, by which his higher faculties are developed by the oral narration of suitable stories, myths, legends and fables. From the tenth to the twentieth year the youth is taught reading and writing, poetry, music, mathematics, and is put through a course of military drill and discipline. Most men have not the faculty to advance beyond this stage to any higher knowledge, but there is a minority who are capable of more advanced attainments in true philosophy. After studying to their thirtieth year, the less capable of the minority will be fitted for administrative functions in the state, while the most gifted should study dialectics or philosophy five years longer, in preparation for superior offices. For fifteen years the latter should then be employed as commanders or managers in different departments of government. Finally, at the age of fifty, Plato

Plato

(429 - 347 B. C.)

Plato was an ancient Greek philosopher, and the most distinguished of the pupils of Socrates. In his fourteenth year, he began in the groves of the Academy at Athens to teach his celebrated system of philosophy, which, in opposition to the schools of Realism and Materialism, is known as Idealism. Ideas, according to Plato, are the eternal divine types or forms, constituting the essences of things according to their several species, genera, families and classes. These ideas are the outcome of all knowledge and the human intellect attains to this knowledge by 'Dialectics', that is, systematic examination and argument, by which the non-essential are distinguished from the essential elements. Plato, however, had a far higher aim than to lay down a correct science of the intellect. His object was to establish a sound theory of human life, and in his republic he describes in detail his ideal of a perfect human community. That treatise, which starts by stating virtue to be the first necessity of a sound social life, describes at great length, how men must be taught and trained to perform their several duties in such a community, which in Plato's Republic, there is much that was exclusively adopted to Greek notions, there are at the same time, both in that and in most of his other works, many inspiring passages and profound observations bearing on the general question of education.

Plato's educational theory can not be understood apart from his peculiar views on man and virtue. The supreme idea, according to him, was the idea of the good, and the

commodity or services which they would arrange with the organisation to give. Then there would be no more unemployment or unmerited poverty with the means we now possess, and we should have hitherto undreamt-of prosperity. We have specially to consider the very simple ways in which these principles might be applied at once for the solution of rural problems.

they would be able easily to produce enough to be entirely fed if necessary and to to take produce home.

Parents able to pay would be entitled to demand that their children should have more schooling up to a certain limit. The educationalist, however, knows well that a minimum of schooling that would be given to all would probably take them as far by staying a year or so longer in the "educational colonies".

"Educational colonies" would be as marked a benefit for poor middle class people as for town working classes. Secondary education could, of course, be given in them as well as primary. It would be assumed that parents would pay some fee for secondary education. But all would have to do some productive work which together with good games, are essential for a good educational system. The question whether the children would pass the examinations as early or not is not worth a moment's consideration, as the question of cost would not arise. The poorer the parents the greater would be the pecuniary relief they would receive from the plan that would enable their children to render effective help, whilst giving them robust health and aptitude for practical work.

From the economic point of view we should hope, by these means, to bring about very great new developements of co-operation. We want to advance by way of a system of work for remuneration in kind, with a co-operative organisation to take the products the various workers earn, and distribute them among them, and among people to whom they would transfer credit by cheques or otherwise. We should want, following that road, to arrive at a co-operative organisation from which people would be able to have necessities by paying their bill with labour, or with some

Village children must of course help their parents. They spend many days watching cattle. Those days could be profitably used if lessons were given to them to learn. But to make the parents anxious to send their children for training they should, for their useful scouting work, have a small share from the beginning in the commodities that the well organised adolescents would produce.

In any case the plan is rendered economically possible by the fact that ***progress has given us means by which well organised labour can produce everything in great abundance with ease and the apprenticeship is generaly easy.***

Because the apprenticeship is easy, we could organise the adolescents into a "labour army" producing necessaries for the organisation in "educational colonies" whilst continuing their education and training.

When fully devoloped the organisation would pay its young workers entirely in kind, and its officials almost entirely in credit on its books, for which they would be able to have almost anything and of the best. But there would be no difficulty about giving them a part of their pay in money.

The educational system described above for the rural districts would be in one sense still more applicable to the towns and beneficial to them. One of the greatest things that could be done for human welfare would be to establish educational colonies for town children and adolescents. The general plan might be for them to sleep at least alternate nights in the colonies, thus spending thirty eight hours out of every forty eight in the country, getting pure air, which is of such importance to the young, and the healthiest food. Keeping them in colony organisation till seventeen at least

However poor the parents, they would be better off by their children being employed in the juvenile "communities" system, and they would cost the State nothing.

To give an instance, we might organise village boys and girls as Scouts and Guides, who would to do all they could for village improvement, sanitation, water-supply, irrigation, communications, whenever possible growing, or helping the cultivators to grow, any food-stuffs by which their dietary might be improved,—a vast field for most useful exploration; in some cases they would cultivate the more distant fields – the 'out-fields' better than they were being cultivated, and last but not least they would organise entertainments of various kinds for the villages. With that they would be taught exercises to develop muscles, lungs and agility and rythmic movements and wherever necessary their diet would be supplemented so that they would be able to work hard and grow up capable, active and strong.

We should need, in connection with this plan, village school masters who would be scout masters, masters of physical training, to some extent craftsmen and agriculturists. Of course we should not have them from the first quite as we should wish them to be but we should have to do the best we could with the men we had, and strive always to improve. Then we do not know how much interest the present generation of parents would take in this training of their children. It would be on the safe side to say that we should need a programme of training the efficiency of which could be checked by effective tests applied by periodical inspectors, so that a negligent school-master would be found out. Village children should as often as possible go for periods of training to scout centres where everything would be done in the best possible way. This might be of all ways the most effective in broadening their outlook and of making the training system efficient.

But we have to study these possibilities which, with our modern methods, are colossal. They open up ways of using our productive power to do real good to the masses. We have to consider the fact that a few "United Communities", a few state-co-operating units, might be the nucleus of a great co-operation of private undertakings that might give similar results. The State might help and direct private enterprise in "coining labour into wealth" and see that good resulted for the public. It might simply by issuing or authorising the issue of an exchange-currency set such a system in motion. All these possibilities are dealt with in the Calcutta University publications on the subject. The American bill must be carefully studied.

Now the "educational colonies" plan is one for a beginning applying the principle to education and juvenile welfare; to the greatest of all possible public services; that, namely, of placing the young during their formative years under the best possible training and conditions.

The young, as the educationist knows, are practically formed for life by influences and surroundings up to the age of about eighteen. The ideal requirements for their good are very simple. They need occupations that arouse enthusiasm. Those that arouse generous enthusiasm and a sense of dutiful and loving service have a good moral influence. Those that arouse keen interest, induce earnest application and strengthen character; those that induce joyful activity give, bodily strength and robustness. All the desired conditions are combined by a day divided about equally between useful work of the right kinds, the best kinds of games and sports and class work.

They would have all this in a "United Communities" system. A labour army they would belong to from the time of joining school upto about eighteen—preceeded by a 'nursery school'. The well trained labour of the adolescents would very easily pay for the whole juvenile labour army.

work for all manner of infirm people, and for the aged, by which they could earn a decent maintenance. All that it might do for the young and their welfare and training is particularly wounderful. We shall deal with that specially presently. In a higher stage of its development it would employ all who are not satisfactorily employed. All available labour would be taken into this State mint to be coined into wealth. The organisation could then construct and maintain schools and hospitals, construct roads and canals. It might construct railways as it would have its ways of getting equipment it could not manufacture. In many ways it might do for greater good to the people than is done by more money which too often is spent foolishly.

The old-world principle of turning labour direct into wealth—and social service—presents itself in a wonderful light with modern labour - saving and labour simplifying methods, with methods which enable us to take, as one might say, any crowd of workers, set a small precentage of them to producing necessaries for all, equipped with methods that can enable people to produce abundantly, and employ the rest doing something for the public good. On this plan, wealth might be created beyond anything dreamed of yet. The illustration of the principle by the Swiss colony earning money for the State employing " unemployables ", is as striking as anything could be. Why then, one asks again, was senator Sheppard's bill to follow up this success, by applying the principle simply to solve the problem of unemployment, pigeon-holed.

But evidently the question arises as to where it would end. Systems are for men, not man for systems. People are jealous of interference with their ways of trading and doing their various business. That on broad lines is the modern conflict of social doctrines.

carried out under a benevolent autocratic system. If we take the bill literally, we should have well organised farms, which might be some kind of "collective farms", using the best methods that are practically possible, saving labour, to employ it in industries ; and we should have factories and work shops producing things the workers use and that the State wants. People working in that great organisation would not be paid in money, except, perhaps, a very small proportion of their pay. All would be paid with an exchange currency for which they would be able to have anything the organisation produced. But as that would be very nearly every ordinary thing, it is evident that people would be able to make practically any small purchase with the exchange currency, because sellers of most things would readily accept it as, within very wide limits, it would be as useful to them as money. I need not dwell on the fact, for it is sufficiently obvious, that for the same reason, the organisation—being of the dimensions we are supposing—would be able to make purchases similarly from outside. If a worker in the organisation wanted an American motor car for his exchange cheques the organisation would be able to procure it for him. It would do its foreign business on the same principle as international banking does. We should then have the "fishings boat" of our illustration, of liner dimensions. The little Swiss colony, employing the sweepings of the labour market pays the State. This great organisation could pay magnificiently. The State with its army of employees would not have to sell any produce, but would—simply pay its various salaries or pensions partly in the exchange currency. Such an organisation might, in that way, make armies and other public survices cost nearly nothing. It might also render all kinds of social services.

Adolescents by receiving some elementary education might be made to serve a time in solving the whole literacy problem. A big organisation of that kind can have suitable

puzzle. As a matter of fact, an enlightened American Senator, Mr. Morris Sheppard, has put a bill before the United States Senate to solve the problem of unemployment by multiplying colonies but the bill remains hung up in Committee !

Now I have put the facts before you, like the pieces of a puzzle, let us take them one by one and make sense of them.

First how can a colony that is an economic eccentricity, going against the elementary law of specialisation pay, and even employing the worst of workers, enable them to save, when well equipped specialising concerns cannot give their workers more than a living wage, and too often fail to pay. People are not all economists. To those who are not, this seems a "poser". But, of course, an answer is that when powerful battle-ships go out to fight each other the results will not be in proportion to their power. They may use their power to sink one another ! Commercial concerns fight each other in competition. The "fruits" similarly are not according to their power, but to the fortunes of the competition war. The colony is like the humble fishing boat that goes out, not to fight but to catch fish. We know now how to make the fishing boats safe and sure of a catch. What happens to great ships in war or in competition has nothing to do with it. But there are prejudices in this case and prejudices blind us. Colonies savour of socialism. The socialist, on the other hand is still more prejudiced against the plan which, if carried out, would put an end to the evils that provide him with his best arguments against the present system!

We must now, as India's great practical economist Sir Dinshaw Wacha said, "dispel the darkness" in connection with this subject.

Let us then consider what we should have if something like Senator Sheppard's "United Communities" plan were

The plain fact is that we have made very great progress in simplifying methods, the result of which is that a good colony can employ people of all kinds usefully, helping to produce necessaries for themselves, and labour saving methods have made it possible for them to obtain necessaries for a fraction of a day's work. Owing to the first fact, then, there can now be work for all in a colony organisation, and professional and other suitable work for educated people. From the second fact various great possibilities follow. First, as people can get their maintenance in such an organisation for part-time work, they could, during the rest of their day, do a variety of things for themselves. Some might do extra work to earn the means to pay off a debt, or to embark on some little enterprise, or a peasant or small industrialist to improve his little holding or business. Others might get some training or follow intellectual pursuits. Then, as people can earn more than their maintenance, colonies can pay interest on capital and pay for good management. They can be, in a word, a new kind of enterprise. That is immediately obvious, but there is a great deal more in the change that has taken place that we shall consider presently.

Next one will ask what practical demonstrations there have been of these possibilities. Again we get an answer the simple directness of which makes it seem to put us to shame—it is sarcastic in its strength. The Swiss have established a colony on business lines that illustrates all those possibilities, employing people classed as "unemployables". It makes even them self-supporting. It enables them to earn a bonus above their maintenance. It is a paying State enterprise in the commercial sense. Why on earth then, one asks, is not every country multiplying such colonies, ending unemployment and **giving people the opportunity to earn a little capital at no greater sacrifice than working for a time for remuneration mostly in kind.** The answer gives us yet another

London TIMES, published article after article strongly approving Calcutta University's action, and that eminent people led by His Majesty the King Emperor, the then Prime Minister, the present Secretary of State for India the then Under Secretary of State added their testimony.

Front rank economists, among whom may be mentioned Sir Horace Plunkett, and Professors Gide and Carver, have called upon all to study these possibilities, as also have many Statesmen and business men; in India conspicuously the late Lord Sinha, Sir Dorab Tata, Sir Dinshaw Wacha and Sir Rajendranath Mookerjee. Finally, two Chief Justices of Bengal, following each other at an interval of more than a decade, have chosen to work for this cause after their retirement.

But now, just as an echo follows a shout so a question follows such statements as the above; why then, you will ask me, have we to hear about it from you; why is it not everyone speaking and thinking about this solution?

The answer is what you would naturally anticipate. From a theoretical possibility to its practical realisation there is a road to be travelled, pioneering to be done, many must apply their minds and energies to the work of detail. I am here, however, addressing you because the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari has a plan under consideration for Hyderabad. His aim is to enquire into its possibilities - to put an end to unsatisfactory employment of young men who graduate in this university. Such a generous intention demands a generous response. Much will depend on your whole-hearted co-operation in solving the practical problems of the local application of the plan. Speaking generally, the change that has taken place is as simple as can be, but its extreme simplicity makes it perplexing, because it makes one ask at once why we are not all establishing colonies now.

How to End Unemployment and Unmerited Poverty

BY

(By Capt. J. W. PETAVEL)

Things have been done and planned in different countries that are making thoughtful people hope for new and very great developments of co-operation that promise first perhaps to give splendid solutions to our education problems, opening up in that way abundant employment for educated men, and then to solve many other great problems. The facts have attracted the attention of your rulers who are considering, not solutions merely for unemployment, but for the problem of opening up good employment for qualified men. Educational co-operative colonies are being considered as a first step.

It is time that every one should know that progress has changed the colony solution radically, and in such a way as to make it now perhaps our greatest hope of bringing about a good solution for the problem of the educated classes and of other classes also. We seem to be in the presence of a very great example of the " stone the builders rejected " being likely to become, under new circumstances " the head of the corner ".

Indeed, it was not for nothing that the late Justice Sir Asutosh Mookerjee led India's premier University into propaganda for the "educational colonies". This was written about as having been "perhaps without a parallel in the annals of any learned body ". It was not for nothing that the Press in all parts of the world, magnificently led by the

to his labours, did he not take a great part in the founding of the Osmania University? In that University, both teachers and pupils use their mother tongue and not English as elsewhere; an innovation which is of great use to the youth of India

He has been remarkable for the work he has done towards bringing the princes of India, themselves united by agreement, to join in the new scheme of government for the whole Empire of India. In order to mark our gratitude to a man so pre-eminently worthy, who has done so much for the sake of peace and humanity, I present to you Akbar Hydari, Member of the Privy Council, Knight, that he may be admitted to the degree of Doctor in Civil Law, honoris causa.'

THE RIGHT HONOURABLE

SIR AKBAR HYDARI

IT was with great satisfaction that members of the Osmania University heard that the University of Oxford was conferring the honorary degree of Doctor in Civil Law on the Right Honourable Sir Akbar Hydari at its annual Encaenia. The occasion was a distinguished one as the coronation had brought many famous overseas visitors to England on certain of whom the University desired to bestow the highest honour in its power. Three Indian Statesman, Sir Tej Bahadur Sapru, Sir Akbar Hydari and Sir Abdur Rahim were among this number.

The custom is that the Public Orator of the University presents each of the guests to the Chancellor or Vice-Chancellor with a short complimentary speech in latin.

The following is a translation of the speech used to introduce our Chancellor; it should be of great interest to members of the Osmania Uuiversity:—

'Next comes one no less renowed, born in the province of Bombay of a Moslem family, who, himself named Hydari, devoted himself, as fate would have it, to the State of Hyderabad and has served that greatest of princely states in many ways. Has he not extended there the railway system, organised it and increased it? Has he not presided over the Treasury and always produced balanced budgets? Has he not—a matter which touches us, as members of a University, very closely—watched the plans for the education of youth with constant care and, in order to add as it were the culmination

Editorial

It is with great pleasure and pride that we welcome our new chancellor, the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari. His interest in the University has never failed and we are hopeful of the future under the able guidance of one who is recognised as one of India's most able and statesman-like leaders.

Mr. E. E. Speight, professor of English, who served not only in the capacity of a professor but as an advisor to the English section of the Magazine has now retired from service.

We shall always be grateful for the work he did and wish him all happiness.

We welcome our new advisor, Mr. F. J. A. Harding.

We now request the lady students to contribute to the English section of the magazine as some of their articles are appearing in this issue of the Urdu section.

Editor.

CONTENTS

				Page
1	Editorial	..		
2	Right Honourable Sir Akbar Hydari	..		
3	How to End Unemployment and Unmerited Poverty	..	Capt. J. W. Petavel	1
4	Plato	..	Shanker Mohanlal	12
5	The Need of Vocotional Education in our Schools	..	H. W. Butt	15
6	Post-War Germany	..	M.A. Jabbar	19
7	The Portrait of a Damsel	.	Pramod	28
8	What we should be	..	S.M. Abbas	32
9	Militarism To-day	..	S.K. Sinha	35
10	Secrets of Happiness	..	Virupakshappa	38
11	My Lady Nicotine	..	Mujtaba Yar Khan	42
12	My Election Manifesto	..	T.R. Padmanabachari	44
13	A Great Biography	..	S.M. Abbas	48
14	The Hyderabad Pioneer Educational Colony	..	Capt: J.W. Petavel	50
15	My Message	..	A. Zafar Abdul Wahed	68
16	Sirala	..	Alla Yar Khan	77
17	Recording & Reproducing Sound	..	S.B. Nizami	80
18	The College News	..	Editor	85

THE OSMANIA MAGAZINE

BEING

The Journal of the Students

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

Editor

KHAJA NASRULLA, B.Sc., (Osmania)

Vol. X Nos. 3 & 4

1937

Printed at
THE OSMANIA PRINTING WORKS,
1784, Hill Street, Secunderabad-Dn.